

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ پر مشہد کتابیں

تاریخ اور دانشور
مستند، خاموشی کی آواز
آزادی، مذہب، ملک، سائنس و سماج
برصغیر میں مسلمان معاشرہ کا ادب
عالم اور سیاست
تاریخ اور جبریت
تاریخ اور مذہبی تاریخ
تاریخ کی روشنی
اقلیت تاریخ
آج کے دور کو کون کا رہے
تاریخ کے بدلے نظریات
تفاتی و اعلیٰ سطح پر
تاریخ کیا کہتی ہے
آئینہ کار ہندوستان
جہانگیر کا ہندوستان
تاریخ اور مذہبی تاریخیں
نصف انڈی کی آپ جہاں
شاہی محل
تاریخ شناسی
تاریخ کس اور کون
تاریخ کھانا کھانے کے آداب
گنجانہ غلامی کی کھلی ہوئی عزت
نور کا دور
تاکہ اعظم ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ پر مشہد کتابیں



تاریخ پبلیکیشنز

کشف کلچر

تعمیر کار

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ پر مشہد کتابیں

تاریخ اور سیاست

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ اور سیاست

ڈاکٹر مبارک علی

ڈاکٹر مبارک علی کی تاریخ پر مشہد کتابیں

تاریخ کی روشنی
پاکستانی معاشرہ
تاریخ کے نئے راستے
تاریخ کی آواز
گنجانہ غلامی
تاریخ اور تاریخ کی روشنی
تاریخ، تحقیق کے نئے رتھانات
مذہب کی تاریخ کیا ہے
تاریخ کی آواز
تاریخ کی تلاش
انٹرویو اور تاثرات
مذہب کی سائنس اور فلسفہ تاریخ
تاریخ اور تحقیق
تاریخ اور معاشرہ (آج کے دور میں)
جدید تاریخ
یورپ کا عروج
برطانوی تاریخ (ایک تجزیہ)
دورِ قلم کرکھانے (آپ جہاں)
برقی ہوئی تاریخ
چاندی وادی
مطلیہ و بار
تاریخ اور سیاست
نور کا دور کی تاریخ
تاریخ اور معاشرہ

تاریخ اور سیاست

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز

بک مشین 39- مرگ روڈ لاہور، پاکستان

حصہ اول

- 7 1- تاریخ کیوں ضروری ہے؟
- 10 2- تاریخ کیسے بنتی ہے؟
- 13 3- تاریخ کیسے پڑھنا چاہئے؟
- 17 4- تاریخ اور آج کی دنیا
- 21 5- تاریخ اور نسائی کتب
- 26 6- تاریخ اور شکست
- 29 7- تاریخ اور احساس جرم
- 32 8- تاریخ اور تحریکیں
- 34 9- تاریخی شعور
- 38 10- تاریخ اور سماجی و ملی انقلابات
- 42 11- تاریخ کی تقسیم
- 45 12- تاریخ اور اقلیت
- 48 13- تاریخ کی وسعت
- 51 14- تاریخ میں قوموں کا تسام
- 55 15- تاریخ اور بغاوت
- 58 16- یورپی اقوام اور تاریخ کا نقطہ نظر
- 62 17- آخری عہد مغلیہ اور آج کی صورت حال
- 66 18- انسانی عقلیت کی اہمیت
- 69 19- قومی شناخت کیسے بنتی ہے؟

- نام کتاب : تاریخ اور سیاست
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
انتظام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : تاریخ پبلی کیشنز لاہور
کمپوزنگ : فکشن ہاؤس اینڈ گرافکس، لاہور
پرٹرز : سید محمد شاہد پرنٹرز، لاہور
سرورق : ریاض ظہور
اشاعت : 2012ء
قیمت : -/300 روپے

تقسیم کار

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 39- مزنگ روڈ لاہور، فون: 042-37249218-37237430
فکشن ہاؤس: 52، 53 راہبہ سکوائر حیدر چوک حیدرآباد، فون: 022-2780608
فکشن ہاؤس: نوشین سٹریٹ فرسٹ فلور روڈ کان نمبر 15 اردو بازار کراچی

فکشن ہاؤس

● لاہور ● حیدرآباد ● کراچی

e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

تاثرات

تاریخ کیوں ضروری ہے؟ تاکہ لوگ ماضی میں ہوئے والے واقعات اور تاریخی عمل سے واقف ہو کر ذاتی دشواری طور پر پہنچ کر حاصل کر سکیں۔
یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ کچھ قومیں جو غلطیاں کر چکی ہیں، ان سے بچا جاسکے۔
تاریخ کا مطالعہ قوموں کو ایک احساس دلاتا ہے، ان میں ایک وجدان پیدا کرتا ہے کہ ماضی کے تجربات سے وہ حال کی رفتار کو سمجھ سکیں۔
اس کتاب کے پہلے حصہ میں تاریخ کے بارے میں مضامین ہیں۔ دوسرا حصہ ایمپیرل ازم کے بارے میں ہے کہ جس میں کچھ مضامین کا انگریزی سے ترجمہ ہے، تیسرا حصہ انقلاب کے بارے میں ہے۔ دنیا کے ہوتے ہوئے حالات میں بہت سے دانشور لب انقلاب کی راہ سے ہٹ چکے ہیں۔ مگر یہ سوال ابھی بھی اہم ہے کہ ان معاشروں میں کہ جہاں بدعنوانیاں اپنی اتنا پر تاج جاتی ہیں کیا وہاں اصلاحات ممکن نہیں؟ اس لئے یہ حصہ خاص طور سے ہمارے لئے اہم ہے۔ فرانس 'روس' اور چین کے معاشروں میں انقلاب سے پہلے جو حالات تھے۔ ہم کون انہی سے دوچار ہیں۔ اس لئے یہ سوال اہم رہتا ہے کہ ان کا حل کیا ہونا چاہئے؟ یہ حل دھوڑنے کے لئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے۔

مہارک علی

مئی 1993 لاہور

حصہ دوم

- 1- ایمپیرل ازم کیا ہے؟ 72
- 2- ایمپیرل ازم کی تعریف 80
- 3- امریکی ایمپیرل ازم کی بنیادیں 84
- 4- نوآبادیاتی نظام اور اس کی ابتداء 88
- 5- ابتدائی نوآبادیاتی نظام کی لوٹ کھسوٹ 91
- 6- ایمپیرل ازم کا عہد 98
- 7- مقامی لوگوں کی جدوجہد 109
- 8- کلچرل ایمپیرل ازم 118
- 9- آزادی اور نیکو کوشش ازم 132

حصہ سوم

- 1- انقلاب کیا ہے؟ 138
- 2- انقلاب کا پختہ مفہوم 145
- 3- انقلاب کے نظریات 148
- 4- فرانسیسی انقلاب 157
- 5- روسی انقلاب 177
- 6- چینی انقلاب 189
- 7- تیسری دنیا اور تبدیلی 197

تاریخ کیوں ضروری ہے؟

معاشرہ میں علم کی کسی شاخ کو اسی وقت تبدیلی ملتی ہے جب وہ اس کی ضروریات کو پورا کرے اور اپنی اقدار کو معاشرے کے لئے ضروری بنا دے۔ چونکہ معاشرے کی ضروریات بدلتی رہتی ہیں، اس کے نقطے تبدیل ہوتے رہتے ہیں اور اس کے مسائل نئے نئے انداز اختیار کرتے جاتے ہیں اس لئے ضرورت ہوتی ہے کہ علم کو بھی اسی کے ساتھ ساتھ بدلنا چاہئے تاکہ وہ تبدیل ہوتے ہوئے حالات کو سمجھ سکے اور نئے پیدا شدہ مسائل کے حل دریافت کر سکے۔ اس لئے جب ہم تاریخی شعور کی بات کرتے ہیں تو اس کا مطلب تبدیلی کا شعور ہوتا ہے اور یہی تبدیلی کا شعور تاریخ کے مضمون کو اہم بناتا ہے۔

ہمارے معاشرہ میں اب تک تاریخ کا مطالعہ اس لئے نہیں کیا جاتا کہ اس کے ذریعہ تبدیل ہوتے ہوئے حالات کا تجزیہ کیا جائے بلکہ اس کا مقصد محض تفریح کے طور پر ماضی کے حالات کو جاننا ہے۔ اسی لئے تاریخ کو ہمارے معاشرے میں اقدار کے نقطہ نظر سے نہیں دیکھا جاتا اور زندگی کی عملی ضرورتوں میں اور معاشرہ کی تشکیل میں اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا جاتا۔ اس لئے یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخ ہمارے معاشرے کے تقاضوں کو پورا کرنے کی اہل ہے؟ اور اگر ایسا ہے تو پھر اس سے یہ کام اب تک کیوں نہیں لیا گیا؟

تاریخ کی ایک تو وہ حیثیت ہے کہ جو ہمارے تعلیمی اداروں میں پڑھائی جاتی ہے اور اس حیثیت سے اس کو خاص سیاسی مقاصد کے تحت پڑھایا جاتا ہے۔ اس محدود نقطہ نظر کی وجہ سے تاریخ معاشرہ کے لئے مفید علم بن کر نہیں رہی۔ تاریخ کا دوسرا استعمال اخلاقی وعظ کا ہے کہ جس کے تحت تاریخ کو ثواب کی خاطر پڑھا جاتا ہے اور توقع کی جاتی ہے کہ اس طرح سے معاشرہ کے اخلاقی مسائل کو حل کر دیا جائے گا۔ تاریخ کے اس ننگ سیاسی اور مذہبی استعمال نے تاریخ کی اہمیت کو بھی گھٹا دیا ہے۔

تاریخ کا مقصد کیا ہونا چاہئے؟ سب سے اہم مقصد تو یہ ہے کہ معاشرہ تاریخ کے ذریعہ بحیثیت مجموعی اپنی شناخت کرائے اور یہ شناخت اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ میں رہنے والوں کو ایک دوسرے کے بارے میں مکمل معلومات ہوں۔ مثلاً ہمارا معاشرہ جہاں ایک طرف

طبقات میں بنا ہوا ہے وہاں وہ ذاتوں، فرقوں اور قبائل میں بھی تقسیم ہے۔ گاؤں اور شہری زندگی میں فرق ہے، 'ذہن'، 'عادات و اطوار' اور 'عشرانیاتی فرق' ہے۔ ان حالات میں علم کی کی کی وجہ سے یہ ایک دوسرے سے پوری طرح سے واقف نہیں ہوتے اور یہ غلط فہمیت انہیں نہ صرف یہ کہ ایک دوسرے سے دور لے جاتی ہے بلکہ ان کے بارے میں غلط دیکھنے کا عام کرنے اور تضادات کو پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں خانہ بدوش قبائل کے بارے میں معلومات انتہائی محدود ہیں، اکثر ہم انہیں شہروں سے باہر جنگلوں اور دیہاتوں میں آباد و گھری کر دیتے دیکھتے ہیں، اور جو بھی ان کے بارے میں سن لیتے ہیں اس پر کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں۔ ان کی طرز رہائش، عادات و اطوار سے ہماری کم علمی ان کے خلاف بدگمانیاں پیدا کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہی کچھ مذہبی فرقوں اور ذاتوں کے سلسلہ میں ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے ایک دوسرے سے دوری پڑتی رہتی ہے۔

یہاں پر تاریخ کو استعمال کیا جا سکتا ہے اگر ان خانہ بدوش قبائل کی تاریخ کو کھولا جائے، ان کی رسومات و عقائد کی تحقیق کی جائے اور ان کی صحیح تصویر معاشرے کے سامنے پیش کی جائے تو اس صورت میں نہ صرف بدگمانیاں دور ہوں گی بلکہ ان کے قریب آنے میں بھی مدد ملے گی۔ یہی عمل مذہبی فرقوں، اور مختلف ذاتی ذاتوں اور برادریوں کے بارے میں ہو سکتا ہے۔ تاریخ ان سب کو مل کر معاشرہ کی شناخت کی تکمیل کرے گی اور نفرت و تضادات کو مٹا کر ایک دوسرے کو قریب لائے گی۔

تاریخ کے ذریعہ جہاں ایک طرف معاشرے کے بچے ہوئے، ٹکڑے ہوئے اور تقسیم شدہ لوگوں کو ملانے کا کام لیا جا سکتا ہے وہاں اس کے ذریعہ دوسری قوموں اور معاشروں میں ہم آہنگی بھی پیدا کی جاسکتی ہے۔ انسانی معاشروں کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ اپنے معیار پر دوسروں کے اخلاق، مذہب اور طرز معاشرت کو دیکھتا ہے اور جب اسے اس میں تضاد نظر آتا ہے تو وہ اس کی تاریخی اہمیت کو سمجھنے بغیر اسے غلط قرار دے دیتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کو یہود مذہب کے متواتر اور ان کی رسومات و عادات نظر آتی ہیں لیکن اگر قدیم ہندوستان کی تاریخ کا مطالعہ کیا جائے اور اس میں نظر میں ان کی رسومات، متواتر اور روایت کو دیکھا جائے کہ یہ کن حالات میں پیدا ہوئے، اور انہوں نے تاریخی لحاظ سے معاشرے کی کن ضروریات کو پورا کیا تو صرف اس صورت میں ہم ان کی اہمیت سے واقف ہو سکیں گے اور صرف اسی صورت میں ہمارے تضادات دور ہو سکیں گے۔ اس لحاظ سے تاریخ نہ صرف تضادات و نفرت کو دور کر سکتی ہے بلکہ ذہن کو وسیع کر کے قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لاسکتی ہے۔ تاریخ کا کام یہ نہیں

کہ وہ یہ فیصلہ کرے کہ کون سا مذہب، سماج اور لاطینی ہے بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ تاریخی عمل میں ہر مذہب اور نظریہ کی پیدائش کا جائزہ لے کر اس کی اہمیت کو اجاگر کرے تاکہ اس کے تاریخی کردار کو سمجھنے میں آسانی ہو۔

ایک نکتہ تھا کہ انسان کے لئے یہ دنیا بہت چھوٹی تھی، وہ جس شہر، گاؤں اور دیہات میں رہتا تھا وہیں پوری زندگی گزار دیتا تھا جس کی وجہ سے اس کے تجربات بڑے محدود ہوتے تھے اور اس کی معلومات انفرادیوں پر ہوا کرتی تھیں۔ اس کے مقابلہ میں آج کی دنیا بہت بکھیل گئی ہے اور اس کے ساتھ ہی انسانی ذہن بھی پھیلا ہے۔ اب یہ تاریخ کا کام ہے کہ وہ دنیا کی قوموں، ملکوں، اور معاشروں کے بارے میں پوری پوری اور صحیح صحیح معلومات فراہم کرے تاکہ یہ انہیں ایک دوسرے کے قریب لائیں۔ کیونکہ تاریخ انسان کو صرف انسان کی حیثیت سے دیکھتی ہے، اس کے مذہب، نسل، اور رنگ سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔

تاریخ کی سب سے بڑی افادت اس وجہ سے پڑ جاتی ہے کہ یہ معاشرے کی یادداشتوں کو مجموعی طور پر محفوظ کرتی ہے۔ ایک فرد کی یادداشت کمزور ہوتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی معاشرہ بھی ایک واقعہ کو جلد بھول جاتا ہے، اگر ان واقعات کو تاریخ کے ذریعہ محفوظ نہیں کیا جائے تو معاشرہ ان کے تجربات کو چاہے وہ اچھے ہوں یا برے جلد ہی بھلا دیتا ہے۔ یہ اسی کا نتیجہ ہے کہ ان معاشروں میں جہاں جدید تاریخ تکمیل میں دی گئی، اور جہاں عوام کو جہل رکھا گیا ہے وہاں سیاسی طور پر وہی انفرادی بار بار اقتدار میں آتے ہیں کہ وہ ماضی میں جرائم کے مرتکب ہو چکے ہوتے ہیں۔ وہی سیاسی جماعتیں جو ایک بار اقتدار میں مگر عوام پر ظلم و ستم کر چکی ہوتی ہیں وہ دوبارہ پھر عوام دوستی کے نعروں کو اٹھا کر اقتدار حاصل کر لیتی ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ ہمارے ہاں تاریخ ان کے کردار اور اعمال کو محفوظ نہیں رہتی، اور عوام اپنا وہ بھرا ماضی جلد ہی بھلا کر قریب میں آجاتے ہیں۔ صرف تاریخ کے ذریعہ اس عمل کو روکا جا سکتا ہے اور صرف اسی کے ذریعہ راہنماؤں اور جماعتوں کا احساب ہو سکتا ہے۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ تاریخ کے مطالعہ سے معاشرہ کو خود آگاہی کا احساس ہوتا ہے۔ وہ اس کا اندازہ لگا سکتا ہے کہ دوسرے معاشروں کے مقابلہ میں وہ کس مقام پر کھڑا ہے۔ تاریخ ہی سے اسے پتہ چلتا ہے کہ معاشرے کن وجوہات کی بنا پر ترقی کرتے ہیں اور کون سی وجوہات ترقی کی راہوں کو روکتی ہیں۔ ماضی کا تجربہ اس کے لئے نئے آئینہ کی مانند ہوتا ہے کہ جس میں وہ اپنی رفتار اور عمل کو دیکھ سکتا ہے۔ خود آگاہی کا یہ احساس معاشرے کو آگے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔

تاریخ کیسے بنتی ہے؟

ایک زمانہ تک یہ سمجھا جاتا رہا تھا کہ شخصیتیں تاریخ کی تعمیر و تکمیل کرتی ہیں اور معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں ان کے افکار و تعلیمات کے نتیجہ میں ظہور پزیر ہوتی ہیں۔ اسی خیال نے تاریخ میں "میدورسپ" کا نظریہ پیدا کیا اور تاریخ لکھتے وقت شخصیتوں کو مرکز بنا کر واقعات کو بیان کیا گیا۔ لیکن جب فلسفہ تاریخ پر کام ہوا تو اس کے نتیجہ میں تاریخ کا مطالعہ وسیع نظر نظر سے کیا جانے لگا اور تاریخ کی تہ میں جا کر واقعات کا جائزہ لے کر تاریخ کے عمل کو سمجھا جانے لگا۔ اس وجہ سے تاریخ کے مطالعہ میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ اور خصوصیت سے اس بات پر توجہ دی گئی کہ ان عناصر کی نشان دہی کی جائے کہ جو تاریخ بناتے ہیں، تاریخ میں بنیادی تبدیلیاں لاتے ہیں اور تاریخ کے عمل کو متاثر کرتے ہیں۔ اسی لئے یہ سوالات پیدا ہوئے کہ کیا شخصیتیں تاریخ کو بناتی ہیں یا حالات شخصیتوں کو پیدا کرتے ہیں؟ اس بحث کے نتیجہ میں جو دلائل اور شواہد سامنے آئے وہ یہ ہیں کہ شخصیتیں خلا میں پیدا نہیں ہوتیں اور نہ ہی شکرات و افکار اچانک و ناگہان میں آتے ہیں بلکہ یہ حالات کے دباؤ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ شخصیتوں کا وجود مخصوص حالات کی وجہ سے ہوتا ہے اور ماحول کے زیر اثر ان کے افکار اور تعلیمات تکمیل ہوتی ہیں۔ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ زمانہ شخصیتوں کو پیدا کرتا ہے اور بعد میں یہ زمانہ پر اثر انداز ہوتی ہیں۔

مثلاً سیاست کی تعلیمات کو دیکھئے کہ یہ کن حالات میں پیدا ہوئیں۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ شہنشاہیت اپنے عروج پر تھی اور اس کی قوت و طاقت کے خلاف کوئی بھی مزاحمتی تحریک کامیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اہلکار بائس کی راہنمائی میں غلاموں نے جو بغاوت کی تھی اسے سختی اور تشدد کے ساتھ قمع کر دیا گیا تھا۔ اسی صورت حال میں مظلوم اور ستمیہ لوگ صرف اس صورت میں اپنی بقا کو قائم رکھ سکتے تھے جب کہ ان حالات سے سمجھوتہ کر لیتے۔ اس لئے انسانیت میں کیا کیا کہ "تھا کا حصہ خدا کے لئے اور بادشاہ کا حصہ بادشاہ کے لئے" اور اس میں "ظلم کو پروا نہ کر کے" تئیں کی گئی اور اسی وجہ سے وہی شہنشاہیت نے سیاست کی تعلیمات کو اپنے لئے کوئی خطہ نہیں سمجھا اور انہیں سختی سے کچل کر قمع میں کیا۔

اسی میں خطر میں متحدستان میں گاندھی جی کی عدم تشدد کی پالیسی کو دیکھا جاسکتا ہے۔ اس عہد میں برطانیہ ایک بڑی قوت و طاقت تھی کہ جس کی سلطنت میں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ 1857ء کے جنگوں میں جب کہ برطانوی حکومت کے خلاف تحریک چلی تو اسے انتہائی بے دردی سے قمع کر دیا گیا، "گل و غارتگری" اور "لوت کسوت" کے عمل نے لوگوں میں خوف اور ہیبت کو پیدا کر دیا۔ اس لئے اہل متحدستان ذہنی طور پر اس کے لئے تیار نہیں تھے کہ نوآبادیاتی حکومت کے خلاف کوئی مزاحمتی تحریک شروع کی جائے۔ ان حالات میں عدم تشدد کی ہی پالیسی ایسی تھی جو لوگوں کے لئے قابل قبول تھی۔ چونکہ یہ حالات اور وقت کی ضرورت تھی اس لئے یہ مقبول ہوئی اور متحدستان کے بالائی طبقوں نے بھی اس پالیسی کی اس لئے حمایت کی کہ اس کے ذریعہ متحدستان کے معاشی و سیاسی اور معاشی و سماجی مسائل میں کوئی بنیادی تبدیلی نہیں آ رہی تھی اور ان کے مفادات کو اس میں پورا پورا تحفظ مل رہا تھا۔

اس کے مقابلہ میں روس میں انقلاب 1917ء کے وقت حالات دوسرے تھے۔ وہاں انقلاب کے بعد لینن کو معاشرہ کا سماجی بنیادی طور پر بدلنا تھا اور یہ کام وہ عدم تشدد کے ذریعہ نہیں کر سکتا تھا، کیونکہ قہم نظام کے حالی پوری قوت سے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے تھے، اس لئے تشدد کے ذریعہ طاقت کو ختم کر کے معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں لانی تھیں۔ اس لئے شخصیتیں تاریخ میں دہی کرتی ہیں کہ جس کا تقاضا حالات کرتے ہیں۔ وہ اس تاریخی عمل کا ایک حصہ ہوتی ہیں، "بذات خود عمل نہیں ہوتیں" اس لئے جب تاریخی عمل آگے کی جانب بڑھتا ہے، حالات بدلتے ہیں اور ماحول تبدیل ہوتا ہے تو ان کے افکار "خیالات" اور نظریات پیچھے رہ جاتے ہیں اور تاریخ کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ نئے حالات ضرورت کے تحت نئے نظریات اور نئی شخصیتوں کو پیدا کرتے ہیں۔

تاریخی عمل جب آگے بڑھتا ہے تو وہ کسی خاص شخصیت کا محتاج نہیں ہوتا کیونکہ حالات کا دباؤ اس قدر شدید ہوتا ہے کہ ایک کام ضرور تکمیل تک پہنچ جاتا ہے۔ جب یورپ کے معاشرہ میں چند عرصوں میں مدنی سے شہریتوں کا شروع ہوئیں تو ان حالات میں انہوں نے تجارت کی غرض سے بحری راستوں کی تلاش شروع کی اور اسی ضرورت کے تحت واسکو ڈی گاما اور کولمبس نے نئے راستوں اور ملکوں کو دریافت کیا۔ لیکن اگر یہ نہ ہوتے تب بھی ان راستوں کی دریافت ضرور ہوتی کیونکہ یہ حالات کا تقاضا اور وقت کی ضرورت تھی اور جہاں حالات نے انہیں پیدا کیا وہاں یہ کسی اور کو بھی پیدا کر سکتے تھے۔

تاریخی عمل کے ساتھ ساتھ اور وقت کی تبدیلی کی وجہ سے اخلاقی قدریں، رویات اور

ثقافتی و معاشی اور سیاسی ادارے بھی بدل جاتے ہیں۔ نصاب کا ادارہ اس وقت انتہائی ضروری تھا جب کہ معاشرہ ذرا متمدن تھا لیکن جیسے ہی معاشرہ ذرا متمدن سے متعلق ہوا نصاب کے ادارے کی ضرورت ختم ہو گئی اور اس کے خاتمہ کے لئے تحریکیں چلائی گئیں۔ اگرچہ نصاب کے ادارے کے خلاف اس سے پہلے بھی دہلی دہلی کواڑیں اٹھی تھیں مگر ان کو اس لئے حمایت نہیں ملی کہ یہ ادارہ ذرا متمدن معاشرہ کے لئے ضروری تھا مگر حالات کی تبدیلی اور متمدن ضرورت نے اس ادارے کا خاتمہ کر دیا۔

ایجادات معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں لاتی ہیں مثلاً ہندوستان میں جب جرنے ۱۲ استعمل شروع ہوا تو بہت سے قبائل جو خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے تھے اس کے استعمال کے بعد وہ بستیوں اور شہروں میں آباد ہو گئے۔ مستقل ایک جگہ رہنے کی وجہ سے ان کے طرز معاشرت میں بنیادی تبدیلیاں آئیں۔ خانہ بدوش ہونے کی حیثیت سے وہ آزاد اور خود مختار تھے "ذاتی" جگہ و بدل اور لوٹ مار میں ماہر تھے مگر ایک جگہ آباد ہونے کے بعد ان کی یہ تمام عادات بدل گئیں وہ حکومت کے وظائف ہو گئے، قانون پر عمل کرنے لگے اور اس پر عمل ہو گئے۔ معاشی حالت کے بہتر ہونے کے بعد انہوں نے ثقافتی اور تمدنی طور پر بھی ترقی کی اور مذہب معاشرہ کا ایک حصہ ہو کر اس کی علمی و ادبی ترقی میں حصہ لینے لگے۔

چونکہ ایجادات معاشرہ کے پیداوار کے طریقوں کو بدل دیتی ہیں اس لئے اس کے بدلنے سے معاشرہ کی زندگی، اقدار، اور رویات بھی بدل جاتی ہیں اور بحران کے دور کے تحت یہ حالات پیدا ہوتے ہیں ان کے نتیجے میں شخصیتیں وجود میں آتی ہیں اور یہ شخصیتیں ضرورت کے مطابق تاریخی عمل کو متاثر کرتی ہیں اور اس طرح سے تاریخ بنتی ہے۔

تاریخ کیسے پڑھنا چاہئے؟

تاریخ کو ہر مورخ اپنے خاص نقطہ نظر سے لکھتا ہے اس لئے واقعات کا بیان اس کی پسند و ناپسند سے متاثر ہوتا ہے۔ اسی طرح ہر تاریخ ایک خاص ماحول اور ایک خاص زمانہ میں لکھی جاتی ہے اور اس کا اثر تاریخی واقعات کے بیان پر ہوا مگر پڑتا ہے۔ اس لئے تاریخ پڑھنے وقت وہ باتوں کا خیال رکھنا انتہائی ضروری ہے۔ تاکہ اس کے پس منظر سے واقعت ہو سکے سب سے پہلی چیز جس کے بارے میں معلومات ضروری ہیں وہ یہ کہ تاریخ کھینے والا کون ہے تاکہ ہماری اس کے ذہن، تہذیب اور نظریات کے بارے میں واقف ہو سکے۔ اور اس کے نقطہ نظر کو سمجھ سکے۔ مثلاً ابتدائی دور میں تاریخ لکھنے والے یا تو درباری ملازم ہوا کرتے تھے یا مذہبی عالم۔ اس لئے ان دو شخصیتوں کو ذہن میں رکھ کر ان کی لکھی ہوئی تاریخ کو آسانی سے تنقیدی نظر سے دیکھا جاسکتا ہے درباری مورخ بھی بھی حکومت اور حکمران پر تنقید نہیں کرے گا اور واقعات کا انتخاب اس طرح سے کرے گا کہ حکمران کی کمزوری ظاہر نہ ہو بلکہ ہر صورت میں ان کے کردار کا روشن اور اچھا پہلو سامنے آئے اس کی مثال جس سراج عظیم کی کتاب "تاریخ فیروز شاہی" سے دی جاسکتی ہے کہ اس نے کس قدر خوبی اور فطارت کے ساتھ فیروز شاہ کی کمزوریوں کو بھی اس کی خوبیاں ظاہر کر کے بیان کیا ہے۔ مثلاً فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں فرج میں رشوت عام ہو گئی تھی ایک مرتبہ ایک فوجی اپنا گھوڑا معائنہ کے لئے پیش نہیں کر سکا کیونکہ اس کے پاس رشوت دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ بادشاہ کو جب اس کی خبر ہوئی تو اس نے فوجی کو ایک اشرافی حمایت کی تاکہ وہ قانونی گرفت سے آزاد ہو جائے۔ جب یہ ملازم واپس آیا تو بادشاہ نے اس سے دریافت کیا کہ کیا میری تمنا پوری ہو گئی۔ تو اس شخص نے عرض کیا کہ خداوند عالم کی حمایت و مہربانی سے میں کامیاب ہو گیا۔ بادشاہ نے اس پر فرمایا "الحمد للہ"۔ اسی طرح جب فیروز شاہ اپنے خاندانوں کے خلاف فوجی اقدامات نہیں کر سکا تو اس کی تعریف مورخ نے اس طرح کی ہے کہ اس نے انہوں کا خون بہانے سے گریز کیا۔ درباری مورخ کی تاریخ کو پڑھنے سے اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ بحیثیت ملازم اس نے حکمران کی تعریف کی ہے اور یہ پڑھنے والے کا کام ہے کہ حین السطور وہ اس کی کمزوریوں کو دیکھ سکے مثلاً

میں سراج حلیف کے ان واقعات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ فیروز شاہ کے دور میں انتظامیہ کے افسران اعلیٰ میں رشوت عام تھی اور بادشاہ میں اتنی طاقت و صلاحیت نہیں تھی کہ وہ اس رشوت کو ختم کر سکے اس لئے اس کی نیکی اور خوب پوری یہ تھی کہ وہ رشوت کے پیسے اپنے پاس سے دیا تھا تاکہ لوگوں کے کام ہو جائیں۔ اسی طرح جب اس نے اپنے جانچنے کے خلاف فوجی اقدامات نہیں کئے تو اس کا مطلب یہ تھا کہ اس میں بحیثیت جنرل کے کوئی صلاحیت نہیں تھی اور وہ اپنی فوج پر کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔

دوسری طرف ایسی باتیں بھی ہیں کہ جو ان مورخوں نے لکھیں کہ جو حکمران کی سرپرستی سے محروم رہے اور جو مذہبی عالم بھی تھے۔ ان لوگوں کی تاریخ کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے تاریخ کو بطور حقا پیش کیا ہے اور جہاں انہیں موقع ملا ہے انہوں نے صوفیاء اور علماء کی شخصیتوں کو پورا پورا پیش کیا ہے۔ اس کی مثال دو مورخوں سے دی جا سکتی ہے "ایک نیام الدین برنی" جس نے مر کے آخری حصے میں محمد فیروز شاہ میں "تاریخ فیروز شاہی" لکھی اور دوسرا عبدالقادر بدایونی ہے جس نے اکبر کے عہد میں "مکتب التواریخ" لکھی۔ یہ دونوں چونکہ دربار کی سرپرستی سے محروم رہے اور ان دونوں کو اس کا فہم نہ تھا کہ ان کی صلاحیتوں کی پوری طرح سے قدر نہیں ہوئی اس لئے ان کی تاریخوں میں ان کا احساس محرومی جھلکتا ہے اور دونوں اپنی ناقدی کا بدلہ حکمرانوں پر سخت تنقید کر کے لیتے ہیں۔ ابوالفضل درباری مورخ کی حیثیت سے اکبر کی شخصیت کو پورا پورا پیش کرتا ہے تو عبدالقادر بدایونی اس کی شخصیت میں ہر قسم کی برائی اور کمزوری دھونڈنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لئے ان کی تاریخ کو چھتے وقت پڑھنے والے کو ان دونوں کے نقطہ نظر سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔

دوسری اہم چیز یہ ہے کہ یہ دیکھا جائے کہ تاریخ میں زمانے کس عہد اور کن حالات میں لکھی گئی مثلاً امیر حماد کی تاریخ ان کے زمانے میں نہیں لکھی گئی بلکہ یہ عہد میں لکھی گئی "یا سوری خاندان کی تاریخ مثلاً دور حکومت میں لکھی گئی۔ اس وجہ سے اسے دور سوری حکمرانوں کو کوئی غیر جانبدار اور حق پسند مورخ سمجھ نہیں آیا۔ وہ ان کا دفاع کر سکا اور ان کے عہد کے بارے میں تعلیمات کا مسلک مثلاً ابوالفضل جب بھی شیر شاہ کا ذکر کرتا ہے تو اسے شیر خاں کے نام سے موسوم کرتا ہے اور بحیثیت بادشاہ کے اسے حسین نہیں کرتا۔ اسی طرح وہ تہو کو "جال" لکھتا ہے اور اس کی کسی خوبی اور صلاحیت کا ذکر نہیں کرتا۔ حالانکہ تہو نہ صرف بہادر فوجی اور تجربہ کار جنرل تھا بلکہ بحرین ختم بھی تھا مگر اس کی شکست نے اس کی تمام خوبیوں پر پردہ ڈال دیا اور اس کے کردار کے اچھے پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا گیا جس کی وجہ سے

وہ تاریخ میں اپنا صحیح مقام حاصل نہیں کر سکا۔

جو حکمران اور قومیں شکست کھا جاتی ہیں تاریخ میں وہ بھی اپنا جائز مقام حاصل کرتے ہیں تاہم ہو جاتی ہیں "کیونکہ ان کی جانب سے ان کے حق میں دلائل دینے والا کوئی نہیں ہو تا اور فاضل کی تاریخ لکھنے والے ان سے ہر برائی کو منسوب کر دیتے ہیں۔ اس کی مثال ابراہیم لودھی کی شخصیت ہے "پانی پت کی جنگ میں اس کی شکست کے بعد مغل مورخوں نے اس کی شخصیت کو صبح کر کے پیش کیا ہے اور اسے باطل اور ظالم حکمران ثابت کیا تاکہ مغل حکومت کے قیام کا جواز پیدا ہو سکے۔

جب ہم صحر مورخ تاریخ کو مساحر کے لکھتے ہیں تو اسے والے مورخوں کے لئے مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ تاریخ کی حقیقت پسندی کے ساتھ تشکیل کر سکیں۔ اس لئے تاریخ میں ان کی شخصیت ایسی ہی ابھرتی ہے جیسے کہ ان کے مخالفین نے پیش کی تھی۔ حجاز بن یوسف کو عباسی دور میں ظالم اور بدرفتار و خون ریزی کے چاہنے والے کی حیثیت میں پیش کیا گیا اور اس کی تمام نیکیوں پر پردہ ڈال دیا گیا۔ اور کج بھی لوگ اس کو اسی حیثیت سے پچاتے ہیں حالانکہ اس کی اصل شخصیت قطعی وہ نہیں جو عباسی مورخوں نے پیش کی ہے۔

نقطہ نظر اور پسند و ناپسند اور حالات کا اثر جدید تاریخ پر بھی ہے۔ آج بھی تاریخ خاص نقطہ نظر اور خاص مقاصد کے تحت لکھی جا رہی ہے۔ بریگزٹی تاریخ میں ان مختلف نقطہ نظر کو آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے مثلاً ایسٹ انڈیا کمپنی کے ذمے لگے تھے کبھی نے اس قسم کی تاریخیں لکھوائیں کہ جن میں ان کی فتوحات اور سیاسی اقتدار کو جائز قرار دیا گیا۔ چونکہ کبھی نے ہندوستان کی ریاستوں پر قبضے کئے تھے اس لئے ان ریاستوں کی تاریخ کو اس نقطہ نظر سے لکھوایا کہ جس سے یہ ثابت ہوتا کہ ان کے حکمران باطل اور ظالم تھے اور ان کے دور حکومت میں ریاست ابھری کا شکار تھی اس لئے ان پر برطانوی اقتدار ان کے لئے باعث نعمت ہوا۔ 1857ء کے جنگ سے پر جس قدر تاریخیں برطانوی عہد میں لکھی گئیں ان میں انگریزوں کے ہر عمل کو جائز قرار دیا گیا ہے اور سب نے اسے خدا کے نام سے موسوم کیا ہے۔ جب سلور کر نے پہلی مرتبہ اسے "جنگ آزادی" کا نام دیا اور اس موضوع پر کتاب لکھی تو یہ کتاب فوراً ممنوع قرار دی گئی۔

پاکستان میں تاریخ پر تحقیق کام تو بہت کم ہوا ہے "مگر میں بھی تاریخ کو خاص نقطہ نظر سے لکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ تاریخ لکھی کے جدید سائنسی اصولوں کو پیش نظر رکھا جائے اور ہر عہد کی تاریخ کو حوام کے سادہ حالات سے مربوط کیا

جائے۔ جس تاریخ میں عوام کے حالات سے آگاہی نہیں ہوتی اس تاریخ کو عمل نہیں کیا جا سکتا۔

تاریخ اور آج کی دنیا

نو تہذیبی دور میں برصغیر کی تاریخ کو سامراجی مقاصد کے تحت مسخ کیا گیا اور تاریخ کو اس نقطہ نظر سے پرچایا گیا کہ اپنے ماضی سے نفرت ہو جائے اور انگریزی دور حکومت خدا کی جانب سے نعت کی ہل میں نظر آئے۔ آزادی کے بعد اس بات کی شدت کے ساتھ ضرورت تھی کہ تاریخ کی نئے سرے سے تشکیل کی جاتی تاکہ ہم اپنے ماضی کے بارے میں صحیح اور تنقیدی جائزہ لے سکتے اور اس کی روشنی میں جدید تاریخ اور موجودہ حالات کو سمجھ سکتے۔ نو تہذیبی عہد میں رقم کی جانے والی تاریخ محض حکمران خاندانوں اور ان کی سیاست تک محدود تھی۔ لہذا ضرورت اس بات کی تھی کہ اس محدود دائرے سے نکل کر جدید عہد میں تاریخ کے مضمون میں جو تبدیلیاں آئی ہیں ان میں ثقافتی، سماجی اور سماجی حالات کو پیش نظر رکھا جاتا تاکہ ماضی کی ایک مکمل تصویر ہمارے سامنے آتی۔

ہمارے ہاں مروجہ سیاسی تاریخ جنگوں اور سازشوں کا مجموعہ ہے۔ جو نفرت و عناد پیدا کرتی ہے۔ جب کہ ثقافتی تاریخ معاشرتی سرگرمیوں کی عکاس ہوتی ہے جس میں انسانی رابطوں اور رشتوں کا اظہار ہوتا ہے اور جس میں انسانی قدریں اور روایات چھائی ہوئی ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ تاریخ لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتی ہے، ہمیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کرتی۔ تاریخ کا علم اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ یہ ہمیں اپنے ملک اور لوگوں کے بارے میں بھی معلومات فراہم کرتا ہے اس کے ساتھ ہی عالمی برادری کے حالات جاننے سے یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں بھی ہم جیسے انسان رہتے ہیں، ان کی ضروریات ان کے سوچنے اور غور کرنے کا انداز ہم جیسا ہے۔ ایک انسان ہونے کے ناطے وہ اور ہم ایک ہیں اور وہ انسانی تہذیبی راہوں سے چل کر یہاں تک آئے ہیں جن راستوں سے ہم گزر چکے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد عالمی تاریخ کا مطالعہ اور بھی زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے کیونکہ اس مطالعہ کے ذریعے ہم دنیا کے دوسرے ممالک کی سماجی تشکیل سے آگاہ ہو کر اپنی خارجہ پالیسی اور تجارتی تعلقات میں مثبت تبدیلیاں لائے ہیں۔ مثال کے طور پر روس اور امریکہ کی تاریخ کے ساتھ ساتھ ان دونوں ملکوں کے عوام کے ذہن اور فکر سے ہمارے لئے واقف ہونا ضروری ہے۔

آگے ان دو سیم عاقبتوں سے تعلقات کو فروغ دیتے ہوئے ہم اس کی تاریخی اہمیت سے انکسار نہیں کرتے۔ اس طرح ہمارے خیال سے تجارتی تعلقات میں مگر ہمارے بیشتر تجربہ کاروں کی تاریخ اور حالی قوم و ممالک سے واقف نہیں۔ اس لئے وہ اس سے بہتر طریقہ سے رابطہ قائم نہیں کر سکتے۔ اسی صورتحال نے مد نظر ترقی یافتہ ملکوں میں بڑی بڑی صنعتوں کی کمپنیوں کے ہر ایک خصوصی شعبہ ہوتا ہے جو "سیاسی خطرہ" (POLITICAL RISK) کہلاتا ہے۔ اس کا کام یہ ہے کہ حساب جس میں یہ کمپنیاں سرمایہ لگائیں انہیں وہاں کی سیاسی صورت حال، لوبی انقلاب کے خطرہ اور سیاسی تبدیلی سے باخبر رکھ جائے تاکہ کسی خطرہ کی صورت میں ان کا سرمایہ محفوظ رہے۔

پاکستان میں کے بعد ہم نے تاریخ کے ہر کو شخص ماضی کی سیاست تک محدود رکھا۔ درہم ہوتا ہوا قومی نقطہ نظر، بلکہ کوئی یا درحالیہ نقطہ نظر، اسے نکلے اس وجہ سے ہمارے ملی تاریخ کا علم اپنی کلیدی درجہ اہمیت کھوتا چلا گیا۔ کوئی تاریخ کا علم اس وقت تک اپنی قابلیت کو قائم نہیں رکھ سکتا جب تک یہ علم کسی معاشرے کی اقدار، روایات، مورادوں، اقتصادی جائزہ نہ لے لے اور معاشرے کی تبدیلی پر غور نہ کرے۔ ہر نقطہ نظر یہ ہے کہ تاریخ صرف ماضی کے صحیح خد خال اجاگر کرتی ہے بلکہ موجودہ صورتحال کا بھی تعین کر سکتی ہے۔ ہمارے ان جس تاریخ، فراموش کو پورا نہیں کر سکی تو معاشرے کے لئے اس کی کوئی فائدت بھی نہیں رہی۔

تاریخ کو غیر قبول جانے میں تعلیمی نصاب کا بڑا دخل ہے۔ اس نصاب میں تاریخ کو انتہائی محدود رکھا گیا اور چند گورسز کو ہر پارہر نکال کر اس میں پڑھا دیا گیا۔ انسانی ارتقاء، قدیم تاریخ، قدیم تمدنوں کی پیدائش و تعلقات جیسے اہم موضوعات کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ درجہ اولیہ فوج برصغیر میں حکمرانوں کے عہد پر دی گئی۔ اس میں بھی تنقیدی تجزیاتی مواد کی طرف توجہ نہیں دی گئی بلکہ جو مضمون مدرسین نے ایک مہرہ قائم کر لئے تھے اس پر مار دیا گیا۔ شکار میں لنگھنے کی حکومت کے دوران حالات کیسے تھے؟ اور اس کے باقی خیالات میں کیوں تبدیلی آئی؟ طالب علموں کو شخص موجودہ کے مواد کے لئے ایسے مواد دیے جاتے ہیں جو اس بات کا موقع نہیں دیتے کہ وہ واقعات کے مطالعہ اور تجزیے کے بعد اپنی رائے خود قائم کریں۔ ۱۹۶۸ء کی حالی میں جب تعلیم کے نصاب کو نئے سرے سے ترمیم کیا گیا تو اس مقصد کے لئے امریکی ماہرین کو بلا دیا گیا۔ انہوں نے ابتدائی مباحثوں میں تاریخ کے مضمون کو ختم کر کے اس کی جگہ سائنس، علوم کی ابتداء کی جس میں تاریخ اس کا ایک حصہ بن گئی۔ شاید امریکی

ماہرین تعلیم کے لئے تاریخ کا مضمون چاہتے ہو کیونکہ ان کے اپنے ملک کی کی تاریخ بالکل نئی ہے اور ماضی ان کے لئے زیادہ اہمیت میں رکھتا مگر ہمارے لئے تاریخ کا مضمون انتہائی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ ہمارے ارد گرد تاریخ بکھری ہوئی ہے اس لئے ہمارے لئے تو تاریخ کا شعور رہی ہے۔

اس کے علاوہ دوسری کوشش یہ کی گئی کہ پاکستان کے تمام صوبوں کے تعلیمی اداروں میں یکساں نصاب رائج کیا جائے۔ اس کی یہ دلیل دی گئی کہ حکومت کی ملازمین کے ہاں ہوتے رہتے ہیں اور یکساں نصاب کی وجہ سے ان کے بچوں کی تعلیم متاثر نہیں ہوگی۔ حالانکہ یکساں تعلیمی نصاب کا تصور بنیادی طور پر غلط ہے کیونکہ ہر صوبہ اور علاقہ میں مقامی حالات اور ضروریات کے تحت تاریخ پڑھائی جاتی ہے تاکہ طالب علموں میں اپنے صوبہ اور علاقہ کے بارے میں معلومات سے دلچسپی پیدا ہو، یکساں نصابی تعلیم نے اس گونا گوں معلوماتی طریقے کو پیدا نہیں ہونے دیا۔

اسی دور میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ تاریخ کے مرکز ان علاقوں کو بنایا جائے جو اس وقت پاکستان میں ہیں۔ ہندوستان کے مرکزی تصور کی وجہ سے چونکہ تاریخ کا دھارا اسی طرف بہتا ہے اس لئے اس کو بدل چاہئے۔ اس مقصد کے تحت "تاریخ پاکستان" کے نام سے نین جلدیں قدیم، وسطی اور جدید دور پر ملک کے مشہور مورخین کی لکھی گئیں لیکن تاریخ کو اس طرح سے مسخ کرنے کی کوشش بری طرح ناکام ہوئی کیونکہ عہد قدیم سے لے کر اب تک برصغیر کی تاریخ اس طرح سے سمجھی ہوئی ہے کہ اسے جیسے علیحدہ کرنا پڑا مشکل کام ہے۔ اگر قدیم اور عہد وسطی کی تاریخ کو چھوڑ کر ہم موجودہ دور میں آزادی کی تاریخ کا جائزہ میں تو اراکان ہر ملک آزادی کی جنگ میں لڑی گئی جو پاکستان میں نہیں ہیں اور ۱۹۴۷ء اور ۱۹۴۸ء میں تحریک آزادی پاکستان کے موجودہ علاقوں میں فعال ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سسٹم جو ہندوستان میں روئے مگر جنہوں نے تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا تھا ان کو فراموش کر دیا گیا۔

موجودہ دور میں اس بات کی کوشش کی گئی کہ ہم اپنی تاریخ کو برصغیر ہندوستان کے نین منظر میں سمجھنے کے بجائے ایک اور تہذیب میں دیکھیں۔ چنانچہ لفظ ہندوستان کی جگہ جنوبی ایشیائی اصطلاح کو رائج کیا گیا اور اس تعلیم کی ہدایات پر اس نقطہ کو تمام نصابی کتابوں میں استعمال کیا گیا بلکہ ایک ایک کے درجے اس کی حلاف و ردی پر اور نصاب سے روگردان پڑ چھ سینے کی مراستہ کر دی گئی۔

صرف پاکستان کی تاریخ پر توجہ مرکوز کرنے کا مطلب یہ ہوا کہ ہندوستان کی عہد وسطی کی تاریخ کو نظر انداز کر دیا گیا۔ قدرتی طور پر اس عہد کی تاریخ کے مطالعہ کے لئے ضروری ہے اس کی طرف کوئی توجہ سیر دی گئی ہو۔ اس کے نتیجے میں ہمیں آہستہ آہستہ پاکستان کی پختہ دہائیوں سے عہد وسطی کے ماہرین فہم ہو گئے۔

تحقیق کے کاموں میں سب سے بڑی رکاوٹ اس وقت آتی جب ہندوستان کی تاریخ پر لکھی ہوئی کتابوں پر ہندی حاکم کر دی گئی کہنگ یہ ڈر پڑا ہوا کہ کہیں یہ کتابیں ہمارے نظریاتی فیصلوں کو کمزور نہ کریں۔ اس وجہ سے ہمارے محققین اس کام سے بے جبر رہے جو اس کے ہندی ملک میں ہو رہا ہے۔ یہ تحقیق کی سب جہزی نے انہیں اپنی دنیا میں محدود رکھا۔

تاریخ کا سچا ناظر میں مطالعہ نہ کرنے سے ہم عالمی صورتحال اور اپنے خلاف ریشہ دانوں میں مصروف طاقتوں سے پوری طرح باخبر نہیں ہو پاتے اور نہ ہی اپنے ملک کے حالات و بہتر طریقے سے سمجھ سکتے ہیں۔ اس کی مثال اس سے دی جا سکتی ہے کہ جب بنگالہ سم سے ملحدہ ہوا تو ہمارے ملک کی اکثریت اس شدید دھچکے کے لئے ذہنی طور پر تیار نہیں تھی کیونکہ ہمارے شہری اس صحیح تاریخی پس منظر سے واقف نہیں تھے جو پاکستان بننے کے بعد وہاں تکلیف ہو تھا۔

یہی صورتحال آج بھی ہے کہ ہم پاکستان کے چاروں صوبوں کی تاریخ اور وہاں کے بدلتے ہوئے حالات سے واقف ہیں اس لئے حالات کے بارے میں صحیح فیصلہ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ موجودہ حالات کو سمجھنے کے لئے عالمی اور ملکی تاریخ سے آگاہی انتہائی ضروری ہے۔ تاریخ کو غفلت و تنصیب پڑنے کے بارے میں جاننے کے بجائے اس سے تعمیری تشکیل کا کام لیا جائے۔

تاریخ اور نصابی کتب

تعلیم حاصل کرنے کے پس میں نصابی کتابوں کی اہمیت اس لئے بہت زیادہ ہوئی ہے کہ ان کی کتابوں کے ذریعہ طالب علم ابتدائی گاموں میں اپنے نظریات و خیالات تشکیل دیتے ہیں جو بعض اوقات ان کی پوری زندگی میں تبدیل نہیں ہوتے کیونکہ اکثریت تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد مختلف طبقوں اور پیشوں میں مصروف ہو جاتی ہے اور مختلف مضامین میں ہونے والی تحقیق اور نئی دریافتوں سے وہ واقف رہتی ہے۔ اس لئے ان کی مطبوعات اعلیٰ نصابی کتابوں تک محدود رہتی ہے جو انہوں نے ابتدائی زمانہ میں پڑھی ہوتی ہیں۔

نصابی کتابوں کی اس اہمیت کو مد نظر رکھتے ہوئے ترقی یافتہ ملکوں میں ہر مضمون کی نصابی کتاب کو برقرار رکھنا ضروری ہے اور پھر یہ نصابی کتابیں کئی مصنفین سے تیار کر لی جاتی ہیں تاکہ مضمون کے بارے میں مختلف نقطہ دئے نظر کو پیش کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم کی مطالعاتی وقت کی رفتار کے مطابق ہوتی ہیں۔

اس کے برعکس ہمارے نظام تعلیم میں نصاب کی کتابوں کی تیاری میں ان میں سے کسی بات کا خیال نہیں کیا جاتا اور یہ کتابیں سیاسی ضرورتوں کے تحت تیار کر لی جاتی ہیں تاکہ جو بھی سیاسی نظام ہو اس کے نقطہ نظر سے طالب علم کے ذہن کو تیار کیا جائے۔ خصوصیت سے تاریخ اس لحاظ سے سب سے زیادہ اس کا شکار ہوتی ہے اور واقعات کو مسج کر کے ایک مخصوص نقطہ نظر کو دہرائیں پر غور کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسرے نقطہ نظر کو بالکل نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ جب نصاب کی کتابوں میں اس قسم کا مواد ہو گا جو طالب علم کی مطالعات کی راہیں بند کر دے گا تو اس کے نتیجے میں تنگ نظری، کم علمی اور متعصبانہ خیالات کا پیدائش ہوگا ایک فطری امر ہو گا۔

اسکولوں میں اب تاریخ کو بطور مضمون کی حیثیت سے نہیں پڑھایا جاتا لیکن جو کچھ بھی تاریخ کے نام پر پڑھا جاتا ہے اس سے تاریخ کا وسط کم ہی ہے۔ اس وجہ سے طالب علموں میں تاریخ کے بارے میں کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی ہے کیونکہ جب تک تاریخ کے بنیادی صورتات سے طالب علم کو واقف نہیں ہو گی اس وقت تک وہ تاریخ کے عمل کو نہیں سمجھ

تکے گا اور اس میں تاریخ کا کوئی شعور پیدا نہیں ہو گا۔ کیونکہ تاریخ صرف واقعات ہی کا نام نہیں اس کے پس منظر میں تہذیب کا ارتقاء، فتنہ نما اور ترقی کا پورا عمل ہے۔ اس عمل سے تب ہی آگہی ہو سکتی ہے جب کہ انسان کی ابتداء، تہذیب و تمدن کے ارتقاء اور قوموں کے عروج و زوال کے بارے میں پتہ ہو۔ طالب علم کو دنیا کی اہم اور بڑی تہذیبوں کے بارے میں معلومات کا پورا شعور ہی ہے تاکہ وہ اس سے واقف ہو کہ انسانی تہذیب کن کن مرحلوں سے گزر کر ترقی کے اس مرحلے تک پہنچی ہے۔ اگر طالب علم کو ابتدائی مرحلہ میں تہذیبوں کی پیدائش و ارتقاء کے بارے میں پڑھایا جائے تو اس سے اس کا ذہن وسیع ہو گا اور وہ نیک نظری سے نکل کر اس چیز کو محسوس کرے گا کہ دوسری تہذیبوں میں بھی علم کے فزائے ہیں اور ہم نے بہت سی روایات کو لٹا ہی ہے یا ہے۔ ہمارے اسکولوں میں تاریخ کا مصاب اس ضرورت کو پورا نہیں کرتا جس کی وجہ سے طالب علم کی معلومات فانی تاریخ کے بارے میں نہ ہونے کے برابر ہوتی ہیں۔

نصاب کی کتابوں میں جو سوود پیدا جاتا ہے اسے نئی تحقیق کی روشنی میں نہیں لکھا جاتا اور تاریخ کے مضمون میں یہ بھی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور نیا مواد دریافت ہو رہا ہے اس سے طالب علم ہواقت رہتا ہے اس وجہ سے تاریخ میں جو لحاظ فیض پہلے سے کر لئے گئے تھے ان ہی فیضوں کو سچ تک ان نصاب کی کتابوں میں دہرایا جاتا ہے۔ مثلاً کبیر کے بارے میں نصاب کی کتابوں میں یہ درج ہے کہ اس نے دین اہل کے نام سے ایک خانہ جنگی چار کیا تھا۔ پورائے ایک زمانہ میں ایک خاص ذہن اور نیک نظری وجہ سے وہی گئی تھی اور اس کے بارے میں محمل تحقیق اس وقت تک نہیں ہوئی تھی مگر اب کبیر پر نئی تحقیقات ہوئی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس نے برہمنی رواداری کو اس وقت اختیار کیا جب وہ ریر دست مذہبی تھا اور راجپوت شہزادیوں سے اس وقت شادی کی جب وہ خواجہ حسین الدین چشتی کے حواری ہیں نہارت کی مرض سے جانا تھا۔ نئی تحقیقات کے بعد اب یہ ثابت ثابت کر دی گئی ہے کہ مغل بادشاہوں کے مذہبی خیالات کا ان کی محلی سیاست سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اور کبیر نے اگرچہ مذہبی معاملات میں پڑا شہدہ پسند تھا مگر اس کے دیہات میں ہندو منصب وادوں کی تعداد کبیر سے زیادہ تھی۔ فیضوں کا مخالف ہونے کے باوجود اس نے انتظامیہ میں انہیں رہنے دیا اور انہیں سنی مراد و عطا مطالبہ کے باوجود بر طرف نہیں کیا۔

کبیر نے جو مضمر نامہ جاری کیا تھا اسے سنسٹ اسمتھ نے عقیدہ معصومیت کہا۔ اس کے بیان میں یہ لکھتے ہوئے سوچ کی پوزیشن تھی جو ان کے نزدیک معصوم اور مذہبی معادلت میں

مذہب اختیار ہوتا ہے۔ جب کہ اس مضمر نامہ میں کبیر نے اس قسم کا کوئی دعویٰ نہیں کیا مگر اسمتھ کا یہ نظریہ اس قدر متبوع ہوا کہ اب تک کتابوں میں اس کی تصحیح نہیں کی گئی۔ ایک اور ملحوظہ جو تاریخی ادبی کتابوں میں ملتا ہے وہ یہ کہ کبیر کے اتحاد کا حوالہ احمد سرمدی مجدد الف ثانی نے کیا جو کہ تاریخی لحاظ سے بالکل غلط ہے۔ مجدد الف ثانی کا ذکر جاکبیر کے زمانہ میں آتا ہے۔ کبیر کے بارے میں جو اس پر لکھ ہوئے التزام لگایا ہے اس کا بھی تاریخی حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔

اسی طرح تاریخی نصاب کی کتابوں میں سمری دور کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے مثلاً شاہ جہان کا عہد معیہ دور کا سمری عہد تھا۔ سوال یہ ہے کہ سمری عہد کس طبقہ کے لئے تھا۔ بادشاہ کی لئے، اس کے امراء کے لئے یا عوام کے لئے۔ کیونکہ اسی عہد میں جب تاج محل لاا لکھ اور دوسری عمارتیں بن رہی تھیں ہندوستان میں مسلسل قحط بھی پڑ رہا تھا۔ درہم بھوکوں مر رہے تھے اس لئے یہ دور قحط زدہ اور مرنے والے عوام کے لئے تو سمری نہیں ہو سکتا۔

نصاب کی کتابوں میں عام طور سے مذہبی شخصیتوں کو پر عظمت بنانے کے لئے حکمرانوں کے کردار کو مسخ کر کے پیش کیا جاتا ہے۔ عہدہ ٹیکسٹ بورڈ کی انہوں جماعت کی اردو کی کتاب میں ایک مضمون بہاول الدین زکریا پر ہے۔ اس مضمون میں بہاول الدین قبچہ کو جو ملتان اور ایچ کا حکمران تھا اسے باقی نصاب اور عالم تیار ہے اور یہ آثار رہا ہے کہ اس نے سلطان دہلی سے بغاوت کر رکھی تھی۔ اس پر اسے مضمون سے مصنف کی تاریخ سے ناواقفیت ظاہر ہوئی ہے۔ بہاول الدین قبچہ عہد خودی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے ملازموں کی طرح اس کا وارث تھا اور جس طرح قلعہ ادریں نے دہلی اور تاج الدین نے غزنی میں خود مختارانہ طور پر اختیار سنبھالے اسی طرح اس نے ملتان اور سندھ میں خود مختار حکومت قائم کی اس لئے انہیں جس نے اس کی ریاست پر حملہ کیا اس کی حیثیت جارح کی تھی اور قبچہ نے یہ جنگ اپنے خفیہ کے لئے لڑی۔ اس کے علاوہ قبچہ نے ان طوائف اور شعراء کی سرپرستی کی جو محلوں کے مصلوں کے نتیجہ میں وسد ایشیا و ایران سے بھاگ کر اس کے دیہات میں آئے تھے۔ اس نے ان کے لئے ایچ اور ملتان میں تعلیمی ادارے قائم کئے اور ان کی مالی امداد کی۔ بد قسمتی سے تاریخ کے حقائق کو نظر انداز کر کے پورے واقعہ کو ڈرامائی انداز میں لکھا گیا ہے جس کی وجہ سے طالب علم قبچہ کے بارے میں انتہائی خراب رائے قائم کرتا ہے۔

عام طور سے نصاب کی کتابوں میں مصنف شخصیتوں اور واقعات کے بارے میں ٹیپے فیصلے دیتا ہے کہ کن کن اچھا تھا اور کن برا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طالب علم ابتدائی

ہے ان فیصلوں کی روشنی میں تاریخی شخصیتوں کو دیکھنے کا عادی ہو جاتا ہے اور اس کی یہ رائے آخر وقت تک قائم رہتی ہے۔ اصولی طور پر ابتدائی کلاسوں میں طالب علم کو تاریخی واقعات سے آگاہ کیا جائے اور اس میں یہ تجزیاتی جستجو پیدا کی جائے کہ وہ تاریخی واقعات کی روشنی میں اپنی رائے طور قائم کرے۔

برصغیر کی تاریخ پر اردو میں بحرِ فصاحتی کتابیں نہ ہونے کی وجہ سے اب تک ابنِ انگریزی کتابوں کے دورے میں سفارش کی جاتی ہے جو تنقیر سے پہلے لکھی گئی تھیں ان کتابوں میں نہ صرف یہ کہ پرانا تاریخی مواد ہے بلکہ یہ ایک مخصوص نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں اور وقت کے لحاظ سے اب یہ اپنی افولت کھ چکی ہیں مگر چونکہ اردو کا انگریزی میں نئے مواد کی روشنی میں کتابیں موجود نہیں اس لئے ان کتابوں کا بھی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔

مصائب کی کتاب لکھنے کے سارے دو باتوں کا ہونا انتہائی ضروری ہے ہم عصر تاریخ یا محدود کا مطالعہ کرنا ضروری ہے تاکہ ان سے نتائج اخذ کئے جائیں اور سب سے اب تک جو بھی جدید تحقیق ہوئی ہے اسے مصائب کی کتاب میں شامل کیا جائے اس نقطہ نظر سے پاکستان میں برصغیر کی تاریخ پر مصائب کی کتاب نہیں لکھی گئی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مصائب کی کتاب کی غیر موجودگی میں تاریخ کے بارے میں امریکی معلومات انتہائی پس ماندگی کی حالت میں ہیں اور ہمارے طالب علموں کے ذہنوں میں اب تک غلط تاریخی فہم اور مفروضے بیٹھے ہوئے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں تاریخ کل اس بات کی اہمیت پر مبنی جا رہی ہے کہ مضمون کو ہم عصر مفروضوں کی روشنی میں پڑھایا جائے۔ اس مقصد کے لئے محققوں سے تجاویز لے کر ان کا تجزیہ کیا جائے تاکہ طالب علم اس حمد کی درجہ سے واقف ہو سکے اور تاریخ کے عمل کو بخوبی سمجھ سکے اس سلسلے میں بھی اب تک ہمارے ہاں کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ فارسی سے عاداتیت نے ہم عصر مفروضوں کو طالب علموں کی پہنچ سے دور کر دیا ہے۔

تاریخ کے مضمون سے لاپرواہی میں اس غلط فہمی کو بڑا دخل ہے کہ جس کے ذریعہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ تاریخ تبدیل نہیں ہوتی۔ ایک واقعہ جو ماضی میں ہو جاتا ہے وہ اسی طرح رہتا ہے اس لئے تاریخ بھی مجید رہتی ہے اور ایک بار جو تاریخ کی کتاب لکھ دی گئی اس میں تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی جب کہ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ بھی تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ واقعہ تو یہی رہتا ہے مگر اس واقعہ پر یہ سہاوے ہمارے اس کی حقیقت اور شکل بدل جاتی ہے۔

اس کے بیان کرنے میں جو نقطہ نظر ہوتا ہے اس سے واقعہ کا انداز بدل جاتا ہے۔ وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہندوستان 1857ء کی بغاوت جنگ آزادی ہند گئی اور اس کے باقی اب

قوی ہیں۔ اس لئے تاریخ بھی وقت اور نظریات کے ساتھ بدلتی ہے۔ اس چیز کو ہمیں میں دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ مصائب کی کتابوں کو بھی مسلسل نئے نظریات اور نئی تحقیق کی روشنی میں لکھتے رہنا چاہئے تاکہ تاریخ کا علم ایک جگہ رک کر نہیں رہ جائے اور تاریخ کے عمل کو کہیں ٹھہرا ہوا نہ سمجھ لیا جائے۔ تاریخ کے مضمون کی افولت فہم ہونے اور اس کے غیر دلچسپ ہونے میں ہماری نصابی کتابوں کا بڑا دخل ہے جو بدلتے ہوئے حالات کا ساتھ نہیں دے رہی ہیں اور یہی ان کے پاس نئے چیلنجوں کا سوا جواب ہے۔

تاریخ اور شکست

قوموں کی تاریخ میں سب فتوحات ہی اہم نہیں، ہمیں بلکہ شکست بھی سب کی زندگی میں ہمہ تن دیا ہے کرتی ہیں۔ اس لئے شکست کا تجزیہ اس کے اسباب و وجوہات اور نتائج کا مطالعہ قوموں کی تاریخ میں شامل اہم ہوتا ہے کیونکہ جب تک اس کا تجزیہ نہیں کیا جائے گا اور اس کی اہمیت کو نہیں سمجھا جائے گا اس وقت تک اس سے سبق بھی نہیں سیکھا جاسکے گا کیونکہ شکست قوم کی غیور کھڑیوں کی وجہ سے ہوتی ہے اگر اس کے درپردہ پیوری کمزوریوں کی نشان دہی کی جائے تو قوم ان کمزوریوں کو دور کر کے سادہ شہرت کے بنیادی ڈھانچے کو بدل سکتی ہے، درجہ تبدیلی قوم کی زندگی میں ایک نئی روح پھونک سکتی ہے۔

تاریخ میں ایسی ہی مثالیں ہیں کہ شکست کے بعد قوموں میں سیاسی، معاشی اور سماجی شعور پیدا ہوا۔ یورپی تاریخ میں اس کی مثال جرمنی کی ہے کہ جب نپولین نے آسٹریا کے ساتھ جرمن ریاستوں کو شکست دے دی اور جرمن فرانسیسیوں کے ملحق ہو گئے تو ان شکستوں نے جرمن قوم کو سمجھ کر رکھ دیا اور اس کے بعد ہی سے اس میں قوم پرستی کا گہرا جذبہ ابھرا جس کے ذریعہ شہسواروں نے نہ صرف جرمن ریاستوں کو متحد کر کے ایک جرمنی کی بنیاد ڈالی بلکہ تاریخی و ثقافتی طور پر قوی آسٹریا کو بھارت کر کے قومیت کی جڑوں کو مستحکم کیا۔ اس عمل میں سیاست دانوں، شاعروں اور مورخوں نے حصہ لیا اور جرمن قوم و جرمن ثقافت کی نئے سرے سے تشکیل کی۔ قومیت کے ذریعہ اثر جرمنی یورپ میں ایک قوت بن کر ابھرا اور 1871ء میں فرانس کو شکست دے کر اپنی پالاوسی کو دوبارہ قائم کر لیا۔

اس کی دوسری مثال ترکی کی ہے کہ جب پہلی جنگ عظیم میں ترکی کو شکست ہو گئی اور اتحادیوں نے اس کے حصہ بحریہ کرنے کا منصوبہ بنالیا تو اب محسوس ہوا تھا کہ ترکی بحیثیت آزاد ملک کے ختم ہونے والا ہے لیکن جب اتحادیوں کے ذریعہ اٹوین نے اسس پر حملہ کیا اور اس کے شہروں پر قبضہ کر کے آبدی کا قتل عام کیا تو ترک اس شکست کو برداشت نہیں کر سکے اور ان پر جو ماری اور بے رحمی کی کیفیت طاری تھی وہ دور ہو گئی۔ اور حصہ آوروں سے مقابلہ کرنے کے لئے قوم میں نئے سرے سے حوصلہ، بات، عزت پیدا ہو گئی۔

کمال آت ترک کی رہنمائی میں انہوں نے نہ صرف یونانیوں کو شکست دی بلکہ اتحادیوں کے ساتھ بھی اپنی شرائط پر نہ معاہدہ کیا اور دنیا کی قوم میں ایک باعزت مقام حاصل کیا۔

ان دونوں مثالوں سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ شکست کے بعد بھی قوموں کی طاقت و توانائی ختم نہیں ہو جاتی۔ ضرورت میں طاقت کی ہوتی ہے کہ قوموں کی اس اندرون اور غلبہ توانائی کو استعمال کیا جائے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے جب قوموں میں بحیثیت جمعی یہ احساس ہو کہ وہ قوی بدو جہد میں حصہ لے رہی ہیں جس کے نتیجے میں وہ بحیثیت قوم فائدہ اٹھا سکیں گی اور یہ کہ ان کی بدو جہد صرف چند افراد اور طبقوں کے لئے نہیں ہے۔

دوسری جنگ عظیم نے جو تاریخی و برابری پیدا کی اس نے فتح مند اور شکست خوردہ دونوں قوموں کو متاثر کیا۔ مگر خاص طور سے جرمنی کو اس شکست نے تبدیل کر کے رکھ دیا کیونکہ جرمنی صرف جنگ کے دوران ہی تباہ و برباد نہیں ہوا بلکہ ہٹلر کی حکومت کے دوران فاشزم کے ہاتھوں جرمنی کے تمام ادارے متاثر ہوئے اس لئے جنگ کے بعد شکست نے جرمن قوم کو غور و فکر کرنے اور سوچنے کا موقع دیا کہ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ ان کے ملک میں فاشزم کی جڑیں کیوں مضبوط ہوئیں؟ اور ہٹلر کیوں ایک طاقت ور آمر کی حیثیت سے ابھرا؟ اور یہ کہ اب آئندہ جرمنی کو کس طرح اس قسم کے فاشزم اور آمرانہ طرز حکومت سے بچا جائے۔

جرمن دانشوروں نے فاشزم کے پیدا ہونے کی وجہ یہ بتائی کہ جرمنی میں جمہوری روایات اور اداروں کی بنیادیں سری نہیں تھیں جس کے نتیجے میں آمرانہ قوتیں و ابھرنے کا موقع ملا اور انہوں نے ریاست پر قبضہ کر کے اس کے تمام اداروں کو اپنے ہاتھ کے لئے استعمال کیا۔ لہذا فاشزم کے ابھرنے کے امکانات کو ختم کرنے کے لئے ان دانشوروں کے نزدیک سب سے زیادہ ضروری اور اہم قدم یہ تھا کہ جرمنی میں جمہوری روایات و قداری بنیادوں کو مضبوط کیا جائے اور حکومت و ریاست کے تمام معاملات میں لوگوں کو زیادہ سے زیادہ شریک کیا جائے تاکہ اس جمہوری عمل کو کوئی آمرانہ طاقت ختم نہ کر سکے۔ اس لئے جنگ کے بعد سے جرمن معاشرہ میں ہر سطح اور ہر طبقہ میں جمہوری اداروں کو فروغ دیا گیا ہر ادارے میں کام کرنے والوں کی یونین بن گئی اور ہر کام بحث و مباحثہ کے بعد وفاق کے (دیسے ہو) تاکہ اختیارات کسی ایک شخص کے ہاتھوں میں جمع نہ ہوں۔ جمہوری اداروں کی یہ نشوونما جرمن شکست کا نتیجہ ہے اور ان کی یہ خواہش ہے کہ اس جمہوری عمل کو اس قدر مستحکم اور توانا بنادیا جائے کہ متحدہ نہ تو شہرت قائم ہو سکے اور نہ ہی جنگ کے تباہ کاریوں کا نشانہ بن سکے۔

یہی صورتحال جاپان کی تھی مگر جنگ میں شکست کے بعد جاپانیوں نے بھی اپنے معاشرہ کے ڈھانچے کو بنیادی طور پر تبدیل کیا اور جمہوری مصلحت کے ذریعے پوری قوم میں تبدیلی کی ایک لہر پیدا کر کے عوام کی صلاحیتوں کو صنعتی ترقی میں استعمال کیا۔ لیکن شکست قوموں کے لئے اسی وقت رہنمائی کا باعث ہو سکتی ہے جب قوم اپنی شکست اور اس کے اسباب کا تجزیہ کرے اور سب سے پہلے یہ کہ شکست کو تسلیم کر لے اور اس سے بعد ان کنٹراپوں کو دور کرنے کے لئے اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی ڈھانچے کو بنیادی طور پر تبدیل کرے کیونکہ اس کے بغیر نہ تو معاشرہ میں کوئی تبدیلی آسکتی ہے اور نہ ہی معاشرہ شکست سے کوئی سبق سیکھ سکتا ہے۔

جب ہم اپنی تاریخ میں بھگدوشی کی طبعیت اور اپنی شکست کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کے بعد یہ سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ اس شکست کے بعد ہمارے معاشرہ میں کیا تبدیلی آئی اور ہم نے اس سے کیا سبق حاصل کیا؟ ہم نے اپنی شکست کو تسلیم کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں کی نشان دہی کی اور کیا اس شکست نے ہمیں یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ ہم اپنے سیاسی، سماجی اور معاشی ڈھانچے کو بدلیں اور جمہوری روایات کو فروغ دے کر آئندہ ہونے والی شکستوں کو روکیں؟

تاریخ اور احساس جرم

اقوام عالم کی تاریخ جنگ و جدوجہد، قتل و غارتگری اور خون ریزی سے بھری پڑی ہے۔ قومیں ایک دوسرے پر حملہ کرتی رہی ہیں جس کے نتیجے میں ہر من لوگوں کا قتل، بے گناہی، عورت گاہیوں کی بے رحمی، مال و دولت کی لوٹ کھسوٹ، اذیت اور ایذا رسائی پر عمل ہوتا رہا ہے۔ جب حملہ آور اقوام مال و دولت لے کر واپس اپنی سر زمین میں جاتی تھیں تو ان کا استقبال بیہشیت قاتل کیا جاتا تھا۔ قاتل و کاروائی کے نقشہ میں کسی کو ان مظلوم لوگوں کا دیاں نہیں آتی تھی جن کے خون سے ہونے لگیں کریمہ مال حاصل کیا گیا تھا۔ قاتل کے بعد بیٹھ جیسے خرم ہوتا ہے احساس جرم نہیں اور یہی تاریخی کاسب سے بڑا المیہ ہے۔

اس لئے یہاں ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ قوموں میں یہ احساس جرم کیوں نہیں پیدا ہوا؟ جب کہ انہوں نے بعض اوقات جواز اپنے ہمسایہ ملکوں پر حملے کیے اور ان کی زمینوں اور مال و دولت پر طاقت و قوت سے قبضہ کر کے انہیں بے دخل کر دیا، لیکن انہیں کسی ایک لمحہ بھی یہ خیال نہیں آیا کہ وہ انسانیت کے خلاف جرم کر رہے ہیں۔ ان حملوں اور لوٹاوت کے بے شمار جرائم جیسے کوئی نہ کوئی ایسا نظریہ ہونا تھا جو ان کے حملوں، قتل و غارتگری اور لوٹ مار کے لئے جواز فراہم کرتا تھا اور جس کی وجہ سے انہیں یہ یقین کامل تھا کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس کے ذریعے ایک مشن کی تکمیل ہو رہی ہے۔ دوسری جانب مظلوم اور مظلوم قومیں اپنی ناقص اور بنیادی کو غلامی، بھگتی، دہشت اور اپنی مصیبتوں کو گناہوں کی سزا کے طور پر برداشت کرتی رہیں جس وقت چنگیز و ہلاکو نے وسط ایشیا اور ایران میں تباہی پائی تو مسلمان اس کو خدا کی جانب سے عطا ہوا عذاب الہی سمجھتے رہے۔

قافضیں جب ایسے قتل و غارتگری کو مقدس مصلحت سمجھ کر سرانجام دیتے تھے تو ان میں احساس جرم پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پرتگیزیوں نے لاطینی امریکہ میں مقامی باشندوں کا سب سے قتل عام کیا کہ وہ غیر مسلمان تھے اور اس سے گمراہ تھے اور ان کا مشن یہ تھا کہ وہاں لوگوں کو مسیحیت بتا کر ان کی آخرت کی راہ دکھائیں۔ یورپی قزاق نے امریکہ، شریلیہ اور نیو ری لینڈ۔ مقامی باشندوں کا سب سے کر کے ان کی زمینوں پر اس لئے قبضہ کیا کہ وہ غیر مذہب تھے۔ یہی نظریہ

کی بنیاد پر انہوں نے ایشیا، افریقہ کی نو آبادیات میں قتل و غارتگری اور لوٹ کھسوٹ کو عادی قرار دیا۔ لوٹ کھسوٹ کے اس پورے عمل میں کیس بھی ان میں احساس جرم پیدا نہیں ہوا۔ نینس تاریخ کے نقطہ نظر میں دوسری جنگ عظیم کے بعد بددیہتی اتنی کم کہ اس جنگ کے نتیجہ میں جو یہ تباہی ہوئی اس نے فاتح اور مغلوب دونوں کو متاثر کیا۔ خصوصیت سے اس جنگ کی آمد اور بغیر اس کی حکومت نصری۔ جنگ کے خاتمہ کے بعد جرمن قوم نے بحیثیت مجبور اس آمد دہائی کو قبول کرتے ہوئے جنگی جرائم کا اقرار کر لیا۔ لہذا اس احساس جرم کے ساتھ جرمنی میں اس دور کی جو تاریخ لکھی گئی اس میں انہوں نے فاشزم کی ابتداء بطور کے طور پر درج کی ابتدا اور اس کے نتائج کا تجزیہ کیا۔ اور انہوں نے اس جرم کو تسلیم کیا۔ یہ بڑے بڑے دور میں انسانیت کے خلاف سرزد ہوئے تھے۔ صرف یہ بلکہ انہوں نے ان جرائم کو "جرائم" سے بڑھ کر "جرائم" کے طور پر درج کیا۔ جن سے ان جرائم کی تصدیق ہوتی تھی "جرمنی" میں سرحدوں نے ملنے کے دور میں ہوئے جرائم کو قتل چبانے کی کوشش کی اور نہ ہی اس کے حق میں "نیل سین کو شش کی۔"

آرچر بطور کے ساتھ اس جنگ میں مسوئیت کا اٹلی اور جاپان بھی شامل تھے مگر اٹلی میں مسوئیت سے خود بدعت ہوئی اور پچاسویں دہائی گئی۔ اس طرح اٹلی نے اپنے جرائم کا کفارہ ادا کر دیا۔ جاپان میں ہیروشیما اور ناگاساکی پر بموں نے جو چھ بچے تو اس کے نتیجہ میں اس کے وہ مظالم جو اس نے مشرق بعید کے ملکوں میں کئے تھے وہ ہمیں نظر میں چلے گئے اور ان میں اپنے جرائم کے بارے میں احساس جرم نہیں ہوا۔ لیکن جرمنوں کے احساس جرم سے جرمنی کی تاریخ اور اس کے مستقبل پر گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ انہوں نے اس کا بھرپور تجزیہ یہ کیا کہ جرمنی میں بطور اور فاشزم کن حالات میں پیدا ہوئے اور اب آئندہ اس عمل کو کیسے روکا جائے؟ اس کے ساتھ ہی انہوں نے جنگ کے نتیجہ میں جو قربانیاں حاصل کیں۔ ان قربانیاں سے سب سے زیادہ اس دور آزادی کا احساس دلایا۔ اس اپنی شعور کی وجہ سے جرمنی میں ان لوگوں کی کوئی عزت نہیں رہی جن کا نازی پارٹی اور بطور کی حکومت سے کوئی تعلق رہا ہو۔ نازی کی اصطلاح "علم و فاک" ایک علامت بن گئی۔

اس احساس جرم کا اعتراف جرمنوں نے کیا اگرچہ اس سے جنگ دوسری قومیں تو نہیں سنیں مگر اس کے اثرات تاریخ پر دور رس ہوئے۔ دوسرے نام کی جنگ میں امریکہ کی شہریت اور ان کے مظالم کے خلاف امریکی قوم نے زبردست تحریک چلائی اور احساس جرم کے ذریعہ ان میں جنگ کے خلاف بڑے بڑے مظاہرے ہوئے جس کے نتیجہ میں آخر کار امریکہ کو جنگ بند

کئی ہیں۔

۱۔ اس احساس جرم کے اس جذبہ کے ساتھ اب پوری تاریخ کی تکمیل سے نقطہ نظر سے دیکھا جائے۔ اس دور کی قوم نے نوآبادیاتی دور میں جو مظالم کئے تھے اب نہ صرف انہیں نہایت یاد ہے۔ بلکہ ان جرائم کا اعتراف بھی کیا جا رہا ہے۔
۲۔ جس کو بدلنے کے لئے اور دنیا سے جنگ و خون ریزی کو ختم کرنے کے لئے
۳۔ یہ تین اور ظالموں میں احساس جرم پیدا کیا جائے کیونکہ اس کے بعد یہ ممکن ہو
۴۔ جنگ ختم ہو جائے۔ اور اسی صورت میں دنیا میں پائیدار امن قائم ہو سکے

تاریخ اور تحریکیں

انسان کی حیثیت سے یہ خواہش رہی ہے کہ نسلی معاشرے سے علم و رسم اور اتصال کو ختم کیا جائے اور ایک ایسا مثالی معاشرہ قائم کیا جائے جس میں امن و انصاف ہو اور انسان دیکھو سے بات کر سکے کہ ساتھ زندگی گزار سکے۔ انسان کی اس خواہش کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ طائفے ہوتے ہیں جو معاشرے کے تمام راسخ پر قابض ہوتے ہیں جن کے پاس قوت و طاقت ہوتی ہے۔ درجہ میں چاہے کہ ان کی اعلیٰ و برتر حیثیت فہم ہو اور وہ مراعات سے مستور رہیں۔ اس نئے معاشرے میں طبقاتی کشمکش کسی نہ کسی صورت میں جاری رہتی ہے۔

اس صورت میں جب کہ معاشرے کی اکثریت کو اپنے حقوق میں ملنے والے پر انصاف کے دور الہ سے محروم کر دیے جاتے ہیں اور انہیں زندگی کی آسائشوں سے محروم کر دیا جاتا ہے تو اس صورت حال میں ان کی جانب سے دو قسم کا رد عمل پیدا ہوتا ہے: ایک یہ کہ میں اس دنیا اور اس دنیا کے کاروبار سے نفرت ہو جاتی ہے اور دوسرا یہ کہ وہ ایک ایسے نظام کے خلاف کہ جس میں ان کے لئے کوئی بااقتدار مقام نہیں، احتجاج کرتے ہیں۔ اور اس نظام کی تمام روایات و تقاریر اور اصولوں کو رد کر دیتے ہیں۔

پہلی صورت میں جو رد عمل پیدا ہوتا ہے اس میں انسان کی بے بسی، لاچارگی اور مجبوری ہوتی ہے۔ اسے اپنی بدعہد کے نتائج نکلنے نظر نہیں آتے اس کے ہاں وہ صرف روایات کی ایسی سخت روانہ نظر آتی ہیں کہ وہ میں توڑے کی ہمت نہیں کر پاتا، زندگی کی سہولتیں اور آرام و آسائش اس کے لئے خوب بن جاتے ہیں۔ لہذا اس صورت میں وہ صرف ترک دنیا کے ذریعے اپنے لئے سکون کا راستہ تلاش کر سکتا ہے اور انی درجہ سے وہ زندگی گزارنے کا حوصلہ کرتا ہے کہ جس میں دنیا کے مصائب کو صبر و شکر کے ذریعے برداشت کرنے کی تلقین کی گئی ہو۔ اور انی لئے وہ دیوہی تعلقات توڑ کر ریاضت اور اپنے نفس کو مارنے کی کوشش میں مصروف ہوتا ہے۔ اس قسم کی تحریکیں اور نظریات چونکہ معاشرے کے اعلیٰ طبقوں کے نظام کے لئے خیر ناک نہیں ہوتے اس لئے انہیں برداشت کر لیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس دوسرا رد عمل عوامی و درباری کا ہوتا ہے اور ایک ایسے معاشرے

کہ جو عوام کو انصاف نہیں دے سکے، اور اکثریت کو ان کے حقوق سے محروم کر کے انہیں بے مامت میں رکھے، اس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے ایسی تحریکیں اٹھتی ہیں جو معاشرے کی تمام روایات، اقدار اور اداروں کو ہلکا کر دینا اور بڑوں سے انکسار پھینکنا چاہتی ہیں اور لوگ یہ چاہتے ہیں کہ ایک ایسے معاشرے کا قیام عمل میں لایا جائے کہ جس میں تمام افراد کو مساوی حقوق ملیں۔ ان تحریکوں میں ایسے تمام طبقے شامل ہوتے ہیں جو معاشرے کے سفلے ہوئے ہوتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت کا تعلق نچلے درجہ کے لوگوں سے ہوتا ہے۔ یہ تحریکیں خصوصیت سے اس وقت مقبوضت حاصل کرتی ہیں جب معاشرے میں جنگ، فساد، سیلاب اور انقلاب کے نتیجے میں اکثریت معاشرے پر حاوی کا مظہر ہوتی ہے اور ان میں عدم تحفظ کا احساس زیادہ ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں معاشرے کی اکثریت کا رشتہ بالائی طبقات کے نظام سے کنوڑ ہو جاتا ہے اور انہیں اس نظام سے نفرت ہو جاتی ہے جو انہیں ان مصیبتوں سے نجات دلانے میں ناکام رہا۔ اس نفرت کا اظہار وہ اس نظام کی ہر چیز کو رد کر کے کرتے ہیں۔

چونکہ ایسی تمام تحریکیں اور ان کے نتیجے میں پیدا ہونے والے نظریات، خیالات، بالائی طبقوں کے لئے ایک چیلنج ہوتے ہیں اس لئے وہ انہیں فوری طور پر کچل کر ختم کرنا چاہتے ہیں۔ ابتداء میں عام طور سے ان تحریکوں کے خلاف پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے اور ان کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جاتی ہیں تاکہ معاشرے کے لوگ ان سے بدگمان ہو کر ان سے قطع تعلق کر لیں اور جب لوگوں کو ان سے دور کر دیا جائے تو حکومت اس گروہ کو آسانی سے ختم کر سکے۔

جب بھی معاشرے میں ایسی احتجاجی تحریکیں پیدا ہوتی ہیں جو معاشرے کی اقدار اور ضروریات سے انکار کرتی ہیں تو اس کی تہ میں معاشرے کی ناانصافیوں ہوتی ہیں اور مظلوم افراد معاشرے کی جگہ ایک ایسا نظام لانا چاہتے ہیں کہ جس میں وہ عزت کے ساتھ رہ سکیں۔ تاریخی شعور کے ساتھ اب باؤس ہو کر دنیا کو چھوڑ دینے کا ارادہ کنوڑ ہو گیا ہے اور اس کے بجائے اپنے حقوق کے حصول کے لئے جدوجہد کرنے کا جذبہ بیدار ہے۔

اور برتر ہیں اس لئے حکومت کرنے کا حق انہی کو ہے جب کہ جسمانی محنت کرنے والے کم تر اور ذلیل لوگ ہیں اور ان کا کام ہلا دست طبقہ کی خدمت کرنا ہے۔ اس نظریہ کے تحت قدیم ہندوستان میں برہمنوں نے ذات پات کی تعلیم کو پیدا کیا جس میں ان کی بالادستی پیشہ کے لئے قائم ہو گئی۔ یہی نظریہ پورے جاگیردارانہ دور میں ہے انتہا متحول رہا کیونکہ اس کے ذریعہ یہ ممکن تھا کہ کسانوں، مزدوروں اور دست کاروں کو دبا کر رکھا جائے یہاں تک کہ ہاتھ سے کام کرنے والا معاشرہ میں انتہائی حقیر طبقوں سمجھ جانے لگا اور کام کرنے والے سے لفظ کی نگاہ آج ذلیل کے سہوں میں استعمال ہوتا ہے۔ برہمنوں کی اس بالادستی کے خلاف ہندو نے کبوتر اٹھائی تو اس کا مقصد بھی ذات پات کو ختم کرنا نہیں تھا بلکہ کھنڈیوں کی بالادستی کو قائم کرنا تھا اس لئے ذات پات کی تعلیم سے کھنڈیوں اور درجہ پر آگے اور برہمنوں کے دوسرے پر۔ یہی وجہ تھی کہ ہندو مذہب کو کھنڈیوں نے قبول کر لیا کیونکہ اس کی وجہ سے ان کا ذاتی و مذہبی درجہ بلند ہو گیا۔ مگر دوسری ہنگی ذاتوں کی زندگی میں اس سے کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

ہمیں مذہب اپنی امن پسندی کی وجہ سے ہندوستان کے ماحول میں مقیم ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چونکہ تاجر طبقہ کی خوش حالی اور تجارت کے فروغ کے لئے امن و امان اور سکون کا ہونا ضروری ہوتا ہے اس لئے وہ ہر اس مذہب اور تحریک کی حمایت کرتے ہیں جس میں انتشار کو دور کر دیا جائے اور جس کے ذریعے جنگ و جدل اور قتل عام کو روکا جائے۔

مسلمانوں کی تاریخ کے سیاسی عمل کو بھی گروہی اور طبقاتی مفادات کے منظر میں بہتر طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ امیرِ ہند حکومت میں عربہ اور گروہی فرقوں کو اس لئے حکومت کی سرپرستی حاصل رہی کہ ان کے مفاد کے ذریعہ امیرِ حکومت کو اپنے مقام کا اجرا ملتا تھا۔ امیر اور مہاراجا دور میں ایرانیوں میں قومیت کی ابتداء ہوئی کیونکہ انہیں معاشرہ میں مساوی مقام نہیں ملا تھا اس لئے وہ اپنے شافعی ورہ کو عربوں سے پر ز تابہ کر کے اپنے احساس کثرت کو دور کرنا چاہتے تھے۔

ہندوستان کی تاریخ میں ہونے والے واقعات اور تحریکوں کے پیچھے بھی طبقاتی حالات نظر آتے ہیں۔ بھنگی تحریک اس وجہ سے شروع ہوئی کہ ذات پات کی تعلیم نے ہنگی ذاتوں کو آگے بڑھنے اور ترقی کرنے سے روک دیا تھا۔ اس لئے ہنگی ذات کے کچھ ہونے لگوں نے ایک ایسے معاشرے کے قیام کی جدوجہد کی جو ذات پات کی تعلیم سے پاک ہو اور جس میں انسان کا احترام بحیثیت انسان کے ہو۔ چونکہ اس تحریک سے ہنگی ذات کے لوگوں کے حقوق و اہمیت تھے اس لئے وہ ان ہی تک محدود رہی۔ انہوں نے قضیات اور ننگ نظری کے خلاف جدوجہد کی

تاریخی شعور

انسانی معاشرہ کی ساخت بڑی پیچیدہ اور مشکل ہے اس لئے علم کا سب سے بڑا ستارہ انسان اس کے افعال اور اس کی رویت کو سمجھنے کی کوشش ہے۔ تاریخ انسانی عمل اور انسانی معاشرہ کو سمجھنے میں بڑی مددگار ہوئی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ ماضی میں ہونے والا ہر واقعہ اور تحریک کا تجزیہ کیا جاتا ہے اور اس ذریعہ اس تہہ تک پہنچا جاسکتا ہے کہ کسی خاص مرحلہ پر ایک خاص قسم کے افکار و نظریات کیوں متحول ہوتے ہیں اور یہ کہ ان کے پس منظر میں کون سے طبقات اور جماعتوں کے مفادات ہوتے ہیں۔

تاریخ کو اس نقطہ نظر سے پڑھنا ضروری ہے کہ واقعات و افکار کے تجزیہ میں طبقاتی گروہی مفادات کو دیکھا جائے۔ ایک مروجہ جب تاریخی شعور اس قدر بلند ہو جائے کہ وہ دوسرے کے مابین سیاسی اور معاشی عمل میں طبقاتی مفادات کی نشان دہی کر سکے تو پھر نہ صرف ماضی کو بہتر طریقہ سے سمجھا جاسکتا ہے بلکہ حال و مستقبل کے بارے میں بھی فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

ماضی میں جو بھی اہم واقعات ہوئے یا تاریخی عمل کے نتیجہ میں جو بھی ظلمات و افکار پیدا ہوئے ان میں طبقاتی مفادات نے اہم کردار ادا کیا مثلاً جب یونان اور روم میں غلامی کا اعلان منسوخ ہو گیا اور حکمران طبقے ان غلاموں کی وجہ سے محنت و شہقت سے بچ گئے تو ان کے مفاد میں تھا کہ غلامی کے اس ادارے کو پیشہ کے لئے باقی رکھا جائے اور انکی روایات و عقائد کو فروغ دیا جائے جن کے ذریعہ نہ صرف یہ کہ نظام اپنی حیثیت و حالت سے مطمئن رہیں بلکہ معاشرے کے دوسرے لوگ بھی اسے غلامی سمجھیں۔ اس وجہ سے یونانی مفکرین اور فلسفیوں نے غلاموں کو عام انسانوں سے مختلف قرار دیا اور کہا کہ انہیں جو باتیں ہوتی ہیں وہ بھی عام انسانوں سے مختلف ہوتی ہیں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں غلاموں کے لئے ہمدردی کے جذبات پیدا نہ ہوں اور ان کے ساتھ جو غیر انسانی برتاؤ ہوتا ہے اسے وہ غلامی سمجھتے ہوئے جاری نہ رکھیں۔ یہاں وہ طبقاتی تعلیم تھی جس کے تحت معاشرہ میں اس نظریہ کو فروغ دیا گیا کہ ہنگی اور جسمانی محنت دو علیحدہ طبقوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ذاتی محنت کرنے والے اعلیٰ

کیونکہ اس کے خارجہ کے بعد ہی معاشرے میں وہ باعزت مقام حاصل کر سکتے تھے۔

بعدِ مِٹان میں مسلمان خاندانوں کے دورِ حکومت میں عہدِ سلاطین میں صوبائی سرگرمیاں عروج پر تھیں مگر مغلوں کے زمانے میں صوبائی زیادہ سرگرم عمل نہیں رہے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ عہدِ سلاطین میں مسلمان حکومت کو مکمل طور پر استحکام نہیں ملا تھا اور بعدِ مِٹان میں ان کی طاقت کو برسرِ چیلنج کر رہی تھیں، پہلے انہوں نے صوفیاء کی سرپرستی کی جنہوں نے رواداری کی پالیسی پر عمل کر کے معاشرے میں ایک خوش گوار فضا کو پیدا کیا اور بعدِ مِٹان مسلم کھانا کو کم کیا۔ اس پالیسی کی مغلوں کے زمانے میں اس لئے ضرورت نہیں رہی کہ ان کی حکومت مستحکم ہو سکتی تھی اور اسے سیاسی خطرات لاحق نہیں تھے۔

اکبر کے زمانے میں احمد مرہٹوں نے ہندو الف ظلی کی دہلی کے اکثر جی علاقہ نے اس لئے سرپرستی کی کہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ حکومت میں راجپوتوں کو زیادہ حصہ دے دیے جائیں۔ راجپوتوں میں مصنفی انقلاب کے نتیجہ میں مزبور طبقہ بعد میں کیا جس نے اگرچہ مصنفی فرقے میں حصہ لیا مگر اس فرقے نے اس کی اپنی حالت نہیں بدلی اور وہ انتہائی پس ماندگی کی حالت میں رہے۔

اس کے نتیجہ میں سوشلسٹ نظریات پیدا ہوئے تاکہ مزدوروں کو ان کی محنت کا صحیح صلہ ملے اور معاشرے میں انہیں باعزت مقام حاصل ہو۔ سوشلزم کے اس پہنچنے کو محسوس کرتے ہوئے جرمنی کے چانسلر، سارک نے اس بات کا اعلان کیا کہ سرمایہ دار طبقہ کی بناء کے لئے ضروری ہے کہ سوشلزم کا مقابلہ ملٹی اصلاحات کے ذریعہ کرے۔ اس لئے یورپ کی حکومتوں میں مزدوروں کو مراعات دینے کا سلسلہ شروع ہوا تاکہ اس کے ذریعہ سے انقلاب کو روکا جائے۔

اگر ہم برصغیر ہندوستان کی موجودہ تاریخ کو دیکھیں تو یہی گروہی اور طبقاتی مفادات اس کے تاریخی عمل میں نظر آئیں گے۔ سرسید احمد خان نے جب انگریزی حکومت سے منہمکت کی پالیسی کو اختیار کیا تو اس کا قائل مسلمان امراء کے طبقے کو ہوا اور اس ذریعہ سے انہیں حکومت کی ملازمتیں ملنے لگیں۔

اگر تاریخ کا مطالعہ اس نقطہ نظر سے کیا جائے تو تاریخی عمل اور واقعات میں طبقاتی و گروہی مفادات کا سراغ لگایا جائے گا اور یہ معلوم ہو سکے گا کہ کن کن تحریکیں اور نظریات اصل طبقہ کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتی تھیں اور کن افکار و خیالات کی بنیاد عوام و غلبہ پر تھی اور کن کن تحریکیں عوام کے مفادات کو بچانے کے لئے پیدا ہوئی تھیں۔ اس نقطہ نظر سے

معاشرہ کے طبقاتی مفادات کا ایک ایک پولو سامنے آجانا ہے اور اس سے جو تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے اس کی مدد سے مل کے تاریخی عمل اور مستقبل کی رفتار سے آگاہی ہو سکتی ہے۔

تاریخ اور سائنسی و فنی ایجادات

ہمارے اہل تاریخ جس نقطہ نظر سے نگاہیں جاتی ہے اس میں سیاسی واقعات و حادثات کو اہم اور انقلابی سمجھا جاتا ہے۔ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ان واقعات کے نتیجہ میں تاریخ کا رخ بدلتا ہے اور معاشرہ میں بنیادی تبدیلیاں آتیں۔ ان واقعات میں اہم حقائق 'شرعی خاندانوں کی تبدیلیاں' مشہور شخصیتوں کی پیدائش اور موت شامل ہیں۔ مثلاً پانی پت کی قیام جگہوں کا جب بھی تاریخ میں تذکرہ آتا ہے تو یہ بات کہی جاتی ہے کہ ان جگہوں نے ہندوستان کی تاریخ کا رخ بدلا دیا لیکن اگر درا بھی غور سے دیکھا جائے تو ان جگہوں کی وجہ سے مہتمم سیاسی تبدیلیاں ضرور آئیں۔ حکمران بدل گئے اور اقتدار میں نئے لوگ آئے مگر اس دور میں عوام کی اکثریت ان جگہوں سے بے خبر رہی اور انہیں بس کا پتہ بھی نہیں چلا کہ پانی پت کی جنگ میں کیا ہوا اس لئے ان جگہوں نے ہندوستان کے معاشرے 'اس کی ساخت اور بنیاد میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔ لوگوں کا طرز زندگی بالکل نہیں بدلا۔ ان کی رسومات، عقائد اور طوہر طریق اسی طرح قائم رہے۔

اسی طرح ہندوستان کی تاریخ میں حکمران خاندان بدلتے رہے، مصلحتین کے بعد ملے نکلے لیکن ان خاندانوں کی تبدیلی سے معاشرہ بچک رہا بنیادی طور پر ان کی زندگی، ان کے کھانے پینے، پہننے اور ڈھنکے کے طریقوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

طرز زندگی عسکرانوں کی اصلاحات کو بھی تاریخ میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے اور اکثر اس سے یہ تاثر ملتا ہے کہ ان اصلاحات کی وجہ سے معاشرہ کا ڈھانچہ بدل گیا۔ مثلاً علامہ اقبال نے جو سماجی و سماجی اصلاحات کیں انہوں نے واقعی طور پر تو معاشرہ کو متاثر کیا مگر اس کے مرنے کے فوراً بعد ہی اس کی اصلاحات کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ قلم و رنق کی اصلاحات اور تبدیلیاں عارضی اثرات پیدا کر رہی ہیں مگر انہوں نے معاشرے میں گہرائی کے ساتھ کوئی سماجی، معاشی اور فلاحی تبدیلی نہیں کی۔ اس لئے تاریخ میں سیاسی واقعات اور اصلاحات کو اہمیت دینا اور انہیں تاریخ ساز قرار دینا صحیح نہیں۔

تاریخی عمل کو جو چیز متاثر کرتی ہے وہ سائنسی اور فنی ایجادات ہیں جن کی وجہ سے معاشرہ

کی معاشی و سماجی اور فنی زندگی متاثر ہوتی ہے اور جس کے نتیجہ میں معاشرہ مکمل طور پر تبدیل ہوتا ہے۔ اور اس تبدیلی کے ساتھ ہی معاشرہ کے ظہور و افکار، رویات و اقدار، رسوم و رواج اور عقائد بھی بدلتے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں ابتدائی زمانہ میں آباد کاروں کو جب کاشت کے لئے مہذبوں کی ضرورت تھی تو انہوں نے اس ضرورت کو افریقہ سے غلام دور کر کے پورا کیا۔ غلامی کا یہ ادارہ امریکی معاشرہ کا ایک حصہ بن گیا جسے مذہبی و اخلاقی طور پر صحیح ثابت کیا جاتا تھا اور افریقہ کے باشندوں کو غیر مذہب حامل اور وحشی ثابت کر کے اس بات کا جواز تلاش کیا گیا کہ ایسی بحیثیت غلام کے رکھنا بالکل صحیح ہے۔ کیونکہ وہ کسی دوسرے اجرت کام کے اہل ہی نہیں ہیں اور اس قابل نہیں کہ معاشرے میں انہیں سفید آدمی کے برابر سمجھا جائے۔ یہ ضرورت اور خیالات اس وقت بدلنا شروع ہوئے جب ایسی مہذبوں کی ایجاد شروع ہوئی جو ان امریکی غلاموں کی جگہ کاشتکاری کے کام کو کرنے لگیں۔ مہذبوں کے اس استعمال کے بعد اب غلاموں کی ضرورت نہیں رہی اور جاگیردار انہیں اپنی محبت پر بوجھ سمجھنے لگے۔ اس لئے اب یہ نظریہ پیدا ہوا کہ غلامی کا ادارہ فرسودہ اور غیر انسانی ہے اور اسے ختم کرنا چاہئے۔ کیونکہ ایک طرف جنوبی امریکہ کے لئے یہ بوجھ تھے تو دوسری طرف شمال امریکہ کے صنعتی اداروں اور ٹیکسٹائل میں بحیثیت مزدور ان کی ضرورت تھی۔ جب لیکن نے غلامی کے خاتمہ کا اعلان کیا تو یہ مزدور کار غلام ہجرت کر کے مزدگار کی تلاش میں ٹیکسٹائل کا رخ کرنے لگے جس کی وجہ سے شہروں کی آبادی بڑھ گئی اور مزدوروں کی کچی آبادیاں جگہ جگہ آباد ہونے لگیں۔ جن میں وہ مہتمم و غربت میں اتھالی پسماندگی کی زندگی گزارنے لگے۔ مگر اس پورے عمل نے ان غلاموں اور مزدوروں کو دیرپا سماجی شعور دیا اور طبقاتی تضاد کی پوری تصویر ان کے سامنے آئی۔ یہاں تک کہ 1960ء کی دہائی میں شہری حقوق کی جنگ عروج پر پہنچی مگر اس نے امریکی معاشرہ کی ساخت و بنیاد کو بدل دیا۔ اس کے بعد سے یہ گالے ہاتھ بے برابر اپنے حقوق کی جنگ کر رہے ہیں اور معاشرہ میں باعزت مقام حاصل کر رہے ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو اسی قسم کا عمل اس وقت ہمارے معاشرے میں بھی ہو رہا ہے۔ کاشت کاری میں مہذبوں کے استعمال کے بعد مسکن نور ہادی مزدور کار ہو رہے ہیں اور یہ مزدور کار کم کی تلاش میں شہروں کا رخ کر رہے ہیں جس کے نتیجہ میں نہ صرف شہروں کی آبادیاں بڑھ رہی ہیں بلکہ جرائم، بیماریاں اور منشیات کا استعمال بھی بڑھ رہا ہے۔ کچی آبادیوں اور ملے جھپٹوں کی محرومیوں کے ساتھ ساتھ دولت مند طبقے کا طرز زندگی طبقاتی تضادات کو ابھار رہا ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ایک مرحلہ پر ہمارا موجودہ معاشی و سیاسی غلام ان تضادات کو برداشت نہیں کر سکے گا اور جب

یہ غم ہو گا تو اس کے نتیجے میں ایک ایسا نظام آئے گا کہ جو ان تضادات کو ختم کر سکے گا۔
 سائنسی اور فنی ایجادات نے ایک بہت مختصر عرصہ میں معاشرہ کی سہولت اور راحت کو بدل دیا ہے، ذات پات کی تعلیم جو ہمارے معاشرہ میں ہمیشہ سلٹی نظام کا ایک حصہ ہے اور جس کا تعلق مخصوص پیشوں سے ہے اب اس نظام میں بھی سائنسی و فنی ایجادات کے بعد تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ مثلاً معاشرے میں گندگی و غلاظت اٹھانے کا کام بھی کرتے آئے ہیں۔ مثلاً انسانی معاشرے کے لئے ایک اہم ضرورت ہے۔ اس لئے جب ایک طبقہ ہو کہ مقرر ہو، یا یعنی کے لحاظ سے پسماندہ ہو، اسے یہ کام کرنے پر مجبور کر دیا تو اس طبقہ کو بھی معاشرہ نے اس لئے اہمیت دینا ضروری سمجھا، تاکہ وہ اس کام کو چھوڑ کر دوسرا پیشہ اختیار نہ کر سکیں۔ اس لئے ان کے لئے انہم دواؤں سے بہتر کر دیئے اور ایسے تمام مواقع ختم کر دیئے گئے جنہیں استعمال کر کے وہ اپنا سماجی مرتبہ بدل سکیں۔ اس طبقہ کی اس ذلت کو کئی صبح نہیں ہوا اور مساوات کے کسی اصول نے ان کو گندگی و غلاظت سے نہایت نہیں دلائی اور صدیوں سے یہ معاشرہ کی انسانی ذلت سے زندگی گزارتے رہے، مگر سائنسی اور فنی ایجادات نے آخر کار مغرب سے اس طبقہ کا خاتمہ کر دیا اور دوسرے انسانی معاشرہ میں جیسے جیسے فطرت کا استعمال اور سیر و سیرج سسٹم آ رہا ہے اسی طرح یہ پیشہ ختم ہو رہا ہے اور پچھلے کے ہم کا وجود گم ہو چکا ہے۔ شاید صرف کتابوں میں رہ جائے۔ اور یہ فنی ایجادات ہیں جنہوں نے اس طبقہ کو صدیوں کی ذلت سے نہایت دلائی۔ اسی طرح وہ چھپے جنہیں اب تک ذلت سمجھا جاتا ہے جب انہیں چھپیں کرتے گلیں گی تو اسی کے ساتھ ان پیشوں کا وجود ختم ہو جائے گا اور وہ لوگ جو ان سے حلقہ تھے وہ معاشرے میں باحزت مقام حاصل کرنے لگیں گے۔

موجودہ دور میں ملے حسن کی ترقی اور فنی دواؤں کی ایجاد سے بھی انسانی معاشرہ کی سہولت پر بنیادی اثرات ہو رہے ہیں کیونکہ ایک طرف تو ان دواؤں کی وجہ سے بیماریوں کی مدد تمام ہوئی ہے اور انسانی زندگی کی مدت بڑھ گئی ہے تو دوسری طرف آپدلی میں انسانے کو مدد کے کی کوشش بھی کی جا رہی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک وقت دنیا میں پودھوں کی تعداد جو انہوں سے زیادہ ہو جائے گی اور اس کے سماجی و معاشی و سیاسی اور فطرتی اثرات فطرت کے کیونکہ صنعتی ادارے ایسی اشیاء زیادہ بنائیں گے جن کی ضرورت پودھوں کو ہو گی اور ایسا ادب زیادہ آئے گا جو ان کے رجحانات کے مطابق ہو گا اور یقیناً اس سے معاشرہ کی سہولت پر دور رس اثرات ہوں گے۔

یہ سائنسی و فنی ایجادات جو تبدیلیاں لا رہی ہیں۔ بنیادی اور گہری تبدیلیاں ہیں جن کے

ثبات ہمہ دہ پا ہوتے ہیں۔ اس لئے تاریخ کے ادیب ہر عمل کو سمجھ کر ہم صحیح تاریخی شعور حاصل کر سکتے ہیں۔

تاریخ کی تقسیم

زمان کی سرگرمیوں کو اگر وقت کے اندر سمیٹا لیا جائے تو یہ تاریخ ہے۔ انسان وقت کے دائرہ میں جو عمل کرتا ہے۔ اور یہ تاریخی عمل ایک طویل سلسلہ ہے وقت کے دائرہ میں ہونے والے واقعات زنجیر کی کڑیوں کی مانند ہیں جو برسرِ طویل ہو رہی ہیں۔ لیکن یہ تاریخی عمل اور واقعات کا یہ سلسلہ اس میں یکسانیت نہیں بلکہ اس میں سچ و غم بھی ہیں اور غیب و فراہ بھی۔ تبدیلی جو اس سلسلہ کا ایک اہم عنصر ہے وہ ایک عہد کو دوسرے عہد سے اور ایک زمانہ کو دوسرے زمانہ سے جدا کر دیتی ہے۔ ایک عہد کی صورت کے مطابق آدمی اپنے اہدائے زیادہ اپنے وقت سے مشابہت رکھتا ہے۔ اس لئے تاریخ کے اس عمل میں اس مرحلہ کی نشاندہی کی جائے جہاں سے تبدیلی کا آغاز ہوا تھا یا جہاں سے ایک عہد کی مدح پیدا ہوئی تھی اور اس کے نتیجہ میں سیاسی و معاشی اور ذہنی و فکری تبدیلیاں آتی تھیں۔

تاریخ کو سمجھنے کے اس عمل میں مورخین نے تاریخ کو مختلف نقطہ نظر سے لوہار میں تقسیم کیا ہے۔ تاریخ کی اس تقسیم سے مخصوص شکلیات کی عکاسی ہوتی ہے۔ مثلاً تاریخ کی ایک تقسیم اس طرح سے کی گئی کہ اسے قدیم کے اظہار سے عکس لوہار میں بانٹا گیا جیسے 'محل مسک' اور بعد مسک' یا مسلمانوں نے دور جاہلیت اور ظهور اسلام کی اصطلاحوں کے ذریعہ تاریخ کو وسیع تناظر میں تقسیم کیا۔

دوسری اظہار سے مسلمانوں نے کہا کہ اسلام سے قبل کا زمانہ جاہلیت اور تاریکی کا زمانہ تھا اور وہ اسلام کی آمد کو تاریخ عالم میں ایک ایسا مرحلہ اور نکتہ سمجھتے ہیں کہ جس کے ذریعہ تاریکی اور روشنی میں فرق کیا جاسکتا ہے۔

اسلامی تاریخ کو مسلمان مورخین نے اس کے بعد اس طرح سے تقسیم کیا۔ رسول اللہ کے عہد کو ہجرت کے ذریعہ بیان کیا۔ اور آپ کے بعد کا عہد خلفائے راشدین کا ہوا۔ اس کے بعد سے تاریخ کا عمل سیاسی خاندانوں کی تبدیلی کے ذریعہ بیان کیا گیا۔ امیر، عباسیہ، فاطمی، حسنئی، غزنوی، خلجی، غوری اور سلجوقی۔ ایک کے بعد ایک خاندان آتا ہے اور تاریخی

سلسلہ برقرار رہتا ہے۔ مورخ کی مادی توجہ ان خاندانوں کے اقتدار میں آئے اور ان کے زوال پر مرکوز رہتی ہے۔ اسی نمونہ پر بعدوستان 'مصر' ایران اور ترکی کی تاریخ بیان کی جاتی ہے۔ ان حکمران خاندانوں کی تاریخ کو انفرادی حکمرانوں کے دور حکومت میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ ان کی تخت نشینی سے شروع ہو کر ان کی موت تک رہتا ہے۔

تاریخ کو تقسیم کرنے کا دوسرا روالہ یہ ہے کہ قوموں اور تہذیبوں کا جامع طور پر مطالعہ کیا جائے اور ان کے ارتقاء کو بیان کرتے ہوئے ان کے مروج و روال کی نشاندہی کی جائے۔ قدیم تہذیبوں کا مطالعہ مروج و زوال کے خاکہ میں اس لئے بھی کیا گیا کہ اس دور کے حکمران خاندانوں یا انفرادی حکمرانوں کے بارے میں معلومات جنس جنس 'اس لئے سیاسی تاریخ کے مواد کے نہ ہونے کی وجہ سے ان قدیم تہذیبوں کے ثقافتی و سماجی پسوؤں پر زیادہ زور دیا گیا۔ ایک زمانہ میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ تہذیبیں تاریخ ساز ہوتی ہیں اور ان کے عمل سے ایک پورا عہد حاشہ ہوتا ہے۔ اس لئے اکثر مورخوں نے ان تہذیبوں کو مرکز بنا کر پورے عہد کو بیان کیا ہے۔ جیسے اشوک اور اکبر وغیرہ۔

تاریخ میں جب ترقی کا نظریہ آیا تو اس میں یہ فرض کیا گیا کہ انسان مسلسل آگے کی جانب بڑھ رہا ہے اور اس کی اس ترقی میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے بلکہ یہ ترقی واضح اور بغیر کسی مشکل کے ہے۔ لہذا اس سے ذہن میں یہ بات آئی کہ قدیم دور میں انسان غیر مذہب تھا۔ عہد و سطحی میں وہ جاہلیت و تاریکی میں تھا اور جدید دور میں آکر وہ ترقی یافتہ اور مذہب ہوا ہے۔ لہذا اس تصور نے قدیم 'قولن و سطحی اور جدید کی اصطلاحات کو تاریخ کے اس مخصوص نظریہ کا تابع کر دیا۔ اگرچہ بعد میں اس نظریہ کو روحانی تحریک نے رد کرنے کی کوشش کی جسوں نے ماضی کو خوبصورت و دلکش ثابت کیا اور اپنے ساتھ دور کو شہابِ فانی کے لئے ملک قرار دیا۔

تاریخ کو فکری اظہار سے بھی تقسیم کیا گیا۔ جیسے روشن خیالی کا عہد اور عظمت کا عہد یا ان اہم تحریکوں کو مرکز بنا کر انکے اثرات کو ایک پورے عہد پر محیط کیا۔ جیسے 'نفاذِ حاکم' تحریک اصلاح مذہب، فرانسیسی انقلاب، قوم پرستی کی تحریکیں اور منطقی عہد وغیرہ۔

انقلابی دانشوروں نے تاریخ کے عمل میں ارنالٹ پیداوار کے ذریعہ تبدیلی کی نشاندہی کی اور اس لحاظ سے انہوں نے دور غلامی، دور جاگیرداری، اور سرمایہ داری کے ذریعہ انسانی تاریخ میں تبدیلی کو ظاہر کیا۔ اس چیز کو ذہن میں رکھتے ہوئے بعدوستان کے مورخ کو سمجھی گئی کہ تاریخی تاریخ کو جب تقسیم کیا جائے تو اس چیز کو ذہن میں رکھا جائے کہ کس مرحلہ پر معاشرہ میں بنیادی تبدیلی آئی اور معاشرہ کا پورا سیاسی سماجی اور معاشی ڈھانچہ بدل گیا۔ یہ صرف اسی صورت میں

ہو سکتا ہے جب کہ تاریخ میں ان مرحلوں کی نشاندہی کی جائے یہاں ذرائع پیداوار اور پیداواری تعلقات میں تبدیلی آتی کیوں؟ اس کے متنبہی میں معاشرہ کا عملی نظام دلتا ہے۔ اس لئے تاریخ کو سیاسی، فکری اور معاشی سطح پر تقسیم کر سکتے ہیں۔ تاریخ کے عمل کو ہمیں سمجھنا چاہئے کہ یہ تبدیلیاں بعد میں آتی ہیں۔

اس وقت خصوصیت سے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اس اپنے شعبہ کی تاریخ لکھیں تو اس میں 'اداری' تقسیم کا عمل طور پر بدلتی ہیں کہ ہماری جدید تاریخ پر وہ آبادی دور کے اثرات بڑے گہرے ہیں۔ تاریخ کو مذہبی اعتبار سے تقسیم کیا گیا ہے۔ اور برطانوی عہد کو اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اس میں ہندوستان سے نواداری دور کا عمل کا ذکر نہیں۔ اس لئے عملی طور پر اس میں اپنی تاریخ کی بے سرے سے تشکیل کی ضرورت ہے اور اسے اس طرح سے تقسیم کیا ہے کہ اس سے فرقہ واریت اور رنگ نظری کے احساسات ختم ہوں اور تاریخ کا ایک وسیع نقطہ نظر ہو اور تاریکے سے نکلے۔

تاریخ اور اقلیت

اقلیت چاہے وہ مذہبی ہو، نسلی، یا لسانی، وہ اکثریتی معاشرہ میں خود کو پوری طرح سے نہ اظہار کر سکتی ہے اور نہ اپنی صلاحیتوں کو اظہار کر سکتی ہے اس لئے اقلیت اپنے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے 'ملاحضات'، 'اشادہ' اور کنجیوں کا سارا بیج ہے، اور اکثریت کو اکثریت کا ایک حصہ ظاہر کرنا ہے، لیکن غلط طور پر اپنے مذہبی عقائد یا اپنی نسلی خصوصیات کو برقرار رکھتی ہے۔ مثلاً شیعہ فقیر کے ذریعہ اپنی اقلیتی شخصیت کو چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسری صورت میں اگر اقلیت کسی قدر اس قدر ہوتی ہے کہ وہ خود کو خود کو محفوظ رکھ سکتی ہے تو وہ خود کو چھپاتی نہیں ہے، مگر اکثریت سے متبرک رہتے ہوئے اپنی دولت و لوازم کو قائم کر سکتی ہے کیونکہ کثرت کے لئے سب سے بڑا خلیج جاکا ہوتا ہے، اور اسے یہ خطوط دیتا ہے کہ اس کے اراکین کس ذاتی ملاو کی خاطر اس کو چھوڑ کر اکثریت میں ضم نہ ہو جائیں۔ اس لئے ان میں تعاون، ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ، اور برادری کے ساتھ رہنے کی پابندیاں ہوتی ہیں۔

کیونکہ اقلیت کے پاس سیاسی اقتدار نہیں ہوتا ہے اس لئے ان کی کوئی تاریخ بھی نہیں ہوتی ہے۔ تاریخ میں کسی کو اس وقت دلچسپی پیدا ہوتی ہے جب کہ وہ تاریخی عمل میں حصہ لیتا ہو، اور اسے اس بات کا احساس ہو کہ تاریخ کی تشکیل میں وہ بھی براہ کام کر رہا ہے اور اس کا بھی تاریخ میں کوئی مقام ہے۔ کثرت جب ایک مرحلہ اکثریت سے الگ تھلک ہو جاتی ہے تو وہ تاریخ کے عمل سے بھی دور ہو جاتی ہے۔ اسے بھی اپنی مظلومیت کا احساس ہوتا ہے، اور معاشرے کی دولت، 'اقدار' اور لوازم میں اسے اپنا حصہ نظر نہیں آتی، اور وہ بھی اکثریتی معاشرہ انہیں اپنے ساتھ لانے کی کوشش کرتا ہے، اس وجہ سے اس کا ہر ذہن بنا ہے، وہ یہ کہ 'تاریخی عمل' ان کے خلاف ہے، اور اس تاریخی عمل میں وہ اپنی خواہشات، ہدایت اور تمناؤں کو پورا نہیں کر سکتے ہیں، یہ احساسات اس میں تاریخ کے خلاف فطرت پیدا کر دیتے ہیں کیونکہ یہ تاریخ انہیں معاشرے میں ان کا جائز مقام نہیں دیتی۔ اور وہ اکثریتی معاشرہ میں محروم اور ٹھکرائے ہوئے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک ایسے معاشی کی طوائف جو انہیں دھم دھم دیتے ہیں اور حوصلہ دیتی ہے، وہ طوائف جب پوری نہیں ہوتی تو وہ تاریخ سے بہ گنہ ہو جاتے ہیں اور

اکثریتی تاریخ سے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ وہ اس اعتبار میں رہتے ہیں کہ کب تاریخ کا دھارا بدلے گا اور کب ہمیں معاشرہ میں ان کا جائز مقام ملے گا۔

اس کا دوسرا اثر یہ ہوتا ہے کہ اقلیت کی تاریخ محدود ہو کر صرف ان شکایات تک رہ جاتی ہے جو مستقل کے بارے میں ہوتی ہیں۔ اس لئے ان کے ہاں ماضی کو پھر و کر مٹھنے کے ذخائر ہونے کی پیشین گوئیاں ہوتی ہیں اور اس کے سارے وہ ذمہ دہنے کا حوصلہ پیدا کرتے ہیں۔

اکثریتی تاریخ سے لاطینی کے اور کسی نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ مثلاً اگر کسی مذہب یا نسل کے لوگ ایک ملک میں بحیثیت اقلیت کے ہیں تو کسی دوسرے ملک میں وہ اکثریت میں ہوں گے۔ جیسے شیعہ اکثریتوں میں اقلیت میں ہیں مگر ایران میں ان کی حکومت ہے۔ ایسی صورت میں یہ اقلیتیں اپنی وفاداری کا مرکز ان ملکوں کو بناتے ہیں جہاں ان کے ہم مذہب یا نسل کے لوگ حکومت کرتے ہیں اور ان میں ان ملکوں کی تاریخ میں دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے اور وہ خود کو اس کا ایک حصہ سمجھتے ہیں۔ ہندوستان میں بعد اکثریت کے درمیان مسلمان اقلیت بھی اسی کا فکار ہے۔

انہوں نے صدی اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس زمانہ میں دنیا کے مختلف حصوں میں قومیت کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ ان تحریکوں نے انگلیوں کو بھی حنا لگایا اور ان میں بھی وقت کے ساتھ ساتھ سیاسی شعور پیدا ہوا اور انہوں نے بھی اپنی شناخت اور حقوق کے لئے تحریکیں شروع کیں۔ اس مرحلہ پر انہیں احساس ہوا کہ بغیر تاریخ کے اور ماضی میں جانے بغیر اور اپنی تاریخ کی تکلیف کے بغیر وہ ذات اپنی شناخت کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے حقوق کے لئے جنگ کر سکتے ہیں اس لئے اس ضرورت کے تحت لائق اقلیتوں نے اپنی تاریخ کی تلاش شروع کی۔

اقلیت کی تاریخ نویسی کا ایک اہم رجحان یہ رہا کہ انہوں نے اپنی تاریخ کو "مہینہ نور خداداد" کے آئینہ میں لکھا ہے۔ کیونکہ اقلیت کا سب سے بڑا اور یہ ہوتا ہے کہ کسی وہ اکثریت کے دھوکے تحت کھسکے کھسکے ہو کر ختم نہیں ہو جائے۔ اور اس میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہو جائیں جو اس کو اندر سے ختم کر دیں۔ اس لئے انہوں نے تاریخ میں ان شخصیتوں کو ابھارا اور ان کے بھارتیہ بیان کئے جنہوں نے اپنی برادری کی خاطر جان دی یا قربانی دی۔ ایسی شخصیتیں اقلیت کے لئے اتحاد، ایمان اور مقصد کی علامت بن گئیں اور ان کی کوشش ہوئی کہ ایسے ہیروؤں کی تعداد زیادہ سے زیادہ دریافت کی جائے تاکہ ان کی زندگی اور ان کے کارنامے لوگوں کو حوصلہ دیں اور لوگ مقصد کی خاطر قربانی کے لئے تیار رہیں اور ان میں جوش، دلولہ اور

جذبہ پیدا ہو۔

اس کے برعکس ایسے لوگ جنہوں نے ذاتی مفاد اور خود غرضی کے تحت اپنی برادری سے غداری کی ان کے کردار اور ان کی برائیوں کو خوب ابھارا گیا اور ان کا ذکر خداداد سے کیا گیا تاکہ دوسرے اس سے عبرت حاصل کریں اور اپنی وفاداری کو کمزور نہ کریں۔

موجودہ زمانہ میں جمہوریت اور نیکو روایت نے اقلیتوں میں نہ صرف شعور پیدا کیا ہے بلکہ انہیں بھی ان کو تاریخی عمل میں شریک کرنا چاہتی ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال یہ ہے کہ سب تاریخ نگاران خانہ نواں یا ایک مذہب کے لئے دلوں کی صفیں نکھیں جاتی ہیں بلکہ تاریخ اب کسی ملک کی لکھی جاتی ہے اور جب تاریخ کسی ملک کی لکھی جائے گی تو اس میں اس ملک کے رہنے والے سب لوگ یا تفریق مذہب، نسل اور ثقافت کے "عناصر" کے جیسے مصری تاریخ میں مسلمان، قبیل اور یہودی سب شامل ہیں اور اس ماضی میں سب کو برابر کا شریک کیا جاتا ہے اور یہ تاریخ صرف قدیم ماضی کو ابھارتی ہے بلکہ جدید دور میں بھی سب کو ساتھ ملاتی ہے۔ تاریخ کے اس نیکو نظریہ نے اقلیتوں کو باعمل بنا دیا اور انہوں نے جوش کے اور دلچسپی کے ساتھ اپنے اپنے ملکوں کی تاریخیں لکھیں جیسے ایران، شام اور مصر کے عیسائیوں نے۔ اس نقطہ نظر سے تاریخ نگاری اور اقلیت کے اتحاد میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے اور معاشرہ کے لوگوں میں قومی یک جہتی و یکائیت کو پیدا کرتی ہے اور یہ وہ عمل ہے کہ جس کے بعد اقلیت معاشرہ میں ایک تھلک نہیں رہے گی بلکہ تاریخ کی تکلیف میں اکثریت کے ساتھ مل کر کام کرے گی۔

تاریخ کی وسعت

مسلمان تاریخ کو دو ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ ایک دور جاہلیت اور دوسرا اسلام کے بعد کا زمانہ۔ دور جاہلیت سے عام طور سے یہ مراد لی جاتی ہے کہ یہ تاریخ کا وہ دور تھا کہ جس میں نہ تہذیب و تمدن تھا نہ اخلاق و طرز معاشرت کا ارتقاء ہوا تھا۔ نہ رسم و رواج میں شان و شوکت تھی اور نہ ہی علم و ادب و فن میں کوئی ترقی ہوئی تھی۔ یہ زمانہ گمراہی اور وحشت و پستی کا زمانہ دور جاہلیت کے ان معنوں سے اس تمام ہی حقیقت کی نفی ہوتی ہے کہ جس کی روشنی میں قدیم تہذیبوں کے آثار و آثار کی دریافت کے بعد یہ حقیقت سامنے آئی کہ قدیم عہد میں دنیا کے ہر حصے میں مذہب و تمدن اقوام آباد تھیں اور انھوں نے اپنے حقیقی کارناموں سے انسان کی ترقی میں حصہ لیا۔ اس لئے اگر دور جاہلیت کے یہ معنی لئے جائیں کہ وہ زمانہ کہ جس پر بنو اقصیت و گمراہی کا پردہ چڑھا ہوا تھا اور جس کی مطلوبہ ہماری دسترس سے دور تھیں تو اس صورت میں تاریخ کا مفہوم واضح اور سلف ہو سکے گا۔

دور جاہلیت کے تصور نے مسلمان معاشرے کے تاریخی شعور کو بڑا نقصان پہنچایا۔ کیونکہ اگر اس تصور کو صحیح تسلیم کر لیا جائے کہ اسلام سے پہلے دنیا نے کوئی ترقی نہیں کی تھی۔ تو پھر ایک ایسے عہد کے مطالعہ کا کیا فائدہ رہے گا جس میں اندھیرے اور تاریکی کے علاوہ کچھ بھی نہیں اور جس عہد کی روحانیت و اقدار گمراہی کی وجہ سے انسانی ترقی و تلاح کے لئے قطعی منہر نہیں اور جس کے تمام علمی و ادبی کارنامے کافروں و مشرکوں کے دہن کی پیداوار ہیں۔ اس لئے قدیم اقوام اور قدیم تہذیبوں کے بارے میں حقیقی و جہش کا جذبہ قائم ہو جانا ہے اور ماضی کے لئے عقارت کا جذبہ پیدا ہوتا ہے کہ جو ہماری زندگی اور اپنی ترقی میں ہمارے لئے کسی بھی طرح معاون نہیں ہو سکتی ہے۔

پھر مسلمانوں نے جن جن ملکوں کو فتح کیا وہاں بھی انھوں نے تاریخ کو اسی شکل و صورت سے دیکھا جس میں تقسیم کر دیے۔ قتل و اسلام اور بعد از اسلام اور یہاں بھی اس مفروضہ کو فروغ دیا کہ اسلام سے قبل کی تاریخ لائینی اور فضول ہے۔ مسلمانوں کے لئے تاریخ اس وقت اور اس مرحلہ سے شروع ہوتی ہے جب کہ اسلام نے ان ملکوں کو فتح کیا اور ان کے قدیم نظام کو بدل کر

جدید نظام بنایا۔ اسلامی عہد کے بعد ہی سے لوگ گمراہی سے نکلے اور صراطِ مستقیم پر آئے۔ اس لئے اسلام سے قبل کی تاریخ دور جاہلیت ٹھہری جس کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے بیکار ہے۔ اس ذہن کا تسلسل آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے اور اسی کے زیر اثر یہ بات کہی جاتی ہے کہ پاکستان کی اصل تاریخ محمد بن قاسم کی فتح کے بعد سے شروع ہوتی ہے۔ اس سے پہلے اس خطہ میں جو کچھ ہوا وہ ہمارا تاریخی سرمایہ نہیں اس لئے ہم اس کے ورثہ نہیں بلکہ قدیم ماضی کی تاریخ سے لگاؤ اسلامی امن کو تھک کر دے گا۔ در اسلامی شخص کی پاکیزگی اس سے اثر انداز ہوگی۔

تاریخ کے اس نظریہ کو تسلیم کرنے کے بعد مسلمان معاشرے کی لئے یونان، چین، ہندوستان اور روم کے علوم و فنون اور اٹکا، لایا اور ایک تک تہذیبوں کے کاروبارے لائینی ہو جاتے ہیں۔ ان کی حکمت کو اس لئے تسلیم نہیں کیا جاسکتا کہ یہ گمراہ اقوام کے کارنامے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ان ملکوں اور اقوام کی تاریخ کہ جہاں اسلام نہیں پہنچا وہ بھی ہمارے لئے قابل قبول نہیں رہتی۔ اس دمرے میں یورپ، افریقہ، امریکہ اور مشرقِ بعید کے ملک آجاتے ہیں۔

کچھ مسلمان مورخوں نے اس دشواری سے نکلنے کی کوشش ضرور کی مگر ان کی یہ کوشش بحیثیت مجموعی مسلمان معاشرے کے ذہن کو بدل نہیں سکی۔ مثلاً سحرلہ تحریک کے زیر اثر جو مسئلہ رفاہات پیدا ہوئے اس کا اطلاق تاریخ پر بھی کیا گیا جس میں المسودہ قتل ذکر ہے مگر یہ تحریک جلد ہی انگریزوں کی عقل دشمنی کی نظر ہو گئی۔

اس لئے اکثر مسلمان مورخ اس شدید کسل کشی میں رہے کہ اسلام سے پہلے کے شاندار زمانہ کو کس طرح سے بیان کیا جائے؟ لیکن مسکوہ نے اس کا یہ حل نکالا کہ چونکہ قدیموں کی تاریخ ذہنی قسم سے باثر ہے لہذا صرف اس تاریخ کو بیان کرنا چاہئے جو انسانی تجربات پر مبنی ہو۔ اس صورت میں اس پر تنقید ہو سکتی ہے اور اس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔ اس نظریے کے تحت اس نے "تہارب الامم" لکھی۔ انھوں نے بھی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہوئے باجدا مسیحیت یا روحانی تاریخ کو طبعہ کر دیا اور انسانی تجربات کی روشنی میں تاریخ کے عمل کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس لئے یہ کہا کہ معاشرے و جمعیوں کے بلبل بھی ترقی کر سکتے ہیں اور اعلیٰ تمدن پیدا کر سکتے ہیں۔

لیکن یہ تحریروں مسلمان معاشرے کے اس ذہن کو تبدیل نہیں کر سکیں جو اسلام سے پہلے کے زمانہ کو دور جاہلیت قرار دیتے ہیں۔ تاریخ کے اس نظریہ نے مسلمان معاشرے کے تاریخی

شعور کو سمیٹ کر ایک ٹک ٹوک میں بند کر دیا۔ اور ان میں وہ وسعت نہیں رہی کہ وہ قدیم اقوام کے کارناموں اور قدیم تہذیبوں و تمدنوں کے ارتقا اور فساد کو سمجھ سکیں اور تاریخ کے اس مہل سے واقف ہو سکیں کہ یہ ایک ہتے ہتے دنیا کی مانند ہے کہ جس کو بچ میں تقسیم کر کے اگر اس کے ہمارے کو روک دیا گیا تو وہ سراسر حسد و عجز ہو جائے گا۔

موجودہ دور میں ماضی پر جو تحقیق ہوئی ہے اس نے قدیم ماضی کو بچی حد تک نکھیل کر دیا ہے۔ کیرنی، مصری، ہندوستان، ان کا، ایڈنک، چینی، یونانی اور رومی تہذیبوں کے علمی و ادبی اور سائنسی و فنی کارنامے، قدیم آثاروں کی دریافت اور نئے نئے مسودوں کی اشاعت کے بعد منظر عام پر آچکے ہیں اور یہ شواہد قدیم تہذیبوں کی عظمت، کھربائی اور باندی کا ثبوت ہیں۔ اس نئے تاریخ کی آگئی اس وقت ہی بنتے ہو سکتی ہے جب کہ ان کا مطالعہ کیا جائے اور ان کے درجہ انسانی تہذیب و تمدن، ثقافت اور انسانی ذہن کے ارتقا کو سمجھا جائے۔

اس نئے ہر مورخ پاکستان کی تاریخ کو محمد بن قاسم سے شروع کرنا چاہتے ہیں اور قدیم تاریخ کو بیکار اور حاصل سمجھ کر اس کے مطالعہ و تحقیق سے روکنا چاہتے ہیں وہ معاشرے کے تاریخی شعور کو بیکار اور کم تر رکھنا چاہتے ہیں کیونکہ اس خطی تاریخ بزار بارہوی سے بعد میں آجکل مٹی اور جب تک ہم اس تہذیب کی جڑوں تک نہیں پہنچیں گے اس تہذیب کے ارتقا کے مرحلوں کو دریافت نہیں کریں گے۔ اس کے پس منظر میں باطل ذہن کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک ہم اپنی شخصیت کو کھس نہیں کر پائیں گے اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ نکلے ہوئے آثار قدیمہ کی دریافت کی جائے اور اس پوشیدہ عظمت کو کھائی سے باہر لایا جائے جو زمیں میں مدفون ہے۔ قدیم ماضی سے ملے کر وہ ہدیہ تک انسانی تہذیب کے اس سر کی کہانی جب تک تکمیل نہیں ہوگی اس وقت تک ہم اپنے ذہن کو پوری طرح سے سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔ اسلام کی فتح بھی اس تاریخی مہل کا ایک حصہ ہے اور اس علاقہ کی تاریخ کے تسلسل کی ایک کڑی ہے۔ اس حیثیت سے اسلام کی اس علاقہ میں نہ ایک اہم تاریخی واقعہ ہے اس کی یہ اہمیت بھی اس وقت جاگ رہی ہے جب ہم اس کے پس منظر سے بخوبی واقف ہوں گے۔

تاریخ میں قوموں کا تصادم

دنیا کی تاریخ میں مادی وسائل کے حصول کے لئے قوموں میں ہمیشہ سے کش مکش اور تصادم رہا ہے۔ یہ جنگیں نہ صرف میدانوں اور وادیوں میں ہوئیں اور ہتھیاروں سے مسلح ہو کر لڑیں بلکہ یہ جنگیں ذہنی طور پر خیالات و نظریات کے درجہ بھی لڑی گئیں۔ پانچویں ہزار سال قبل قریب اس بات کی کوشش کی کہ وہ خود کو ذہنی و فنی اور جسمانی طور پر منتخب قوم سے جدا ثابت کرے۔ یہ فرق اس لئے رکھا جاتا تھا تاکہ قریب قوم خود کو دوسروں سے زیادہ مذہب اور معتقد سمجھے اور اس طرح انسانیت کے درجہ پر خود کو افضل و برتر جانے لگے۔ اس تصور کے ساتھ اس کے مقابلہ میں دوسری اقوام غیر مذہب، وحشی، جاہل اور غیر معتقد ہو جاتی ہیں۔ جب ایک مرتبہ کسی دوسری قوم کو برابر کا انسانی درجہ نہیں دیا گیا اور اسے مذہب نہیں سمجھا گیا تو پھر اس کے ساتھ منطقی طور پر تمام غیر انسانی سلوک جائز ہو جاتا ہے۔ انہیں جانوروں سے تشبیہ دے کر، زمین قتل کرنے اور ان کے مال و اسباب و جائیدادوں کو لوٹنے اور انہیں جادو و جادو کرنے میں انسانی جذبات آئے نہیں آتے کیونکہ انہیں انسان ہی نہیں سمجھا جائے گا تو انسانی جذبات کیوں آئے انہیں گے۔

انسانی تاریخ میں قوموں کے درمیان سب سے بڑا تصادم سفید اور کالی اقوام کے درمیان نظر آتا ہے۔ آپ دیکھیں کہ فرق کی وجہ سے اور خطرناکی علاقوں کی وجہ سے رنگ کے اس فرق نے دنیا کی تاریخ میں بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ چونکہ سردیوں کے رہنے والوں کو بیشہ سے مادی وسائل کی کمی کا سامنا رہا ہے اس لئے ان لوگوں کی سفید قوم نے گرم اور کالے رنگ کی قوم کے درجہ میدانوں اور وادیوں پر حملے کئے اور ان کے مادی وسائل پر قابض ہونے کے لئے قتل و غارتگری اور خون ریزی کو اختیار کیا۔ سفید اور کالی اقوام کے درمیان یہ تصادم بڑا زبردست اور تباہی سے بھرپور رہا اور ان جنگوں نے دونوں کے درمیان نفرت و عداوت کے ایسے جذبات کو پیدا کیا کہ جو وقت کے ہاتھوں بھی نہ ختم ہو سکے۔ ان جنگوں میں رخ و شکست کے بارے میں تو نہیں کہا جاسکتا کہ میدان جنگ میں کون کامیاب رہا اور کس نے آخری فتح حاصل کی لیکن نظریات کی جنگ جو اس تصادم کے نتیجہ میں شروع ہوئی اس میں

سفید اقوام نے کالی اقوام کو پرائیڈ کے ذریعہ صدمہ پہنچا کر دو۔ سفید اقوام نے خود کو برتر سمجھتے ہوئے کالے رنگ کو برائی اور شرکی ایک علامت بنا دیا اور اس کے بعد سے ہر کالی چیز منحوس ہو گئی۔ چاہے وہ کالی یا ہو۔ یا کالی زبان یا کالی دھندرا یہاں تک کہ کالی رات بھی غم و غم کی علامت بن گئی کہ جس کے بعد امید کے طور پر سفیدہ محری ضرور خوشیوں کا پیغام لائے گی۔ دنیا کی تقریباً ہر زبان میں کالے کا لفظ برائی کے معنیوں میں استعمال ہوتا ہے اور آج بھی ہمارے ہاں کالی لکڑی کو بری خوارت اور اوست کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے اس کے مقابلہ میں کالی اقوام کی طرف سے سفید اقوام کے لئے مجھے وہ صدمہ ملے اور وہ دونوں اس قدر ہر سنی اور جامع ہیں کہ ان کے خلاف سفید اقوام کے پرائیڈ سے کا بھرپور جواب ہیں اور ان دونوں ممالکوں سے سفید لوگوں کی ذاتیت جو صورت انداز میں واضح ہو کر سامنے آئی ہے۔ یعنی سفید بھوت اور خون کا سفید ہو جانا۔

ہندوستان میں یہ جنگ آریہ اور دراوڑوں کے درمیان ہوئی اور بھرپور ہر دور میں کسی نہ کسی شکل میں جاری رہی۔ وسط ایشیاء، ایران و افغانستان سے جو حملہ آور آئے انہیں بھی اپنے سفید رنگ پر بڑا فخر تھا اور وہ بھی اپنی نئی اور سیاسی برتری کی خاطر کالیوں سے نفرت کرتے تھے یہاں تک کہ جب انگریز ہندوستان میں آئے تو انہوں نے بھی رنگ کی اس برتری کے خیال سے قائمہ افغان اور ان کی نظموں میں کالا ہندوستان غیر مذہب تھا اور ذہنی طور پر کمتر ہو گیا۔ وہ ہندوستانیوں کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ وہ کوئی تہذیب و تمدن کو پیدا کر سکیں۔ اس لئے ایک عام انگریز کی نظر میں تاریخی حیثیت سے ہندوستان کے آثار قدیمہ میں کوئی دلکشی اور عظمت نہیں تھی۔ اس برتری کے جذبہ نے انہیں یہ حوصلہ دیا کہ وہ اوست اور برات دی کہ انہوں نے اقلیت میں رہتے ہوئے بھی ہندوستان میں حکومت کی۔ کالے اور گورے رنگ کا یہ فرق آج بھی ہندوستانی معاشرہ کا ایک حصہ ہے اور ذہنی طور پر آج بھی اس سے چمٹکارا نہیں ہوتا جا سکتا ہے۔

رنگ کے بعد قوموں کے درمیان مذہب کی بنیاد پر فرق کو دیا رکھا گیا چنانچہ ہر مذہب میں مومن اور کافر کے درمیان ایک وسیع خلیج موجود ہے اور ہر مذہب میں نفس کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنے مذہب کی تبلیغ پھیلائے اور انتقام کی خاطر کافروں سے جنگ کرے۔ ایسی جنگوں میں کافروں کا قتل اور ان کی جائیدادوں پر قبضہ جائز ہوتا ہے۔ ذہنی اعتبار سے ہر مذہب والا خود کو کافروں کے مقابلہ میں برتر سمجھتا ہے اور اس کا یہ ایمان ہوتا ہے کہ خدا اس کے ساتھ ہے اور جب وہ کافروں کو جادو جبروت کرے تو وہ اصل ان کے لئے یہ قرآنی ہوتا ہے۔ اس ضمن میں

مجھے اقوام خود کو خدا کی پسندیدہ مخلوق سمجھتی ہیں جیسے کہ یہودی اس لئے وہ کسی دوسری قوم یا مذہب کے لوگوں کو اپنے میں شامل بھی نہیں کرتیں کہ پسندیدہ مخلوق کی تعداد میں کسی اضافہ نہیں ہو جائے اور کسی ایسا نہیں ہو جائے کہ ان کے احوال کے لئے کوئی باقی ہی نہ رہے۔ قوموں کے درمیان استحصال کی ایک اور شکل یہ ہوتی ہے کہ انہیں مذہب اور غیر مذہب کے درمیان میں تقسیم کر دیا جائے مذہب کھلانے والی اقوام یہ سمجھتی ہیں کہ خدا کی برتری کی وجہ سے ان کا حق ہے کہ وہ غیر مذہب اقوام کے مادی وسائل پر قبضہ کر کے انہیں استعمال کریں گے کہ انہیں اپنے مادی وسائل کی اہمیت سے واقفیت نہیں اور اس طرح سے فطرت کے یہ قہرے جاہلوں کے ہاتھوں میں بہ کار پڑے ہیں۔ جب وہ انہیں استعمال کرتے ہیں تو ان کا یہ عمل انہیں کے لئے ہوتا ہے۔

اسی نظریہ کے تحت جب یورپی مذہب اقوام نے امریکہ کے براعظم پر قبضہ کیا تو وہاں کے مقامی باشندوں کو غیر مذہب کہہ کر ان کا قتل عام کیا اور ان کی زمینوں پر زمینیں قبضہ کر کے انہیں بے دخل کر دیا۔ یورپی اقوام اور امریکہ کے مقامی باشندوں کے درمیان جو تصادم ہوا اس کو اگر تہذیب و تمدن کے معیار سے دیکھا جائے تو مقامی ریٹنڈ انڈین تہذیب یورپی اقوام سے زیادہ مذہب اور تمدن نظر آئیں گے کیونکہ اگر سفیدوں کی خلاف ورزی اور وہاں فتنے کی تو یورپی اقوام نے کی اور دھوکہ اور فریب کے ذریعہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا۔ اب تو وقت کے ساتھ ساتھ ریٹنڈ انڈین باشندوں کے ترقی یافتہ تمدن کی شہادتیں بھی منظم ہو گئی ہیں مثلاً یہ کہ وہ کپڑے کی صنعت اور زراعت کے طریقوں میں باہر تھے۔ کپڑا بننے، رنگوں اور ڈیزائنوں کے انتخاب میں جو خصوصیت ان کے ہاں ہے وہ بلا مقابلہ ہے۔ زراعت میں ان سے سفید اقوام نے بہت کچھ سیکھا۔ مثلاً مکئی، آلو، ٹماٹر، پیاز، مرچیں، انیس اور تمباکو۔ یہ سب ہی دنیا کو اپنے باشندوں سے ملے جب وہ امریکہ گئے ہیں تو اس وقت ان کے ہاں درختوں کی چار سو ایسی قسمیں تھیں جن سے لال یورپ واقف تھے۔ انہوں نے امریکی باشندوں سے جو کچھ سیکھا اس کے نتیجے میں یورپ کی زراعت پی اوار میں اضافہ ہوا اور انہیں جو حق آبادی کے لئے تھا وہی شکل میں ایک نعمت مل گئی۔ ان تمام باتوں کو نظر انداز کر کے لال یورپ نے تہذیب و تمدن کے نام پر ان کا قتل عام کر کے انہیں اپنے ہی ملک میں اتبھی بنا دیا۔ یہی کچھ انہوں نے آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ میں کیا۔

وقت کے گزرنے کے ساتھ کالے و گورے مومن و کافر اور تمدن اور غیر تمدن کا فرق کم ہوا تو انہیں مذہب کو اصطلاحوں کے ذریعہ آج کی دنیا میں ایک اور شکل دیدی گئی ہے۔

سب اسے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر اقوام کی زباں میں وہی کہہ جاتا ہے جسے ایک ممالک میں مستبدان اور غیر مستبدان کے درمیان کیا جاتا تھا اور کبھی جنوب اور شمال کی اصطلاح استعمال کر کے اس فرق کو برقرار رکھا جاتا ہے۔ اس کے پس منظر میں سچ بھی رہی جذبہ کام کر رہا ہے کہ خود کو افضل اور برتر سمجھ کر کمزور اقوام کے مادی وسائل کا استحصال کیا جائے اور انہیں یہ سوچ نہیں دیا جائے کہ وہ خود مختار ہو کر اپنے وسائل سے فائدہ اٹھا سکیں۔

تاریخ اور بغاوت

بغاوتوں کے درمیان تاریخی عمل میں بہت تبدیلی آئی رہتی ہے۔ بغاوتیں اگرچہ مضبوط اور مستحکم اداروں اور مہیاات کو کمزور کر دیتی ہیں۔ اور ان کی مشہد ملی کو صدمہ تو پہنچاتی ہیں مگر یہ نہیں مکمل طور پر جہ نہیں کر دیتی۔ بغاوتیں 'بھل' 'شکار اور بے چینی کو پیدا کرتی ہیں مگر کسی نظام کو بدلتی نہیں۔ اس لئے بغاوت اور انقلاب میں فرق ہوتا ہے جہاں بغاوت قائم ہوتی ہے وہاں انقلاب کامیاب ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی انقلاب اس وقت تک کامیاب نہیں ہوتا جب تک کہ مسلسل بغاوتوں کے درمیان کسی نظام کو کمزور نہیں کیا جائے اس پر مادی نہیں لگا کر اس کی بنیادوں کو ہلکا نہیں دیا جاسکتا۔ کسی بھی نظام اور اس کے اداروں کو بغاوتوں کے ذریعہ اس قدر حقہ کر دیا جاتا ہے کہ انقلاب افسانہ گرا کر ایک نئے نظام کی تشکیل کرتا ہے۔ یہی کچھ روس میں ہوا کہ 1917ء کا انقلاب بنی لاقعد لو بغاوتوں کی پیداوار تھا جو روس کے مستبدانہ نظام کے خلاف قائم ہوئی رہی تھیں۔ مگر ہر نظام بغاوت لوگوں میں ایک نیا جذبہ پیدا کرتی تھی ایک نیا حوصلہ دیتی تھی کہ خلافت نظام کے خلاف نئے سرے سے جدوجہد کی جائے اور ان طریقوں سے بچا جائے کہ جنہوں نے کچھ بغاوتوں کو قائم بنایا تھا۔ یہی کچھ چین کے انقلاب میں ہوا کہ اس کے پس منظر میں بھی چینی کسانوں کی بغاوتیں تھیں اور انہیں قائم بغاوتوں نے آخر کار ایک کامیاب انقلاب کی بنیاد ڈالی۔

بغاوتیں کیوں قائم ہوتی ہیں؟ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہوتی ہے کہ بغاوت میں ملک کی آبادی کا بڑا حصہ شریک نہیں ہوتا اور شعور کی کمی کی بنا پر وہ اس سے علیحدہ رہتے ہیں اور ایک محدود جماعت اور گروہ حالات سے غلبہ کر اپنے مسائل کا فوری حل نہ پا کر بغاوت کر رہتے ہیں۔ جب آبادی کی اکثریت ذاتی طور پر بغاوت کے لئے تیار ہو جائے تو یہی بغاوت انقلاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

بغاوت کی ناکامی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ اس کا دائرہ بڑا محدود ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے اکثریت کو بغاوت میں اپنے مطالبات کے حل ہونے کی امید نظر نہیں آتی۔ ویسے بھی بغاوت کسی نظام کو مکمل طور پر جہ کرنا نہیں چاہتی بلکہ اس نظام کے اندر رہتے ہوئے مسائل کا

مل جاتی ہے مثلاً حکمران طبقے کے بعض یا اختیار لوگ جیسے گورنر یا امراء زیادہ مراعات کے لئے مرکز سے بناوٹ کرتے ہیں یا وہ بناوٹیں ہوتی ہیں جو عیسویوں کی لادوٹی 'اقتصادی بد حالی یا حکام کے مظالم کے خلاف ہوتی ہیں۔ اکثر ان بناوٹوں کو اصلاحات کے ذریعہ ختم کر دیا ہے۔ اس لئے اس قسم کی بناوٹیں محدود مقاصد اور مقامات کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہیں۔ لیکن تاریخ میں ایسی بناوٹیں بھی ہیں کہ جنہوں نے مکمل نظام کو تبدیل کرنے کا مطالبہ کیا مگر وقت سے پہلے اس میں نے طاقت کا استعمال کر کے ناکامی کا سامنا کیا۔ ان بناوٹوں کو اصلاحات کے ذریعہ ختم نہیں کیا جاسکتا تھا اس لئے نہیں ملتی اور تشدد کے ساتھ ختم کیا گیا تاکہ اس کے اثرات زیادہ دیر چلنے پانچیں لیکن یہی وہ بناوٹیں ہوتی ہیں جو تاریخ میں اپنے اثرات چھوڑتی ہیں۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بناوٹوں کی فائیمیں کے باوجود اور اس ظلم و تشدد کے باوجود آخر انسان کیوں مکمل تبدیلی چاہتا ہے؟ اور کیوں وہ ایک مضبوط نظام کے خلاف اور اس کے اداروں کے خلاف بناوٹ کر کے اپنی جان کی بازی لگانا ہے؟ اور یہ سب کچھ وہ ایک شعور کے ساتھ کرتا ہے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اس کے پاس صرف ایک ہی زندگی ہے اور وہ زندگی اسے وہاں نہیں ملے گی۔ بنیادی طور پر بناوٹ اسی وقت شرمنا ہوتی ہے جب کہ معاشرہ میں ایک نظام اور اس کے فائدہ محدود ہو کہ صرف کھربوں طبقوں میں مخصوص ہو جاتے ہیں۔ اس وقت معاشرہ کے محروم طبقوں کی قوت بیداشت جواب دے دیتی ہے اور وہ اس نظام کی ہر مہمہ امت 'قدر' اور اس کے ہر ادارے سے مکمل انکار کر دیتے ہیں اور یہی مکمل انکار بناوٹ کی بنیاد ہوتا ہے۔

البرٹ کامیو بناوٹ کے پس منظر پر لکھتے ہوئے کہتا ہے کہ بناوٹ کا نتیجہ موت ہوتا ہے مگر باقی اسے آزادی کی خاطر قبول کرتا ہے 'وہ جیوں پر کھڑے ہو کر مچالیں کرتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں اس کی اندرونی ملا جلیاں ابھرتی ہیں۔ اور وہ فطرت میں اس کی شخصیت پر جو رنگ چڑھ گیا تھا بناوٹ کے بعد وہ رنگ پھٹ جاتا ہے۔ بناوٹ 'مراحت اور انکار اس کی شخصیت کو جاندار بنا کر اس میں حقد اور یقین کو پیدا کرتی ہیں۔ وہ بناوٹ کر کے حقوق کی خاطر موت کو قبول کر لیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اسے اپنی زندگی سے زیادہ حقوق مزید ہوتے ہیں اور وہ ان کی خاطر جان دینا گوارا کر لیتا ہے۔ اگرچہ ان حقوق کا تعلق صرف اس کی اپنی زندگی سے نہیں ہوتا ہے بلکہ وہ سارے انسانوں سے بھی ہوتا ہے اور ان میں وہ لوگ بھی شامل ہوتے ہیں کہ جو ظالم اور استغنی ہوتے ہیں اس لئے بناوٹ مکمل اپنی اپنی تسکین کے لئے نہیں ہوتی۔ بلکہ وہ اس غصہ اور جذبہ کے ساتھ ہوتی ہے کہ جو چیز وہ سبوں کے پاس ہے وہ اس کے پاس

کیوں نہیں

موجود ہونے میں وقت کے ساتھ ساتھ بناوٹ کے غدار کے ذریعہ بھی بدل گئے ہیں۔ اب جمہوری روایات میں یہ بناوٹیں مزدوروں کی بڑا ہونے کے ذریعہ ہوتی ہیں یا عوام انتخابات میں دو ٹوک کے ذریعہ اپنی پسند کی جماعت کو منتخب کر کے اس کے مطالبات کی حمایت کرتے ہیں۔ لیکن اگر آج بھی اظہار رائے کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں اور تمام راستے محدود کر دیئے جائیں۔ تو احتجاج کے طور پر بناوٹ اچانک بھڑک اٹھتی ہے اور پھر یہ پر تشدد اور خون ریز ہوتی ہے اور نہیں بناوٹوں کے ذریعہ محروم طبقے اپنے حقوق کی جنگ لڑتے ہیں۔

یورپی اقوام اور تاریخ کا نقطہ نظر

یورپی اقوام نے جب نوآبادیات کو قائم کرنے کا سلسلہ شروع کیا تو اس عمل کو تاریخ میں اس انداز سے بیان کیا کہ ان نوآبادیات پر قبضہ اور ان کا استحصال بالکل جائز اور صحیح بن کر ابھرا۔ تاریخ کے اس نقطہ نظر کو نہ صرف یورپ میں تسلیم کر لیا گیا بلکہ ان ملکوں میں بھی جن کو نوآبادیات طے کیا تھا اور جن کا استحصال کیا گیا تھا۔

یہ نقطہ نظر میں سب سے اہم بات یہ تھی کہ اس میں یورپ عالمی تاریخ کا مرکز قرار دیا گیا اور یورپی سوشل جیٹ اس مرکز کو ذہن میں رکھتے ہوئے دنیا کی تاریخ کو بیان کیا۔ اس لئے ان کے نقطہ نظر سے یورپ کا معاشرہ تہذیب کے مراحل سے گزر کر ایک سپر پاور بن چکا تھا اور ان کے سائرس میں جو روایات و اقوال، قانون، حکومتی ادارے، اور رسوم و رواج تھے، اسی کو سپر پاور جانتے ہوئے انھوں نے دنیا کی دوسری تہذیبوں کو جانچا اور پرکھا۔ انھوں نے یورپ کی تہذیب کے ارتقائی مدارج چھین کر لئے تھے جیسے قدیم، عہد وسطیٰ اور جدید۔ اسی کو ذہن میں رکھتے ہوئے انھوں نے دوسری تہذیبوں کو بھی ان خانوں میں تقسیم کیا۔ ان کی اس تقسیم کے مطابق امریکا، "آسٹریلیا" اور نیوزی لینڈ کی تہذیبیں اپنی ابتدائی شکل میں تھیں۔ ہندوستان عہد وسطیٰ میں اور دنیا کی کوئی تہذیب ترقی یافتہ شکل میں نہیں تھی۔ اس لئے وہ جہاں جہاں تہذیب اور تمدن کے بارے میں ان کا یہ نقطہ نظر طویل ہو گیا اور ان کے مقابلہ میں دوسری اقوام خود کو غیر تہذیب، اور پسماندہ سمجھنے لگیں اور ان ملکوں کے دانشوروں اور سربراہوں نے بھی اپنی تہذیب کی ارتقاء کے ان تاریخی مدارج کو صحیح تسلیم کر لیا، جس کے نتیجہ میں ان کے داخلی کی تمام شاخیں و شوکت، اور شاندار زندگی بے کار سمجھا جانے لگا کیونکہ قدیم دور سے مطلب یہ ہے کہ اسی عہد میں وحشت و برصورت تھی۔ عہد وسطیٰ تک فکری اور ثقافتی کارنامہ اٹکا اور صرف جدید دور میں روشن خیالی و سائنسی گریبہ ہوئی۔ جس میں صرف یورپی تہذیب ظہور ہوئی ہے۔ تاریخ کی اس تقسیم نے قدیم تہذیبوں کو ان کے زبردست کارناموں سے محروم کر دیا۔

جب کل یورپ نے تجارت کے فروغ اور نئے ملکوں کا مل اپنے ہاں لانے کے لئے اور

اپنے مال کی منڈیاں تلاش کرنے کے لئے سمندریوں میں سے نئے راستوں کی تلاش شروع کی تو اس عمل کو انھوں نے "تجارتی دریافتوں" کا نام دیا۔ دریافت کی اصطلاح سے یہ مطلب نکلا ہے کہ اس سے پہلے ان راستوں کا وجود تھا اور نہ وہ ملک مسخرہ تھے جن تک وہ ان راستوں سے گزر کر پہنچے۔ یہاں اس بات کو تسلیم نہیں کیا گیا کہ یہ راستے اور ملک پہلے سے موجود تھے اور دوسرے لوگ ان سے واقف بھی تھے، محض اہل یورپ ان راستوں اور ملکوں کے بارے میں بے خبر تھے۔ چونکہ اس سے ان کی جہالت اور بے خبری کا اظہار ہوا تھا اس لئے یہ کہا گیا کہ یورپی ماہرین نے اپنی مہارت، ذہنیت اور مہم جوئی نہ لغت کے تحت ان راستوں کو دریافت کیا۔ دریافت عین اس چیز کی ہوتی ہے کہ جس کا پہلے سے کوئی وجود نہیں ہوتا ہے۔ یہ دریافت کرنے والے کی ذہنی و تحقیقی صلاحیت کو ظاہر کرتی ہے۔ یورپی اقوام کے مطابق چونکہ انھوں نے ان راستوں اور ملکوں کو دریافت کیا جو کسی مدفن خزانے کی مانند تھے اس لئے یہ ان کا حق ہے کہ وہ ان راستوں کے استحصال کو صرف اپنے لئے دیکھیں اور دوسروں کو ان کے فوائد سے محروم نہ رکھیں۔ اس وجہ سے سمندریوں میں طاقتور، بحری جہازوں نے یورپ کے تسلط کو قائم کر لیا اور دوسری اقوام کو یہاں سے نکلنا پڑا۔ اسی طرح نئے دریافت شدہ ممالک جن میں خصوصاً "امریکا"، "آسٹریلیا" اور نیوزی لینڈ شامل ہیں ان پر قبضہ جمنا، ان کے درائع کو اپنے لئے استعمال کیا اور آخر کو ان کی دولتیں و ملکوت بنا کر اس کا مظاہرہ کیا۔ انھوں نے اپنے اس نظریہ کے تحت ان ملکوں کے مقامی باشندوں کو جاہل اور غیر تمدن کہہ کر ان کے قتل عام کو جائز قرار دیا اور ان ممالک پر مکمل طور پر قبضہ کر لیا گیا۔

نوآبادیاتی نظام کے تمام اور سیاسی اقتدار کے مستحکم ہونے کے بعد یورپی اقوام نے اس بات کی کوشش کی کہ اپنی مملکتوں کو مغربی تہذیب میں ضم کر دیا جائے کیونکہ جب اس کی اپنی لغوات ختم ہو جائے گی اور ان کی تہذیبی شناخت کو مٹا دیا جائے گا تو وہ ان کے اقتدار کو تسلیم نہیں کریں گی اور ان کی حکومت ان کے لئے اپنی اور غیر ملکی لوگوں کی حکومت نہیں رہے گی۔ اس مقصد کی خاطر انھوں نے نوآبادیات کے معاشرہ کی تہذیبی جزئیات کو دبا کر دہاں کے لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیل کرنے کا مقصد پایا۔ اس کے قصبات پر روشنی ڈالتے ہوئے ۱۸۳۵ء میں ایک انگریز مورخ و سن نے لکھا کہ۔

"لوگوں پر ایک دور دراز اور باطلوں ملک کے نظریات مسلط کر دیا، ان کے کردار کو کم تر بنایا اور ان کی توانائی کو کھانا ہے اس کے بعد وہ اس قابل نہیں ہوں گے کہ وہ ذہنی اور فکری طور پر خود کو متاثر کر سکیں۔"

ان کی کتابیں ہمارے نصاب میں شامل رہیں اور ان کے قائم کے ہوئے نظریات ہماری سطحوں کے قاضیوں میں رائج ہو گئے۔ آج جب ہم ان خطوط پر اور اس سوچ کے ساتھ تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس سے ظاہر تاریخی شعور پیدا ہوتا ہے۔ آزادی کے بعد ضرورت اس بات کی تھی کہ تاریخ کو نئے انداز سے وسیع فیاض پر نگاہیں کیا جائیں تاکہ ہمارے قلوبوں میں عداوتیں پیدا ہوں اور تفسیر ختم ہوتی۔

نوآبادیات کے لوگوں کو ذہنی طور پر پسماندہ بنانے اور فکری طور پر پسماندہ رکھنے کی شعوری کوششیں کی جاتی تھیں۔ اس سلسلہ میں یہ پارہہ دکھاتا تھا کہ ان کی کوئی تاریخ نہیں۔ یہ بات نہ صرف "تقدیریات ملکوں" کے لئے کہی گئی بلکہ ان ملکوں کے لئے بھی جو کہ ماضی میں تہذیب کا گہوارہ رہ چکے تھے۔ شفا ہندوستان کے بارے میں مشہور قسطنطین لے لے کر نامور مورخ ر کے بلکہ جی بات کہتے رہتے کہ اس ملک کی کوئی تاریخ نہیں۔ افریقہ "پیشین" اور یورپی بینڈ کے بارے میں تو یہ بات شہود کے ساتھ کہی جاتی تھی۔ اس سے وہ یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ ان ملکوں میں تاریخی عمل اس وقت سے شروع ہوا جب وہاں یورپی اقوام آئیں اور انہوں نے ان ملکوں میں جمود کو توڑ کر اسے متحرک کیا اور اس کے بعد ہی سے یہاں تاریخ کی تشکیل شروع ہوئی۔

اس نقطہ نظر کے تحت نوآبادیاتی نظام کو قائم کرنے والوں کو "سماں" کا خطاب دیا گیا جنہوں نے اپنا تاریخی تشکیل کی۔ ان معادلوں میں صرف "تھران" ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ "اٹرن" تعلیم "کانن" دان اور "سائنس" دان بھی شامل ہوتے تھے۔

نوآبادیاتی نظام کے قائم کرنے میں یورپی اقوام کو مزاحمتی تحریکوں سے بھی ساتھ ہوا اس وجہ سے انہوں نے اقوام کو دو قسموں میں بانٹ دیا۔ دوستانہ ہندوستان رکھنے والی اقوام اور دشمن اقوام۔ جن قسموں نے ان کے اقتدار کو تسلیم نہیں کیا اور ان کے خلاف جدوجہد کی یا ان کی "اصلاحات" کے خلاف رد عمل کا اظہار کیا وہ ان کے دشمنوں کی صف میں آئیں اور ان کے بارے میں ان کے خیالات سخت رہے۔ لیکن جن اقوام نے ان کے خلاف مزاحمت نہیں کی انہیں اطاعت شعار کہا گیا۔

یورپی اقوام کو نوآبادیاتی ملکوں میں جب مخالفت کا سامنا کرنا پڑا تو انہوں نے اعلیٰ طاقت اور مزاحمتی تحریکوں کو خاص اصطلاح کے ذریعہ بیان کیا تاکہ لوگوں میں ان کے بارے میں ہمدردی کے جذبات پیدا نہ ہوں اور وہ ان سرگرمیوں کو دشمن سرگرمیوں سمجھیں۔ اس لئے ان کے اقتدار کی مخالفت مخالفت کہلاتی تھی اور جو لوگ اس میں شامل ہوتے تھے وہ "دشمن" "تحریک کار" اور "دشمن" کہلاتے تھے۔ ڈاکوؤں کے گھون کا مطلب اس کیلئے تھا کہ ہتھیار بند ہو کر دشمن سے لڑ رہی تھی۔ متعلیٰ عدالت کی اصطلاح اس صورت میں استعمال ہوتی تھی جب کہ ایک خاص علاقے کے لوگوں میں اجماع ہو جاتا تھا۔ "ایڈ" کا یہ مراد تھی کہ حکومت کے خلاف تمام تحریکوں کو ختم کر دیا گیا ہو۔ اس کا مطلب اس لئے اور تھا کہ یہ نہیں تھا۔

یورپی مورخوں نے نوآبادیات کی تاریخ اپنے نقطہ نظر سے لکھی۔ ان کے دور اقتدار میں

آخری عہد مغلیہ اور آج کی صورت حال

تاریخ میں اکثر ایک عہد کے حالات دوسرے عہد سے ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہرائی ہے۔ اگرچہ واقعات اور حالات ایک جیسے نظر آتے ہیں مگر اس کی وجوہات و اسباب طبعاً ہوتے ہیں اور اس لئے ان کے نتائج بھی مختلف ملتے ہیں۔

اس وقت پاکستان کی جو صورت حال ہے اگر ہم اس کا مقابلہ آخری عہد مغلیہ کے ہندوستان سے کریں تو دونوں میں بڑی مماثلت نظر آئے گی مگر ظاہر ہے کہ ان دونوں عہدوں کے حالات مختلف ماحول کی پیداوار ہیں۔ لیکن اس مماثلت سے ہم یہ ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اپنے حالات کا تجزیہ کریں اور گوشل کریں کہ آخری عہد مغلیہ کا بعدوستان جس الیہ سے وہ چار ہوا تھا اس سے خود کو چھائیں۔ تاریخ کا مطالعہ واقعات کا تجزیہ کرنے کے مواقع فراہم کرتا ہے اور قوموں کو شعور دیتا ہے کہ وہ ماضی کی روشنی میں حال کا مطالعہ کر سکیں۔

آخری عہد مغلیہ میں سیاسی اتھری اور زوال کی ابتداء اس وقت ہوئی جب مغل بادشاہت کا دواہ کمزور ہو اور اقتدار و طاقت اس کے ہاتھ سے نکل کر منصب دایوں اور اسراء میں آگئی۔ بادشاہ کی کمزوری کی وجہ یہ ہوئی کہ سلطنت کے پھیلاؤ کے ساتھ جب مسائل زیادہ ہوئے تو اس کے لئے یہ نامکن ہو گیا کہ وہ تمام حالات کے دیکھ بھال کر سکے اور نیچے دے سکے اس لئے انتہا رات آہستہ آہستہ منصب دایوں اور اسراء میں منتقل ہونا شہرہ ہو گئے۔ اس طرح مغل امپیریل ازم کے زوال کے اسباب اس کے اندر سے شروع ہوئے۔ جب سلطنت زوال میں آئی تو مرکز کے لئے نامکن ہو جاتا ہے کہ دور دراز کے علاقوں پر اپنا تسلط برقرار رکھ سکے۔

مغل سلطنت کی کمزوری کی دوسری وجہ یہ تھی کہ مغلوں نے دوسری اقوام کو اپنے اقتدار میں شریک نہیں کیا اور بالکل 'ذوق ہندوستان' اور ہندو جیسے دور دراز کے علاقوں میں حکومت کے اعلیٰ عہدے دار مغل دربار سے آتے تھے جن کے خلاف عربوں 'پانوں' راجپوتوں اور عسکوں نے ہتھیاری شریک کر دیں۔ ان بینکوتوں کے یکس طرح اس قوموں کے

دبند میں اور اور کے مہتموں کی خواہش تھی کہ انہیں بھی اقتدار میں شریک کیا جائے۔ مغل سلطنت کے زوال کی وجوہات میں سے ایک یہ بھی تھی کہ مغل منصب دایوں کی تنخواہیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں جس کی وجہ سے ریشیت کی تھار و بیہودہ خرچ کرنے کے بجائے ریاست کی 'دھن' کا کثیر حصہ ان منصب دایوں کی تنخواہوں اور مراعات میں چلا جاتا تھا۔ جب بغاوتوں اور خانہ جنگیوں کی وجہ سے 'دھن' کے ذرائع کم ہوتے تو حکومت زبردست مالی بحران میں مبتلا ہو گئی۔

ان حالات میں منصب دایوں اور اسراء نے اپنی حیثیت اور مراعات کو قائم رکھنے کے لئے اور اپنی جاگیروں سے زرہتی و شند کے ساتھ ٹیکس وصول کرنے کے لئے اپنی اپنی فوجیں رکھنا شروع کر دیں جو ان کی ذات سے وقادار ہوتی تھیں۔ مگر یہ اسراء اپنے فوجیوں کو ہندو سے محروم نہیں دیتے تھے اور ان کی آمدن کے ذرائع مالی محسوس اور لوٹ مار ہوا کرتے تھے۔ تنخواہ کے مطالبہ پر ان سے کہا جاتا تھا کہ قلائ شہرہ لگاؤں سو لو۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پورا ملک مختلف گروہوں اور جماعتوں میں بٹ گیا۔ اقتدار اور ذریعہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے خانہ جنگیوں کی ابتداء ہوئی 'ایک بیرو دوسرے پر حملہ کرتا' جس کے نتیجے میں قتل و غارتگری اور خون ریزی عام ہو گئی۔ فوجیں جب ایک جگہ سے دوسری جگہ تھیں تو راستے میں کمیٹیوں کو پھیل کرتی 'گڈوں کو لٹتی' اور دیہات کو تباہ و برباد کرتی تھیں۔ فوجوں کی رخ کے بعد دکانوں 'مکانوں اور محلات کو دہا کھسکا جاتا، فوجی گھروں میں داخل ہو جاتے اور دیوارت و ملیوسات اور نقدی زبردستی لے جاتے۔

اس صورت حال میں قانون کی بالادستی ختم ہو گئی 'ہر اعلیٰ کے اختیار است باقی نہ رہے' مزاحمت کا نظا کرنے والا کوئی ادارہ نہیں رہا۔ طاقت اور اور مراعات یافتہ طبقے قانون سے بالاتر ہو گئے۔ بلکہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر اپنی ریشیت کو خود جس طرح سے چاہتے تھے سزا دیتے تھے اور ان کے خلاف کسی کو اپیل نہیں کی جاسکتی تھی 'شلا جاگیر دار اپنی ریشیت کو قتل' قہر 'جہاد اور دوسری مزاحمتیں دیتے تھے اور اس قانون کا قسطن الصاف سے نہیں تھا بلکہ یہ اسے اپنی مراعات کو بآئی رکھنے کے لئے مستعمل کرتے تھے۔

لذا ملک میں عوامی کی فضا ہوئی 'فوجوں نے لوٹ مار کی پالیسی کو اختیار کیا اور اسراء و منصب دایوں نے دولت جمع کرنا شروع کر دی' تو اس سے پور معاشرہ متاثر ہوا۔ ذراعت چاہ ہوئی صنعت و حرفت بہا ہوئی 'شاہراہیں اور راستے غیر محفوظ ہو گئے اور سپہ روز گاری کے نتیجے میں جگہ جگہ لشکروں 'ڈاکوؤں اور پٹاریوں کے گروہ پیدا ہو گئے۔

اس سے پارے ملک میں عدم تحفظ کا احساس پیدا ہوا، اس وقت کوئی طاقت اور قانون نہ تھا جو ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت کرتا۔ رہتے غیر محفوظ ہونے کی وجہ سے تجارت متاثر ہوئی، اس کا اثر صنعت و دست کاری پر پڑا۔ منگالی میں اضافہ ہوا، غربت و افلاس بڑھا، اور اس کے ساتھ ہی معاشرے کی اخلاقی اقدار بھی متاثر ہوئیں۔ مثلاً اب ہر شخص کی زندگی کا مقصد یہ غمراہ کرنا ہوتا تھا جو طریقہ سے دولت حاصل کی جائے چاہے وہ بدعت مار کے ذریعہ سے ہو یا رشوت کے۔ اس دولت کو گردش میں رکھنے کے بجائے وہ اسے زمین میں دفن کر دیتے تھے تاکہ یہ ان کے پاس ہی محفوظ رہے۔ دولت معاشرہ میں تحفظ کا سب سے بڑا ذریعہ بن گئی۔

معاشری ضروریات نے لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیا کہ وہ اپنے ملک اور قوم کے خلاف جنگ کریں اور ان کی تحریکیں کریں، چنانچہ اسی وجہ سے ایست اٹلا کھنی کو فوجیوں کے لئے کی گئی حمایت نہیں رہی جو ان کی فوج میں شامل ہو کر وہ کی خاطر اپنے ہم وطنوں سے لڑتے تھے۔

اس سیاسی انتشار، معاشری و مالی اور عدم تحفظ کی حالت میں لوگوں میں ایسی بے بسی پیدا ہوئی، اور قسمت اور تقدیر پر بھروسہ کیا جانے لگا۔ حالات کا تجزیہ کرنے اور مسائل کو حل کرنے کا ان میں شعور نہیں تھا، اس لئے وہ ان تمام طاقت کی دوسری بادشاہ پر ڈال دیتے تھے اور یہ سمجھتے تھے کہ صرف ایک شخص ان سب کا سردار ہے اور اس کی خواہش کرتے تھے کہ صاحب اقتدار، اقتدار سے محروم ہو جائے اور حکومت بدلے، ان کے مسائل حل ہو جائیں۔ اس لئے جب بھی ایک بادشاہ قتل ہوتا، قید میں ڈالا جاتا، اور بادشاہت سے محروم کیا جاتا تو لوگوں میں خوشی و مسرت کی لہر دوڑ جاتی تھی اور وہ اس امید میں جھلا ہو جاتے تھے کہ نیا بادشاہ اور نئی حکومت ان کے لئے بہتری لے کر آئے گی۔ مگر اس پر دے داری میں ایک کے بعد ایک پادشاہ، ولیعہد کے شہزادے بادشاہ ہوتے رہے اور کسی نے بھی رحمت کی حالت بہتر نہیں بنائی۔ اس پر دے داری میں کوئی تحریک اس قسم کی نہیں چلائی گئی کہ جس میں چارے نظام کو تبدیل کر کے کامنویہ بنانا اور جس میں تمام طبقوں کو اقتدار میں شریک کرنے کا پلان ہو۔

یہ وہ حالات تھے کہ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی پر سر اقتدار تھی اور انہوں نے اگر مثل نظام کی جگہ اپنا یہ نظام نافذ کیا، اگرچہ اگر یہ ایک غیر ملکی قوم تھے، ان کا یا نظام ان کے مفادات کے تحفظ کے لئے تھا، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عام لوگوں نے اس دور میں سکون کا سانس لو اور قانون و تحفظ کی وجہ سے ان کے محفوظ ہوئے۔

لیکن تقریباً دو سو سال حکومت کرنے کے بعد جب اگرچہ اس پر صفر سے نئے لایا محسوس ہوا کہ دو سو سال کا جو دور گلیا تھا ان کے چلتے ہی وہ کڑی ٹوٹ گئی اور پھر تیزی سے حالات دہیں پر آگئے کہ جہاں وہ انگریزی اقتدار سے پہلے تھے اور وہ تاریخی قسطنطنیہ دور سے قائم ہو گیا جو انگریزوں کے آنے کی وجہ سے ٹوٹ گیا تھا۔

کیونکہ اس وقت بھی قانون کی بالادستی ختم ہو چکی ہے، مسیحیت کی بنیادیں کھوکھلی ہیں، قومی و ملکی احساسات کی جگہ گردی، تعصب ہیں، چھری ڈاکہ اور جرائم نڈنل ہو گئے ہیں، اور رشوت و بد عنوانی کا دورہ دورہ ہے اور ہم پھر ان حالات کا تجزیہ کرنے کے بجائے ان کی ذمہ داری چند افراد کے ذمے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس لئے اس وقت یہ اہم سوال ہے کہ آخری عہد مغیرہ میں جب حالات حد سے زیادہ بگڑے تو ایک غیر ملکی طاقت پر سر اقتدار آگئی اور ہم اس کے غلام بن گئے، آج پھر اسی معاشرے کے لئے یہ ایک پہنچ ہے کہ اس سے پہلے کہ حالات اور زیادہ بگڑیں اور ہم کسی تباہی سے دوچار ہوں ہم نے تاریخ سے جو سبق سیکھا ہے اس کی روشنی میں اس کا حل ڈھونڈیں۔

انسانی عظمت کی اہمیت

ایک انسان جب تک اپنی عظمت اور وقار کو برقرار رکھتا ہے، اس وقت تک اس میں تعلقی ملاہمتیں اور ذہنی و فکری ارتقاء باقی رہتی ہے اور وہ منہور کے ساتھ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے اور اپنے حق کے لئے جدوجہد کرتا ہے۔ اسی لئے ایک ایسے معاشرہ میں جہاں طبقات تقسیم مہری ہوئی ہے اور اقتدار چند ہاتھوں میں محدود ہوتا ہے وہاں اس بات کی پوری کوشش کی جاتی ہے کہ انسانی عظمت و وقار کو کسی طرح سے بچا جائے کیونکہ صرف اسی صورت میں وہ لوگوں کی قوت مزاحمت کو ختم کر کے انہیں اس قدر کمزور کر دیتے ہیں کہ ان پر حکومت کرنے میں اور انہیں اپنے ذمہ اقتدار رکھنے میں انہیں دشواری پیش نہیں آتی۔ مطلق العنان حکومتوں میں وہ تمام ذرائع اور طریقے استعمال کئے جاتے ہیں جن کے ذریعے انسان کو احساس کمتری میں مبتلا کیا جائے اور ان میں حکمران طبقوں کا زور اور خوف پیدا ہو اور وہ ان کی عظمت کے قائل ہو کر ان کی عزت و محترم کریں۔ اس لئے بادشاہت کے دور حکومت میں اس قسم کی رسومات کی جتنی بھی گئی کہ جو عوام کو انسانی عظمت سے گرا دیں۔ ان میں پوشاک کو مجبور کرنا، پتوں چھڑنا، جنگ کرکٹ کرکے وقت نظریں پچی رکھنا وغیرہ شامل تھیں۔ اعلیٰ دایہ کی تفریق لباس، رہائش اور طرز معاشرت سے بھی ظاہر کی جاتی تھی۔ عوام حکمران طبقوں کے تہی لباس، عالی شان محلات، پلے و جلوس سے ساثر ہوتے تھے۔ عظیم عمارتیں اور عجیب و غریب ہندو بالا دروازے انہیں جیت زہ کرنے کے لئے ہوتے تھے۔

جب طاقت و قوت اور دولت چند طبقوں میں سمٹ جاتی ہے تو اس کے نتیجے میں عوام کی اکثریت غربت، بے روزگاری اور توہمت کا شکار ہو جاتی ہے اور عوام کی زندگی اس محنت مسائل میں جکڑ کر رہ جاتی ہے۔ ایسے وقت میں وہ اپنے مسائل کا حل تلاش کرنے کے لئے ان ہی طبقوں کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ مثلاً ملازمت، انصاف کی ضرورت اور تحفظ کی تلاش۔ ان سب کے لئے عوام کو انہی کے دروازے پر جانا پڑتا ہے اور خوشحالانہ انداز میں ان سے درخواست کرنی پڑتی ہے۔ جس میں وہ خود کو گرا کر فروغی و غاسار کہہ کر ان سے گڑگڑا کر درخواست کرتا ہے۔ اس کی درخواست کی منظوری کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے پیش کے لئے تلافی میں لے

لیا گیا ہے۔ اس پورے عمل میں ایک عام انسان اپنی عزت اور عظمت سے محروم ہو جاتا ہے اور اسے ہر مرحلے پر اپنی کم مائیگی کا احساس ہوتا ہے اور یہی احساس اس کی قوت مزاحمت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے۔ زبان اور انداز خطاب میں طبقاتی فرق کو قائم رکھا جاتا ہے اور اس طرح غلبہ ہو جاتا ہے کہ وہ اپنے طبقاتی درجہ اور فرق کو محسوس کر سکے۔

انسان کی مزاحمت و بغاوت اور اس کی جسمانی و روحانی قوت کو کچلنے کے لئے امت و ملت و زمانہ کے طریقوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ آخری حربہ ہوتا ہے جن کے ذریعے انسان کی عظمت کو ختم کیا جاتا ہے، کیونکہ انہی کے سبب انسان روحانی و جسمانی طور پر ہمسامہ ہو جاتا ہے اور اسکی شخصیت اس قدر بکھل دی جاتی ہے کہ وہ سراٹھا کر بچنے کے قابل نہیں رہتا اور اسے خود اپنے سے اور اپنی زندگی سے نفرت ہو جاتی ہے اور وہ کسی سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہتا ہے۔

انسانی عظمت کو ختم کر کے مطلق العنان حکومتیں وقتی طور پر تو اپنا اقتدار قائم کر لیتی ہیں اور اپنی قوت و طاقت اور مداخلت کو برقرار رکھ سکتی ہیں مگر اس کے نتائج آگے چل کر معاشرے کے زوال اور جاتی کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ اس کا سب سے بڑا اثر یہ ہوتا ہے کہ ایسے معاشرے میں ہر عمل حکمران طبقوں کی خوشنودی کے لئے کیا جاتا ہے اور عام لوگوں کی فلاح و بہبود کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ چاہے اوپر ہو، مگر ہو یا سائنس ان تمام کا مقصد ان طبقوں کے لئے تفریح مہیا کرنا اور ان کی ضروریات کی تکمیل کرنا ہوتا ہے جس کے نتیجے میں معاشرہ ہمسامہ رہ جاتا ہے۔ اس کی مثال ہندوستان میں محل معاشرے سے دی جاسکتی ہے۔ اکبر کے دربار میں حج افروز شہزادی ایک مائیس دلن تھا، مگر اس نے ہر بھی ایجادات کیں ان کا مقصد بادشاہ اور اس کے امراء کے لئے ایسے کھیلنے ایجاد کرنا تھا کہ جس سے وہ ملکہ انور ہوں۔ اس نے ایسی کوئی چیز ایجاد نہیں کی کہ جس سے عام لوگوں کو فائدہ ہوتا اور جس کے نتیجے میں معاشی تبدیلیاں آتیں۔ بڑے بڑے شاعر اپنی اپنی صلاحیتوں کا اظہار قصیدوں میں کرتے رہے اور بڑے بڑے ادیب، امراء بادشاہوں کی وقت گزاری کے لئے تھے کہانیاں اور داستانیں لکھتے رہے۔ مورخ دربار کے واقعات اور حکمران کے کارنامے محفوظ کرتے رہے اور یہی حال یہ سیکڑوں اور دہائیوں کا تھا کہ بولسپہن کو دیوار تک محدود رکھے رہتے تھے۔ اس پورے عمل میں عوام کی اکثریت بے رحمت اور بے خبری کے عالم میں رہی۔

اس لئے جب مطلق العنان حکومتیں اس قدر شدید فرق قائم ہو گئیں اور عوام کو بکھل کر انہیں ذہنی طور پر ہمسامہ بنا دیا تو ان دونوں طبقوں کے تعلقات میں کوئی ہم آہنگی اور یکجہتی باقی

نہیں رہی، چنانچہ جب مغل حکومت کو خلیج کیا گیا تو ان کا اطلاع کرنے والا کوئی نہیں تھا اور وہ
تھا اپنی مداخلت کرنے کے قابل نہیں تھے۔ وہ تمام ملحقہ جن کی عزت و حرمت اور وقار کو ختم
کر دیا گیا تھا انہوں نے مغل معاشرے کو پچالے کے لئے کوئی جدوجہد نہیں کی کیونکہ انہیں اس
معاشرے کا ایک حصہ نہیں سمجھا گیا تھا۔

معاشرے میں انسانی عظمت اس وقت قائم ہو سکتی ہے جب ایسے تمام ممالک و ریالات
قوانین اور رسوم و رواج کو متاثر نہ کر دے جو انسانوں میں فرق کو قائم رکھتے ہیں یا جن کے ذریعے
حکومتی ادارے عوام کی عظمت کو ختم کرتے ہیں اور انہیں دربار حقیر اور بے بس ہونے کا یقین
دلاتے ہیں۔ یہ اسی وقت ممکن ہے جب عوام کو حکومت اور اقتدار میں صوبہ کی طرفوں سے
حصہ ملے اور ان کی طاقت و قوت کو تسلیم کر کے ان کی رائے کا احترام کیا جائے۔ جب تک
معاشرے میں ہر فرد کی عزت و عظمت کو قائم نہیں کیا جائے گا اس وقت تک معاشرتی یکجہتی
ناممکن رہے گی۔

ہمارے معاشرے کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہاں نیچے طبقوں کو معاشی و سماجی طور پر
اس قدر نگاہ رکھا گیا ہے کہ ان کے لئے عزت و احترام کے جذبہ مفقود ہو کر رہ گئے ہیں اور
اس لئے سماجی ہمسائیگی اپنی جگہ مضبوط ہو چکی ہے۔ معاشرے سے تحقیقی ملائمتیں مفقود ہو چکی
ہیں ہر طبقہ اور فرد میں معاشرتی مسائل سے بیگانگی بڑھتی جا رہی ہے۔ اپنائیت کا احساس اس
درجہ سے ختم ہو گیا کہ لوگوں کو کسی عمل میں 'چاہے وہ سیاسی ہو' ملوث ہو یا معاشی اس میں حصہ
لینے نہیں دیا جاتا۔ تاریخ تو یہی بتاتی ہے کہ جب بھی کسی معاشرے میں طبقاتی تقسیم اس قدر
گہری ہو جاتی ہے اور لوگوں کو زندگی کے عمل سے علیحدہ کر کے انہیں کتر سمجھا جاتا ہے تو ایسے
معاشرے زوال کے عمل سے خود کو محفوظ نہیں کر سکتے۔

قومی ثقافت کیسے تشکیل ہوتی ہے

دنیا کی تاریخ میں ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ کوئی قوم اور کوئی معاشرہ اسکی طویل تاریخ
میں تباہ اور اکٹھا نہیں رہا۔ اگرچہ ہزاروں خصوصیات کی وجہ سے بعض اقوام کو اس قدر متحمل
سے دو چار ہونا پڑا کہ وہ پہاڑوں، دریاؤں اور صحرائوں کی سمتوں میں پھینک دیے گئے نظروں سے
اوجھل ہو گئیں مگر وقت کے ساتھ ہر قوم کی معاشرتی و معاشی ضروریات بدلتی رہیں اور انہیں اس
ہمت پر مجبور کر دیں کہ وہ اپنے علاقوں کی شکل سے نکل کر وسیع و درخیز علاقوں میں اپنی
ضروریات پوری کرنے جائیں۔ عام طور سے سرد علاقوں والے گرم علاقوں پر اور گرم علاقوں والے
صحرائوں کے رہنے والے دریا کے آباد علاقوں پر حملہ آور ہوتے رہے۔ یہ نقل مکانی کر کے وہاں
آباد ہوتے رہے۔

حصہ کرنے یا نقل مکانی کرنے کے ہی خطر میں قوموں اور انسانی گروہوں کی معاشی
ضروریات تھیں۔ جب کوئی قوم قحط ہو کر درختیہ علاقوں اور کیمپوں پر قبضہ کرتی تو اس کی
خواہش ہوتی تھی کہ وہ مملکت اقوام کی حرمت کو کھل کر انہیں نظام بنالے اور مقامی طور پر
انہیں اس قدر ہیمنڈ کر دے کہ وہ ان کا مقابلہ کرنے کی صحت نہ کر سکیں۔ اس لئے قحط اقوام
اپنی روایات و اقتدار کا سامرا لے کر خود کو بدتر اور اعلیٰ سمجھتیں اور مملکت اقوام کی تہذیب و
ثقافت کی ترقی روک کر اسے ختم کرنے کی کوشش کرتیں تاکہ ان کی تفریق اور شناخت کو ختم
کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں کبھی ان کے رنگ کا مذاق اڑایا جاتا تو کبھی ان کی جسمانی کمزوریوں
کو ظاہر کیا جاتا اور کبھی ان کی عادات و اطوار پر تنقید کی جاتی۔ سفید اقوام بیٹا و افریقہ
کے لوگوں کو 'کلا' 'صحی' پر صورت اور بے ڈھنگا کتے دیکھ کر ان کی تہذیب و ثقافت کا مذاق
اڑاتی رہیں۔ ہندوستان کی قدیم تاریخ میں آریہ اور دروڑ نسل کے لوگوں کے تصادم میں بھی یہ
جزئیات دیکھی جاتی ہیں۔

اس کے بعد قحط اقوام مملکتوں کو ایسے چیمے میں لگا دیتی ہیں جن کا تعلق جسمانی صحت سے
ہوتا ہے اور ان چیزوں کو معاشی و اجتماعی اہمیت سمجھا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان
کی ترقی ترقی رک جاتی ہے اور وہ قحط قوموں کے اجتماعی و معاشی طور پر غلام بن کر رہ جاتے

ہیں۔

یہ صورتحال اس وقت تک برقرار رہتی ہے جب تک مفلوج قوم کا ذہنی شعور بیدار نہ ہو۔ لیکن جب حالات کے دباؤ کے تحت ان میں شعور بیدار ہوتا ہے اور وہ اپنی شناخت کی تلاش میں مصروف ہوتے ہیں تو اس وقت انہیں کئی مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ صدیوں کی غلامی و پسماندگی کے نتیجہ میں اپنی تاریخی زبان، رسوم و رواج اور قومی شعور کو بھلا چکے ہوتے ہیں، اس لئے دوبارہ قومی شناخت کو تشکیل دینا، ابھارنا ایک مشکل اور پیچیدہ مسئلہ ہوتا ہے۔

قومی شناخت کی ابتداء جموں و انڈوں سے شروع ہوتی ہے جس کا اثر اہستہ اہستہ پڑتا ہے اور پھر اس میں دوسرے گروہ شامل ہوتے رہتے ہیں۔ یہ جموں نے چھوٹے دائرے یا جماعتیں کسی ادارے یا حکومت کی جانب سے پیدا نہیں ہوئیں بلکہ ان کی تشکیل انفرادی رہنمائی کے نتیجے میں ہوتی ہے۔ جب یہ جموں وائے آئیں میں ملتے ہیں تو اس مقامات اور پانگت کے نتیجے میں ایک قومی شناخت ابھرتی ہے۔ بعض اوقات انہیں سیاسی و سماجی قوتوں اور طاقتوں کی جانب سے بھی مدد مل جاتی ہے جن میں بادشاہ، امراء، مدعی بدعتیں، فقیہ رہنما اور سیاسی جماعتیں وغیرہ شامل ہیں۔ قومی شناخت کو تشکیل کرنے کا بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ سماج یا معاشرہ کے ان تمام افراد اور گروہوں کو متحد کیا جائے جن کا لوگ ورثہ ایک ہو، جو ایک تاریخی ماحول سے تعلق رکھتے ہوں۔ ثقافتی اتحاد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرہ کے مختلف گروہ آپس میں مل جاتے ہیں اور ان میں جو سیاسی فرقہ بندیوں اور طبقاتی تضادات ہوتے ہیں وہ دب جاتے ہیں اور ایک قوم ہونے کا احساس تمام جذبات پر حاوی ہو جاتا ہے۔

قومی شناخت کی تشکیل میں ادب و شاعر سب سے زیادہ اہم کردار ادا کرتے ہیں، قومی احساس کو ابھارنے اور قومی شعور کو بیدار کرنے کی غرض سے یہ تمام لوگ گیتوں، قصوں، کہانیوں اور دیرالائی تصورات کو تحریر میں لاتے ہیں جو کہ آپس تک لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ اس کے ساتھ ہی ان کی تخلیقات زبان و ادب کو درخیز کرتی ہیں۔ زبان کسی معاشرہ کی پہلی ترقی کی تہیہ دار ہوتی ہے اس لئے جب تک زبان میں ملی و دہلی و لہجہ و موضوعات نہیں آئیں گے اس وقت تک معاشرہ کا ذہنی شعور بھی محدود رہے گا۔

نہ صرف شاعر و ادیب بلکہ مدعی علماء بھی زبان کی ترقی میں حصہ لیتے ہیں، اور مدعی و محدث خاصہ اور مہاجری بھی زبان میں لکھتے ہیں تاکہ عام لوگ ان کی بات سمجھ سکیں۔

جب مقامی زبان میں ادب پیدا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ ہی زبان کے سیر کے لئے

قائمین و قوادح مرتب کئے جاتے ہیں اور لسانیات کے شعبہ میں ترقی ہوتی ہے۔ نئی لغات اور قواعد کی کتابیں لکھی جاتی ہیں۔ محاوروں کے استعمال پر زور دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی یہ تحریک بھی چلتی ہے کہ زبان کو کس طرح سے غیر ملکی عناصر سے پاک کیا جائے اور اس میں خالص قومی زبان کے الفاظ و محاورے جو ماضی میں استعمال ہوتے تھے اور بعد میں حذرک ہو گئے تھے انہیں دوبارہ سے استعمال کیا جائے۔

قومی زبان کو درخیز بنانے کے لئے دوسری زبانوں کی ملی و ادبی کتابوں کے ترجمے کئے جاتے ہیں تاکہ زبان میں آہنی و مسند پیدا ہو کہ اس میں مشکل مضامین کی تشریح کی جاسکے۔ یہ قومی زبان اور اس میں لکھا ہوا ادب مختلف جماعتوں و گروہوں اور علاقوں کے لوگوں کو آپس میں متحد کرتا ہے۔

کسی ملک اور علاقے کے مختلف سماجوں اور لوگ ثقافتوں کو ملانے میں ماہر سیاست اور مورخوں کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ مطالعہ اور تحقیق کے بعد مختلف لوگ ثقافتوں میں باہمی رشتے تلاش کرتے ہیں۔ ماہر سیاست مختلف مسائل اور سماجی گروہوں میں رسم و رواج اور آداب میں مماثلت دریافت کرتے ہیں اور مختلف قبیلوں میں باہمی سماجی آمیزش، تہذیبی لین دین اور سیاسی تعلقات کے نتیجے میں جو ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے وہ اسے ابھار کر دیتے ہیں، جب کہ مورخ تاریخ کے ذریعے سماج کے مختلف طبقوں کو قریب لاتا ہے۔

انسانی معاشرے اپنے ماضی کے سلسلے میں بڑے حساس ہوتے ہیں۔ قہاگ و جماعتوں میں ہونے والا ہر وہ واقعہ جس نے انہیں متاثر کیا ہو وہ ان کی تاریخ اور ماضی کا ورثہ بن جاتا ہے اور یہ ایک نسل سے دوسری نسل میں منتقل ہوتا رہتا ہے۔ اس میں برابر زبان و روایات بھی شامل ہوتی رہتی ہیں، جو اس واقعہ کی تاریخی اہمیت کو گھٹا دیتی ہیں مگر اس میں معاشرے کی اپنی انگلیں اور جذبات شامل ہو جاتے ہیں جو انہیں خوشی و مسرت سے ہلکا کر دیتے ہیں۔ قومی ہے ماضی کو شہرہ بنانے کے لئے دیوالائی قصوں اور تخیلاتی کہانیوں سے مدد ملتی ہے کہ جن کا نامادہ عظیم الشان فضیلتوں اور ہیرو متول قصوں سے ملتا ہے۔

مورخ، اور ماہر سیاست یا علم الاقوام کے ماہر اپنی قوم کی انفرادیت کو اجاگر کرنے کی غرض سے ان کی صفات اور خصوصیات کو ڈھونڈ کر لے جاتے ہیں اور ان کی کو بخش ہوتی ہے کہ وہ اپنی قوم کی خصوصیات کو دوسری اقوام سے برتر ثابت کریں۔ اس تاریخی عمل سے قومی شناخت تشکیل پڑ جاتی ہے اور اس کی ساخت مکمل ہوتی ہے۔

امپیریلزم کیا ہے؟

امپیریلزم کی اصطلاح انگریزی زبان میں 1848ء میں استعمال ہوئی۔ اس وقت اس کا استعمال ان فتوحات کے سلسلے میں ہوا جو فرانس نے چین میں کی تھیں۔ لیکن بعد میں اس اصطلاح میں مزید مستحکم آئی اور یہ ان فتوحات کے لئے استعمال ہونے لگی جو یورپی سلطنتوں نے سمندر پار ملکوں میں کیں تھیں۔ چونکہ یورپی اقوام نوآبادیات کی فتح کو ایک ایسے حربے سے تعبیر کرتی تھیں اس لئے انہوں نے امپیریلزم کو ایسے معنی دینے کی کوشش کی اور اس کا اثر کوئی اکبر نے کی کوشش کی کہ یورپی امپیریلزم دنیا کے لئے باعث فخر ہے اور یہ غیر مذہب و دنیا کو مذہب بنانے کا کام کر رہا ہے۔ مگر یورپی اقوام نے نوآبادیات میں جس جبر و تشدد اور استحصال کی پالیسی پر عمل کیا اس نے ان کے اس دعوے کو بے معنی بنا دیا اور امپیریلزم کی اصطلاح یورپی اقوام کی بوس نکھرت و حوکہ چال بازی اور خونریزی کے لئے استعمال ہونے لگی کہ جس کے ذریعہ انہوں نے نوآبادیات کی اقوام کو غلام بنا کر ان کے ذرائع پر کنٹرول کیا تھا۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد جب امریکہ نے اپنی پالیسیوں کے ذریعہ امپیریلزم کا ایک اور ہمواک اور تاریک رخ پیش کیا تو امپیریلزم پسماندہ ملکوں کے لئے بھوکہ فریخت، نفیس اور جہالت کا ایک اہم سبب بن گیا۔ اس لئے اردو زبان میں اس کے لئے "مقام راج" کا لفظ مستعمل ہوا۔

امپیریلزم کو ہم تاریخی اعتبار سے تین ادوار میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ قدیم امپیریلزم، یورپی امپیریلزم اور نیو امپیریلزم (NEO-IMPERIALISM)۔ تاریخی تسلسل اور تبدیلی میں اس کی ساخت اور فضا میں تبدیلی آتی رہی اور اس کے مقاصد اور مفادات بھی وقت کے ساتھ ساتھ بدلے رہے۔ لیکن ایک چیز جو ان تینوں ادوار میں مشترک رہی وہ اس کا علم و استحصال تھا کہ جس کے ذریعہ امن پسند "مصلح" جو "لور ملوہ عوام کو برباد کیا اور ان کی زندگی کو چاہ و برباد کیا"۔

امپیریلزم کی سادہ سی تعریف اس طرح ہے کہ ایسی فتوحات جو کوئی ملک اپنی سرحدوں سے باہر دوست کی خاطر کسے اور مغلوبہ اقوام کی مرضی کے خلاف اقتدار قائم کرے اور جس کا مقصد فوجی قوت پر عام طور سے سیاسی اقتدار کے علاوہ بھی طاقت ور قوتیں کمزور قوموں کو اپنے اثر رکھنے کے لئے اقتصادی، ثقافتی اور فنی ہتھیاروں کو استعمال کرتی ہیں تاکہ ان کے ذریعہ وہ اپنے مفادات کا تحفظ کر سکیں۔

دماغ قدیم اور جدید وسطی میں طاقتور سلطنتیں اپنی سرحدوں کو وسعت دینے اور کمزور اقوام کو غلام بنانے کا عزم رکھتی تھیں اور ان فتوحات کے لئے بیحد اخلاقی جواز فراہم کرتی تھیں تاکہ معاشرہ کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کر سکیں۔ یہ فتوحات جو حکمران طبقوں کے مفادات کو پورا کرنے کی غرض سے ہوتی تھیں ان کو چھپا کر عوام کے سامنے ان جنگوں کے اخلاقی مقاصد پیش کئے جاتے تھے۔ اور اس سے یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ وہ اس مقصد کے لئے اپنی جان، مال اور دولت سب قربان کر دیں۔ فتوحات کی ایک اہم دلیل جو دی جاتی تھی وہ یہ تھی کہ اس کے ذریعہ اقوام کو مذہب بنایا جائے گا کیونکہ فطرت نے انہیں اعلیٰ اور برتر صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ اس لئے یہ اپنا کائنات ہے کہ وہ دوسروں پر جو ان سے کمزور اور کمتر ہیں ان پر حکومت کریں۔ قدیم زمانہ میں اس کا اظہار یحییٰ اور روم کی سلطنتوں نے کیا تھا۔

ایک مرتبہ جب کوئی سلطنت مضبوط اور مستحکم ہو جاتی اس کے ذرائع تمدنی بڑھ جاتے اس کی فوج بڑھ جاتی ہتھیاروں سے بھر جاتی تو پھر حکمران طبقوں کو مزید زمینوں کی ضرورت ہوتی اور مزید ذرائع تمدنی کی ضرورت ہوتی تاکہ ان کی دولت و طاقت میں اضافہ ہو۔ ایسے موقعوں پر کمزور ممالک کے خلاف جنگیں شروع کی جاتی اور اس کی دلیلیں یہ دی جاتی کہ مرکزی حکومت کا قیام چھوٹی سلطنتوں کے لئے ضروری ہے کیونکہ اس صورت میں وہ خانہ جنگیوں سے بچات پالیں گے ان کی سرحدیں محفوظ ہو جائیں گی اور رعیت سکون و اطمینان سے رہ سکے گی۔

انجمنہ کلیرکس کو کہا کرتا تھا کہ مارے دماغ میں آگ لگتی تھی بلکہ مراعت ہے اس قسم کی دلیل چینی حکمران بھی دہا کرتے تھے جو چھوٹے چھوٹے حکمرانوں کے لئے مرکزی حکومت کو ایک نعمت سمجھا کرتے تھے۔ بعدِ عثمان کی تاریخ میں اس کی مثال مظہر کی حکومت ہے جس نے بہت آہستہ چھوٹی چھوٹی ممالکوں کی خود مختاری ختم کر کے انہیں محل سلطنت میں ضم کر دیا اور اس کی بجائے اپنی دلی کی ان طاقتوں کی رعیت اپنے حکمرانوں کے علم تلے تکلیف میں تھی اور مثل شمشاد نے انہیں اس سے نجات دی۔

ایک طاقتور سلطنت کے استحکام کے بعد یہ تصور پیدا ہوا کہ اسے عالمی اقتدار کے لئے جدوجہد کرنا چاہئے اور یہ اقتدار جب ہی قائم ہو سکا ہے جب کہ دشمنوں سے مسلسل جنگ کی جائے اس لئے ایسی ریاست کو پیشہ جنگ کے لئے تیار رہنا چاہئے اور معاہدوں یا سیاسی تحریکوں، سازشوں اور دوسرے اذیتوں سے اپنے اقتدار کو پھیلانے رہنا چاہئے۔ اس مقصد کے لئے جنگی اہمیت کے اڈے اور علاقے قبضے میں لانا اپنی سرحدوں کو محفوظ رکھنا چاہئے۔ خطوط سرحدوں کی ضرورت اسے ہر جنگ اور ہر فتح کا ایک اضافی جواز فراہم کرتی تھی (جیسا کہ سورجی دور میں اسرائیل کی پالیسی)۔

اقتدار کے پھیلنے اور وسعت دینے میں مذہب نے بھی اہم کردار ادا کیا ہے۔ جو قومیں اپنے مذہب کو اتالی سمجھتی تھیں وہ اس معن کے ساتھ قوموں کو مطلوب کرتی تھیں کہ ان کے اس عمل سے لوگ خلافت و مگرابی سے نکل کر نبیات کی جانب آ رہے ہیں۔ اس لئے حج کے بعد ان کی خوشامد ہوتی تھی کہ سفر حج کو اپنا مذہب اختیار کرنے پر مجبور کریں تاکہ یہ تبدیلی مذہب کے ان پیروکاروں کی تعداد میں اضافہ کر کے ان کی سیاسی قوت و طاقت کو بڑھائے۔

ایک مرتبہ جب امپیریلزم کو اخلاقی جواز مل جاتا تھا تو پھر جنگ کرنا لوگوں کو قتل کرنا ان کا دل واسپاہ ہو جاتا۔ ان کی زمینوں پر قبضہ کرنا، عورتوں کو کیتیزیں، بچوں کو غلام بنانا، سب ہاتھ ہو جاتا تھا۔ اسی لئے قلع فوجیں بنے جن میں قتل و غارت گری، خون ریزی و لوٹ کھسوٹ سے کر پاتی تھیں۔

یہے سوچ پر مذہب کہ کوئی سلطنت عالمی طاقت کی تشکیل کے عمل سے گزر رہی ہوتی تھی اس وقت اس معاشرہ کے شاعر ادیب، مورخ اور فلسفی فتوحات کی شان میں تمغہ دے پڑتے تھے۔ قوم کی ہمدردی و ضیافت و جرات مدنی کے گیت گاتے اور قوی برتری کے قہرے دانسلانے بیان کرتے تاکہ اس ذریعہ سے عوام میں ایک جھڑپ فطرت پیدا کی جائے۔

سلطنت کا پھیلاؤ، وسعت اور فتوحات امپیریل طاقت کے لئے ہزار مسائل پیدا کرتی تھیں۔ نئے علاقوں کا بوجھ، دوسری طاقتوں سے حریفانہ کشش، اندرونی اور بیرونی مسائل کا پیدا ہونا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کے باصلاحیت افراد جو اب تک ایک جگہ مگر ریاست کے نظام کی دیکھ بھال کرتے تھے وہ نئے علاقوں کی فتح کے بعد بکھر جاتے تھے اور دور دراز کے متفرق ملکوں میں بڑے انتظام سمجھ دیے جاتے تھے۔ اور ان کی توانائی، صلاحیت و قوت یہ سب متناہی باشندوں کو دینے اور کچھ میں صرف ہو جاتی تھی اور ان کا اپنا معاشرہ اندرونی طور پر علاقائی و سیاسی اور اقتصادی کمزوریوں کا شکار ہو جاتا تھا۔

تاریخ میں ایسا بھی ہوا کہ امپیریل طاقت خود متفرق اقوام کے ہاتھوں شافی اور تفریق طور پر شکست کھاتی جیسے عربوں نے ایران کو فتح کر لیا مگر بریتوں نے اس فتح کے عمل کے طور پر شہنیت قومیت کے جذبات کے زیر اثر جماعتی انقلاب کے ذریعہ عربوں کے اقتدار کو ختم کر دیا اور عرب۔ جدید اپنی تمام توانائی کو محکم کر کے دوبارہ سے عرب کے ریگستانوں میں چلے گئے اس کے بعد سے اسلامی تاریخ میں عربوں کی جگہ بریتوں اور ترکوں نے لے لی۔ یہی کچھ شکلوں کے ساتھ ہو سکتا ہے وسط ایشیا و ایران فتح تو کرنے مگر تدریجی لحاظ سے خوب ہو کر ان علاقوں میں ایسے نظم ہونے کہ ان کی افرادی شخصیت تک کام پتہ نہیں چلتا۔

امپیریلزم کا ایک اہم اثر یہ ہوا کہ اس نے متفرق علاقوں میں قومیت کے جذبات پیدا کئے اور داقوی روایات و اقتدار جو قدیم و فرسودہ ہو چکی تھیں انہیں غیر ملکی اقتدار کے خلاف دہرا کیا گیا اور ان کی جگہ سے آزادی کی جھنڈیں لڑیں۔ اس کشش میں جس قدر امپیریل طاقت نے سلطنت اقوام پر تشکیل دیں "اسی قدر ان میں جدید حسرت زیادہ پیدا ہوا۔

پندرہویں سے اٹھارہویں صدی تک یورپی امپیریلزم کی تشکیل ہوئی اور برطانیہ، فرانس، ہالینڈ، پرتگال اور اسپین نے امریکہ، ہندوستان اور ایشیا میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ انیسویں صدی میں روس، "غلی" جرمنی اور امریکہ ان کی صف میں شامل ہو گئے اور یہاں جو ایشیا کی ایک طاقت بن کر اتر ایشیا میں بھی امپیریل طاقتوں کے کیمپ میں شریعت اختیار کر دی۔ اس تمام امپیریل طاقتوں نے اپنی وسعت سلطنت، فتوحات اور مال و دولت کی موت، مار و جھڑپ، کتا سے غداقی جو تلاش کئے۔ مثلاً برطانیہ "مید ڈی کا بوجھ" فرانس "مید مدب قوم کو فریسی مذہب سے رہنمائی کرنا" امریکہ "تقدیر کا ظہار" جاپان "شرقی تشریش" و شمالی اقصیہ "روس" جاپان ملوہزم اور جرمنی "پان جرمنزم" کے قائل تھے۔

اس سے اس بات کی کوشش کی گئی کہ امپیریلزم کو کچھ معنی دے جائے اور اس کا یہ مقصد قرار دیا گیا کہ اس کے ذریعہ یورپی قوام و مملکتوں سے عالمی لوگوں کو منظم بنانے کا کام کر رہی ہیں اور امپیریلزم کے درجہ مشرقی تہذیب، عوامی، تکنیکی اور سیاسی کی تہذیب سے ان کو رہنمائی کرنا ہے۔ لیکن عملی طور پر امپیریلزم نے اسے نہ سہی تھے۔ اس نے نہ صلح و صلحہ مشرق میں مقبوض زمینیں جو ملکی اور امپیریلزم جنگ، خون ریزی، استعمار و جارحانہ مداخلت کی شکل میں بھر۔ اور اس مثبت میں لوگوں نے سے جانا اور بچنا۔

1830ء کی دہائی میں انڈونیشیا ویک لینڈ نے امپیریلزم کی حمایت کرتے ہوئے سے برطانیہ کے لئے نازی قوادین کیونکہ برطانیہ کی بدھتی ہوئی آبادی کے لئے مالا زمین کی ضرورت تھی

اگر دائرہ آبادی کو دہاں بنایا جائے۔ اس کی صنعتی پیداوار کے لئے نئی منزلیں کو حاصل کیا جائے اور دائرہ سرمایہ کو مسترد پار ملکوں میں درختیں زمینوں کی خریداری میں استعمال کیا جائے۔ تقریباً ایک خیالات دوسری یورپی ایسٹریل حاکموں کے تھے جو نوآبادیات کے حصوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانا چاہتی تھیں۔

اس مرحلہ پر جے۔ اے۔ ہاسن نے امپیریلزم کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا اور اس کے سماجی و سیاسی پہلوؤں کا تجزیہ کرتے ہوئے 1902ء میں "امپیریلزم۔ ایک مطالعہ" شائع کیا۔ اس کتاب میں اس نے جن خیالات کا اظہار کیا وہ یہ تھے کہ امپیریلزم نظام سرمایہ داری کی پیداوار ہے کیونکہ اس کی وجہ سے، ملوہ کے ناموں اور صنعت کاروں کو نئی منزلیں مل جاتی ہیں جنہاں وہ اپنی اشیاء کو آسانی کے ساتھ فروخت کرتے ہیں۔ سرمایہ داری اور امپیریلزم کے باہمی تعلقات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ دولت کی غیر مساوی تقسیم کے نتیجہ میں سرمایہ اور سرمایہ کاری کا منافع چھ باقیوں میں سمٹ کر رہ جاتا ہے اور اس کے نتیجہ میں لوگوں کی قوت خرید کم ہو جاتی ہے۔ صنعتی پیداوار کی مانگ ملکی منزلیں میں خلق پٹی جاتی ہے۔ اس لئے صنعت کار کو ضرورت ہوتی ہے کہ اس پیداوار کو غیر ملکی منزلیں تک لے جائے۔ اس مقصد کے لئے نوآبادیات کی منزلیں اس کے لئے سب سے عمدہ ممکنہ کاروبار ہوتی ہیں۔ اس لئے ملک میں کم ٹیکسز اہلوں کی شرح "قوت خریداری کا" ہونا پیداوار کی زیادتی جس میں مزید اضافہ خطیوں کی وجہ سے ہوا اس نے سرمایہ کی زیادتی کو پیدا کیا اور اس وجہ سے نئی منزلیں کی ضرورت پڑی اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے امپیریلزم کا سہارا لیا گیا۔

ہاسن کے بعد امپیریلزم کے نظریہ کو بغیر نے بدلتے ہوئے حالات کی روشنی میں ایک نئی بحث دی۔ 1916ء میں اس نے "امپیریلزم۔ سرمایہ داری کی آخری منزل" نامی پمفلٹ لکھا اس سے نوآبادیاتی نظام 'سرمایہ داری اور امپیریلزم کا مطالعہ کرتے ہوئے اس بات کی نشاندہی کی کہ 1860ء تک سرمایہ داری آزادانہ مقابلہ کی حمایت کرتی تھی مگر 1900ء میں یہ آزادانہ مقابلہ کی مخالفت ہو گئی اور اس کی جگہ اجلہ داری آگئی۔ لہذا امپیریلزم نظام سرمایہ داری میں چارہ داری کی ایجاد ہے۔ کیونکہ جب نیکابوئی میں ترقی ہوئی تو نئی صنعتی قوت سے مقابلہ کو ختم کر کے اس کی جگہ اجلہ داری کو مستحکم کیا۔ چھوٹے چھوٹے سرمایہ دار ختم ہو گئے اور ان کی جگہ بڑے اور مرستہ بڑے سرمایہ دار لوہارے بن گئے اور تمام سرمایہ پر ان کا کنٹرول ہو گیا۔ یہاں تک کہ حکومتی ادارے بھی ان کے ماتحت ہو گئے۔

یہ بڑے بڑے سرمایہ دار لوہارے اپنے منافع کو قائم رکھنے کی غرض سے سرمایہ کاری

دوسرے ملکوں میں کرنے لگے کیونکہ اپنے ملک میں سرمایہ کاری سے پیداوار کو بڑھایا جاتا تو اس صورت میں انہیں کم منافع ملے۔ اجلہ داری کی صورت میں یہ نہ صرف ملکی منزلیں سے فائدہ اٹھاتے بلکہ سرمایہ کی زیادہ مقدار کو افریقہ، ایشیاء کی نوآبادیات اور کم ترقی والے ملکوں میں بھیجے گئے۔ سرمایہ کو محفوظ رکھنے اور منافع کی شرح کو بڑھانے کی غرض سے انہوں نے بین ملکوں کی حکومتوں کو اپنے زیرِ اقتدار کر لیا۔ لیکن لکھتا ہے کہ۔

"امپیریلزم ترقی کے اس مرحلہ کی سرمایہ داری ہے جس میں مالیاتی سرمایہ اور چارہ داروں کا غلبہ مکمل ہو چکا ہو۔ سرمایہ کی برآمد واضح اہمیت اختیار کر چکی ہو"۔
جین۔ رافٹی رٹسٹن کے درمیان دنیا کی تقسیم شروع ہو چکی ہو "عظیم سرمایہ دار طاقتیں ساری دنیا کو آپس میں بانٹ چکی ہوں۔ ان منزلیں میں امپیریلزم سرمایہ داری کے ارتقاء میں ایک خاص مرحلہ کی حیثیت رکھتا ہے۔"

مزید وضاحت کرتے ہوئے لیکن لکھتا ہے کہ چونکہ صرف نوآبادیات میں یہ ممکن تھا کہ اس نظام کو قائم کیا جائے۔ اس لئے خام مال اور محفوظ منزلیں کے لئے 1870ء سے یورپ کے صنعتی ملکوں نے نوآبادیات کو حاصل کرنا شروع کر دیا۔ اور دنیا کو تقسیم کر کے آپس میں بانٹ لیا۔ یہ ایسی نوآبادیات کے حصوں اور منزلیں کی ضرورت تھی کہ یورپی طاقتیں پہلی (اور دوسری) جنگ عظیم میں ایک دوسرے سے لڑیں۔

لیکن نے اس امید کا اظہار کیا کہ یہ مالی جنگیں کچلے ہوئے عوام کو سرمایہ داری کے خلاف لے جائیں گی اور اس کے نتیجہ میں سوشلزم کا فروغ ہو گا۔
ہاسن اور لیٹن میں یہودی فرق یہ ہے کہ ہاسن امپیریلزم کو خواہ نظام سرمایہ داری کی وجہ قرار دیتا ہے اور اس لئے اس میں اصلاح کی توقع رکھتا ہے لیکن لیٹن امپیریلزم کو سرمایہ داری کی آخری منزل قرار دیتا ہے جس میں اس کی موت پناہ ہے۔

مورخوں نے سماجی و معاشی کے علاوہ بھی امپیریلزم کی دوسری وجوہات کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہیں۔ ان میں سے اکثریت ان مورخوں کی ہے جو نظام سرمایہ داری کا دفاع کرنا چاہتے ہیں۔ اگر سماجی وجوہات کو امپیریلزم کی بنیاد بنا کر اس میں شامل دوسرے عناصر کا بھی مطالعہ کیا جائے تو اس کو بہتر طریقہ سے سمجھا جاسکے گا۔ لیکن اگر مورخین کی اس دلیل کو تسلیم کر لیا جائے کہ امپیریلزم "غیر حاضر حالی کے جذبہ" کے تحت ہوا۔ اور اس کے پس منظر میں کوئی حکم اور پوشیدہ منصوبہ نہیں تھا تو یہ دلیل بھی محضمانہ ہوگی۔ مورخین جن وجوہات کو امپیریلزم کی بنیاد قرار دیتے ہیں ان میں تجارت، سرمایہ داری اور مذہب جیسے کامل "فنی جذبہ"

قومیت، نسل پرستی، سوشل ڈامین ازم، جنگی ضروریات، قومی وقار، براہ راست ہونی آبادی کی منتقلی، چند افراد کا جذبہ مسم ہونے کی وجہ سے کسی مشورے کے مواقع پر فیصلہ کرتے ہوئے طاقتوں پر قبضہ کر لیا۔ مقامی حکمرانوں کی سازشیں جنہوں نے یورپی قوام کو فتوحات کے مواقع دیے۔ مقامی طاقت کا خاتمہ جسے یورپی اقوام نے پر کیا، پورے مقامی ممالکوں کی مدد جنہوں نے نوآبادیاتی نظام کو کامیاب بنایا۔ اس طرح امپیریلزم کے پیدا ہونے میں معاشی وحدت کے علاوہ سیاسی، ثقافتی، سماجی، نفسیاتی اور جنگی وحدت بھی تھیں۔

کچھ مورخین نے اس پہلو پر بھی بحث کی ہے کہ صرف یورپی اقوام ہی نے مقامی طاقتوں کا استحصال نہیں کیا بلکہ مقامی طاقتوں نے بھی یورپیوں کو اپنے مقاصد کے حصول میں استعمال کیا۔ چونکہ مختلف یورپی طاقتیں آپس میں برسرِ پیکار رہتی تھیں، اس لئے بہت سی مقامی حکومتوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور انہیں اپنے دشمنوں کے خلاف استعمال کیا۔ بعض نے پلوہی کے ذریعہ اپنی خود مختاری کو بھی برقرار رکھا۔

اس میں شک نہیں امپیریل طاقتوں کی کامیابی میں مقامی حکومتوں اور ان کے باشندوں کی کنوریوں بھی تھیں۔ حکمران طبقوں کی بد عزتوں، قومیت کے فقدان اور حکومت و رسمیت میں ادوری نے انہیں فتوحات کے مواقع فراہم کئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوا اور اس کے ساتھ ہی براہ راست امپیریلزم ماضی کا ایک حصہ بن گیا۔ ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ میں آزادی کی تحریکوں نے لوگوں میں قومیت کے جذبات پیدا کر کے ان میں سیاسی شعور کو پیدا کر دیا۔ لیکن آزادی کے بعد بھی نئے آراء و فکروں کے حوام کی فتوحات پوری نہیں ہوئیں۔ کیونکہ اب امپیریلزم ایک نئی شکل اور نئی جیت کے ساتھ وجود میں آ رہا ہے اور ان ملکوں کے حوام کو غربت و افلاس اور مہاجرت میں رکھ رکھا ہے۔ ماضی میں امپیریلزم لوگوں کے سامنے تھا۔ وہ اس کے جز، ظلم و تشدد اور استحصال کے عمل سے بخوبی واقف تھے، اس لئے ان میں رد عمل کے طور پر آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ لیکن نیا امپیریلزم نظروں سے بوجھل اور پوشیدہ ہے اور اس کا اقتدار براہ راست نہیں۔ اس لئے اس کے جہاں استحصال کو عام دیکھ نہیں سکتے اور اس کے خلاف ان میں کوئی حصہ تحریک پیدا نہیں ہوتی۔

نئے امپیریلزم کی بنیاد ممالکیوں کے گرد ہے۔ ممالکیوں کا یہ گردہ ان قوم پرست رہنماؤں میں سے پیدا ہوا ہے جنہوں نے غیر ملکی حکومت کے خلاف حوامی تحریکیں چلائی ہیں۔ آزادی کے بعد یہ پورے، نتیجہ جب اقتدار میں آئے تو انہوں نے نوآبادیات کے ان تمام

امدادوں کو اسی طرح باقی رہنے دیا کہ جن کے ذریعے غیر ملکی حکومت کرتے تھے۔ حوام کو ان کے حقوق دینے کے بجائے انہوں نے آخرت اور جائیداد امدادوں کو قائم کیا اور اپنی مہاجرت اور حیثیت کو محفوظ رکھنے کی غرض سے حوام سے اپنا تعلق توڑ کر نئے امپیریلزم کے جین ڈال دیا۔ امدادوں سے سمجھ کر لیا۔ جس کی وجہ سے ان کے اقتدار کو ختمات مل گئی، اور ان کی حمایت سے نئے امپیریلزم کو ان ملکوں میں پیسے سے زیادہ استحکام حاصل ہو گیا۔ ملی امداد، قرضوں، نیکیا لائی کی منتقلی، خورد سالی و لٹا لٹی چلوں کے ذریعے انہوں نے ان ملکوں کے عوامی و صوبائی معاملات پر مکمل کنٹرول حاصل کر لیا۔ چونکہ یہ نیا امپیریلزم اور اس کے ادارے عوام کی نظروں سے پوشیدہ ہیں، اس لئے ان کے خلاف کوئی شعور عوام میں نہیں پور سکی کسی تحریک کو پیدا ہونے سے روکتا ہے۔ اس لئے حوام اپنا غصہ حکومتوں پر اتارتے ہیں۔ جب ایک حکومت بدنام ہو جاتی ہے تو فوری انقلاب یا محدود انتخابات کے ذریعے یہ دوسری ممالکی حکومت کو اقتدار دلا دیتے ہیں۔ حوام اس تبدیلی سے یہ سمجھتے ہیں شاید ان کے مسائل حل ہو جائیں گے مگر اس کی یہ امیدیں سوچم ثابت ہوتی ہیں۔

اس لئے امپیریلزم کا خاتمہ اس صورت میں ممکن ہے کہ جب تیسری دنیا کے حوام میں سیاسی شعور پیدا ہو اور وہ اپنے ملکوں میں سیاسی و معاشی تبدیلی لا کر حوامی حکومت قائم کریں اور نئے امپیریلزم اور اس کے جین ڈال دینے والے امدادوں سے چھٹکارا پائیں۔

امپیریل ازم کی تعریف

امپیریل ازم کی اصطلاح کا استعمال سب سے پہلے 1848ء میں جرمنی میں ہونے والی امریکی انقلابی تحریک کے لئے استعمال ہوا تھا۔ اس کی ابتدا 1871ء میں جب جرمنی متحد ہوا اور اس نے جرمنی میں سوشلزم کو تسلیم کرنے کے ذریعے دوسرے ملکوں سے علیحدہ کر کے اس کا قیام کیا تو یہ اصطلاح استعمال کی گئی۔ انیسویں صدی میں اس کا استعمال اس سرکاری کاری کے لئے ہوا جو ریاست کی طاقت کے ذریعے دوسرے ملکوں میں کی جاسکے۔ تاہم اور نہیں نے اس اصطلاح کو وسیع معنی میں دیا اور نہیں نے اپنی کتاب "امپیریل ازم سرمایہ داری کی انتہائی اشج" میں اس کی بنیاد معاشی معاملات پر رکھی۔ جس میں دائرہ سرمایہ کاری پس ایچہ اور غیر صنعتی ملکوں ریاست کی طاقت کے ذریعہ کی جاتی تھی۔ موجودہ دور میں صورت حال کی تبدیلی کے ساتھ اب امپیریل ازم کے ساتھ نہ امپیریل ازم کی اصطلاح کو بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ جس کا مقصد یہ ہے کہ چونکہ اب نوآبادیات نہیں رہیں کہ جن پر صنعتی ملکوں کا قبضہ تھا اور جن کی منڈیوں اور خام مال پر، نہیں اختیار تھا آزادی کے بعد صورتحال بدل گئی ہے۔ اس لئے اب سرمایہ کاری ریاست کی طاقت کیساتھ ہی طور پر بڑی بڑی فرموں اور کمپنیوں کی جانب سے ہو رہی ہے اور منڈیوں پر قبضہ اب بلا واسطہ ہوتا ہے جس میں صنعتی ممالک اور بڑی فرمیں ہیں۔ لہذا وہ کرپے معاملات کا قیام کرتی ہیں۔

امپیریل ازم کی اصطلاح میں مزید الجھن اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اسے اور نوآبادیاتی نظام کو ایک جگہ لیا جاتا ہے۔ برطانوی مورخ جب اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں تو وہ اس سے مراد مہارت کی تشکیل سے لیتے ہیں۔ یعنی وہ اصل جس کے ذریعے برطانوی اور فرانسیسی حکومتیں میں دست ہوئی۔ دوسرے یورپی مورخ امپیریل ازم اور نوآبادیاتی نظام کو علیحدہ علیحدہ سمجھتے ہیں۔ جب کہ امریکی مورخ چاہتے ہیں کہ اسے نوآبادیات سے منسوب کر دیا جائے۔ اس تعریف کے بعد وہ امپیریل ازم کی خرابیوں سے اپنا دامن بچا لیتے ہیں کہ انہیں امریکہ نے یورپی اقوام کی مانند نوآبادیاتی نظام قائم نہیں کیا تھا اس لئے وہ اس نظام کی خرابیوں سے بنا دامن پاک و صاف رکھنا چاہتے تھے۔ بلکہ جب نوآبادیاتی ملکوں میں آزادی کی تحریکیں شروع ہوئیں تو امریکہ نے ان تحریکوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا۔ پہلی اور دوسری عالمی جنگوں میں

اس نے جمہوریت، حقوق خود انفرادی، اور امن کے حق کے لئے امریکہ لائیں امریکی ملکوں میں اپنے اندر صرف کو معاشی امپیریل ازم رکھا ہوا اور ان ملکوں میں اپنی دخل اندازی کا اس نے یہ استدلال دیا کہ اس کے ذریعے اس نے ان ملکوں کی سیاست کو مستحکم رکھا اور انہیں انقلابوں سے بچایا۔

امپیریل ازم کی خرابیوں سے بچنے کے لئے کچھ مورخوں نے اسے مختلف خانوں میں تقسیم کر دیا۔ مثلاً کلچرل، ٹیکنالوجی، اور سوشل امپیریل ازم دیکھا تاکہ اس کے ذریعے اس بات کا تاثر دیا جائے کہ اس کا اثر ایک پہلو یا شعبہ میں رہا اور یہ تمام خرابیاں کا ذمہ دار نہیں۔

موجودہ دور میں امپیریل ازم کی مختلف شکلوں کو مختلف اصطلاحات کے ذریعے بیان کیا جاتا ہے مثلاً "نیمو امپیریل ازم" اس تعریف کے تحت کسی ملک پر سیاسی اور معاشی تسلط کو اس صورت میں برقرار رکھا جائے کہ اس میں قبضہ کی ضرورت نہیں آئے اور بغیر قبضہ کے دخل اندازی کے مواقع حاصل کئے جاتے ہیں۔ "ماضی امپیریل ازم" کی صورت میں ملکوں کو مستقل طور پر نوآبادیات کی صورت میں رکھا جاتا ہے۔ جیسے جنوبی افریقہ اور تشریب و میہ۔ "دورِ دخل کے طور پر امپیریل ازم" اس صورت میں جمہوری کی حالت میں آبادیات پر قبضہ کیا گیا اور اس کے پس منظر میں کوئی معاشی وجوہات نہیں تھیں۔ اس تعریف کے تحت نوآبادیات پر قبضہ کے نتیجے میں صنعتی ملکوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا بلکہ انہیں نقصان اٹھانا پڑا۔

امپیریل ازم کے یہ نظریات سرمایہ دار اور صنعتی ملکوں نے پیش کئے تاکہ ان کے ذریعے وہ اپنے اقتدار کو کم کر کے اپنی خرابیوں اور نوآبادیات میں انہوں نے جو بگڑاؤ کر سکتے ہیں اس کا جواب دے سکیں۔

اس کے برعکس ترقی پسند مورخوں نے امپیریل ازم کو ایک تاریخی عمل کی صورت میں دیکھا اور اس کا تجزیہ کیا کہ سرمایہ دارانہ نظام کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ امپیریل ازم کی صورت بھی بدلتی رہی۔ جب سرمایہ داری نظام کا پھیلاؤ ہوا تو اس پھیلاؤ کے دوران مختلف مرحلوں پر مختلف سیاسی حربے استعمال کئے گئے تاکہ سرمایہ کی حفاظت ہو سکے۔ مثلاً ترقی پسند دور انفرادی صدی میں جمہوری (مکاشفہ) اور غلامی کے اداروں کے ذریعے سرمایہ کو بچا گیا۔ دوسرے دور قلعہ جیو پ رہ میں بڑی بڑی تجارتی کمپنیاں (مثلاً اسٹینڈرڈ ایلکٹریک) وجود میں آئیں اور امریکی پوزیشن غریب انڈیا میں افریقہ سے نظاموں کو لے جایا گیا۔ انیسویں صدی میں "آزاد تجارت" کی پالیسی کو اختیار کیا گیا تاکہ کہ یورپ ممالک صنعتی طور پر ترقی یافتہ ہونے تو پھر انہیں سرمایہ کی حفاظت کے لئے ریاست کے قیام کی ضرورت ہوئی۔

مالی جنگ دوم کے بعد جب نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہوا تو امپیریل ازم اور سرمایہ داری ایک اور مرحلے میں داخل ہو گئیں جس میں ریاست اور ملکی کمپنیاں دونوں تیسری دنیا کے ممالک کے ذرائع کا پکا واسطہ طور پر استحصال کر رہی ہیں۔

امپیریل ازم نے تاریخ میں صرف سرمایہ دار طبقہ کو فائدہ پہنچایا ہے اور معذور طبقہ میں بھی اس کا فائدہ اسی طبقہ کو ہوا ہے۔ جیسے اسے ہاسن نے اپنی کتاب امپیریل ازم ایک مطالعہ (1902ء) میں برطانوی امپیریل ازم کے بارے میں کھسا ہے کہ اس سے صرف اقلیت کو فائدہ پہنچا جس میں نوکر شاہی، فوج اور سرمایہ دار شامل ہیں۔ انہوں نے بڑے فوائد کے لئے چاروں قوم کو نقصان پہنچایا۔ اقلیت نے قوم کی وحدت حاصل کرنے کے لئے ایسے نعروں کو اختیار کیا کہ جن کے درپے لوگوں کو بے وقوف بنایا جاسکے۔ ان میں قوم پرستی، ملک کا تختہ، دفاع اور عزت و وقار بچانے کے بات کی جاتی تھی جب کہ درحقیقت اس کے پس منظر میں ان کے مفادات ہمارے تھے۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ جب زائد سرمایہ کو دوسرے ملکوں میں منتقل کیا گیا تو اس کی وجہ سے ملک میں عوام کی فلاح و بہبود کے لئے کام نہیں ہوئے اور عوام کی توجہ ملکی مسائل سے ہٹا کر جارحانہ اقدامات کی جانب کردی گئی۔ جب حالات بدلتے تو پھر سرمایہ داری نظام نے اس بات کی طرف بھی توجہ دی کہ زائد سرمایہ کو اندرونی برقیاتی منصوبوں پر بھی خرچ کیا جائے تاکہ ملکی صورت حال بہتر ہو اور عوام میں بغاوت کے جذبات پیدا نہ ہوں۔ اس لئے پہلی منڈیوں سے بڑے تحاشہ منافع کی صورت میں منظر روں کی مداخلت میں اضافہ کیا گیا۔ اس لئے، "بین" "بین" اور "ایم"۔ اس نے یہ استدلال دیا کہ امپیریل طاقتوں کی قوت چنگ و نوآبادیاتی نظام اور ان کی موت کھسوت ہے اس لئے اگر نوآبادیات آزاد ہو جائیں تو ان کے منافع اور استحصال کی جڑیں کٹ جائیں گی اور اس کے ساتھ ہی امپیریل ازم کا بھی خاتمہ ہو جائے گا ورنہ جب نوآبادیات کے ذرائع وہ خود استعمال کریں گے تو اس سے وہاں کے عوام میں خوشحالی نہ آئے گی۔

لیکن صورت حال بدل گئی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جب یورپ اقتصادی طور پر بد حال تھا تو اس وقت امریکا کو سرمایہ کاری کے مواقع پھر آئے اور اس نے امریکا کے امداد کے ذریعے پورے یورپ کو قوام کو صنعتی بحران سے بچایا اور بحران کے ساتھ مل کر تیسری دنیا کے ملکوں کے استحصال کا پروگرام بنایا۔ اس سلسلے میں ان کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ ان ملکوں میں ایسے منصوبوں کو فروغ دیا جائے جن کی وجہ سے وہ معاشی طور پر ان کا مقابلہ نہیں کر سکیں۔ اس لئے

ان ملکوں میں ایسے منصوبے شروع کرائے جاتے ہیں جن سے ان کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً تیسری دنیا کے ملک اسلحہ پر بے تحاشہ پابندی ختم کر رہے ہیں جو کسی بھی طرح ان کے عوام کے لئے فائدہ مند نہیں۔ ورلڈ بینک "آئی ایم ایف" اور دوسرے اداروں کے ذریعے تیسری دنیا کے ملکوں کو قرضوں میں اس طرح جکڑ دیا گیا ہے کہ اب ان کی خارجہ دواحد اور داخلی پالیسیاں سب مغربی داکٹر کی مفادات کے تحت آتی ہیں۔ یہ اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر خوشحال بدلتے رہتے ہیں اور انہوں نے ملکوں میں اپنے گماشتروں کا ایک ایسا طبقہ تیار کر لیا ہے جو ان کے مفادات کے لئے کام کرتا ہے۔

امریکی امپیریل ازم کی بنیادیں

امپیریل ازم کی اصطلاح کے معنی رقت اور حالات کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ بدلتے رہے ہیں۔ سترہویں دور میں جب کہ نوآبادیاتی نظام کا خاتمہ ہو چکا ہے اور یہ ممالک آزاد اور خود مختار ہو چکے ہیں تو اس تبدیلی شدہ صورتحال میں امپیریل ازم کے طریقوں میں بھی تبدیلی آگئی ہے۔ امپیریل ازم کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ اس میں ایک ریاست شعور کے ساتھ اپنی قومی طاقت و قوت استعمال کر کے اپنی قومی معیشت کو قائم و پختہ کرتی ہے۔ موجودہ حالات میں سب صرف ریاست ہی اپنی طاقت کو استعمال نہیں کرتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس دور میں ملٹی نیشنل کمپنیاں اور قریب اس قدر طاقتور ہو چکی ہیں کہ وہ نہ صرف ریاست کی طاقت کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتی ہیں۔ بلکہ خود بھی ریاست کی دور کے بغیر دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کرتی ہیں اور اپنے سماجی مفادات کو "کے" پر مبنی ہیں۔ اس صورتحال میں یہ نام نہاد آزاد ملکوں کی حکومتوں کو دشمنیں دے کر ان کے سارے اپنے تعفلات کو حاصل کرتی ہیں۔

پہلی اور دوسری جنگوں نے یورپی طاقتوں کو انشائی کنزرو کر دیا جس کے نتیجہ میں امریکہ کو یہ مواقع مل گئے کہ وہ ان یورپی ملکوں کی جگہ اپنا سرمایہ دنیا میں پھیلائے۔ لیکن امریکی امپیریل ازم کی بنیاد انیسویں صدی میں رکھی جا چکی تھی اور آج تک اس کی پالیسی ان ہی بنیادوں پر قائم ہے۔

اس مختصر سے مضمون میں ان حالات و واقعات کا جائزہ لیا جائے گا کہ جب 1898ء میں امریکہ اور اسپین کے درمیان ہونے والی جنگ کے نتیجہ میں امریکی سرمایہ داری کے رجحانات میں تبدیلی آئی اور یہ تبدیلی امریکی امپیریل ازم کا باعث بنی۔ امریکہ اور چین کے درمیان لائسنس امریکی مقبوضات کے سلسلہ میں ہونے والی جنگ کے نتائج کو دیکھتے ہوئے ایک امریکی اخبار ان ویسٹر نے ایک مضمون لکھا۔ "مس کا حقان تھا" جنگ کے تہائی اور ہائی فائنڈ۔" مضمون نگار نے جنگ کے نتیجہ میں امریکی اقتصادیات پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا جائزہ دیتے ہوئے کہا "اس جنگ کی وجہ سے امریکی صنعت کو ترقی ہوئی خصوصیت سے اسلحہ ساز فیکٹریوں کو اور ان

کپڑے کی ملوں کو جنہوں نے فوجیوں کے لئے یونیفارم تیار کی تھیں۔ اس سے ان فیکٹریوں نے بھی فائدہ اٹھایا جنہوں نے فوج کو کھانے پینے کی چیزوں کی فراہمی کا فیکٹریا کیا تھا۔ اس جنگ نے بیوروکریسی کو ختم کرنے میں حصہ لیا اور امریکی معاشرہ میں خوش حالی آئی۔ لہذا امریکی صنعت کی ترقی اور اس ترقی کے نتیجہ میں ہونے والی خوش حالی کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ جنگ کی پالیسی کو جاری رکھا جائے کیونکہ جنگ کی وجہ سے امریکہ کو نئی منزلیاں ملتی رہیں گی اور اس کی صنعت میں برابر ترقی ہوتی رہے گی۔"

جون 1898ء میں اسی اخبار میں ایک اور مضمون شائع ہوا اس میں یہ کہا گیا کہ دنیا کے مسلحی ملکوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنی تیار شدہ اشیاء کے لئے منزلیاں تلاش کریں اور اپنے منافع کو ہر سرمایہ کی شکل میں ان کے پاس ہے اس کی دوسرے ملکوں میں سرمایہ کاری کریں۔ یہ سرمایہ کاری اور ملٹی منزلیاں غیر منصف اور وحشی اقسام میں ہیں گی۔ اس نے اس سلسلہ میں چین کی شکل دی اور اس کی وضاحت کی کہ اگر چین میں سرمایہ کاری کی جائے تو اس کے نتیجہ میں کیا فوائد ہوں گے۔ مضمون نگار نے اس بات کی جانب بھی اشارہ کیا کہ جب امریکہ چین میں اپنی منزلیاں حاصل کرنے کی کوشش کرے گا تو اس کا مقابلہ ان یورپی اقوام سے ہو گا جو پہلے سے وہاں موجود ہیں۔ اس لئے اس مقابلہ کے لئے اسے اپنی قومی و بری فوجوں کو تیار کرنا ہو گا۔

اخبار نے امریکہ کے لئے نوآبادیات کی ضرورت کی طرف توجہ دلائی کیونکہ نوآبادیات صرف تجارتی دلال سے منافع بخش ہوتی ہیں بلکہ جنگی و حربی نقطہ نظر سے بھی ان سے فائدہ ہوتا ہے۔ نوآبادی میں اقتدار قائم کرنے کی بعد جب حکومت یہاں ملے کہیں "بندو گاؤں" قرار دیے بغیر کرتے ہیں۔ نوآبادی کے نظام کو بہتر بنانے کی تو اس کاموں کے لئے سرمایہ داروں کو تھیکے میں گئے۔ نوآبادی کی زراعت اور معدنیات سے فائدہ اٹھایا جائے گا۔ اور جب آگے چل کر یہ ملک ترقی کریں گے اور ان میں قوت خرید پیدا ہوگی تو اس وقت ان کی ضرورت پوری کرنے کے لئے وہاں صنعتی مل کی کمپٹ ہوگی۔ اس کے علاوہ نوآبادی کی انتظامیہ کے لئے اعلیٰ منتظمین اور سفارت کاروں کی ضرورت ہوگی کہ جن پر امریکی تعلیم یافتہ طبقے کا تقرر ہو سکے گا اور اس طرح سے تعلیم یافتہ طبقہ کی ضرورت پوری ہو سکے گی۔

مضمون نگار نے مزید وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ امریکہ اپنے مفادات کا تحفظ زبردست فوجی قوت، مضبوط انتظامیہ اور نوآبادیات کے عوام کی آزادی پر امریکی پینڈیٹنگ کی کر سکتا ہے۔ اس لئے جب امریکہ نے لٹا کا "یو میکسیکو اور اری زونا کی ریاستوں کا الحاق کیا تو اخبار نے

مطابق کیا کہ یہاں لوگوں کو زیادہ آزادی نہ دی جائے۔

1900ء اور 1901ء میں ایک امریکی سوشلسٹ نے امریکی ایمپیرل ازم اور سرمایہ داری کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا کہ پروٹیکشن کی نوادگی کی وجہ سے سرمایہ داروں نے بڑے بڑے ٹرسٹ قائم کر لئے ہیں۔ تاکہ سرمایہ کی حفاظت ہو سکے اور یہ ٹرسٹ اقتصادی، جغرافیائی، کاغذی، کرٹیکس، اس کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ امریکی سرمایہ مختصر ہو گیا ہے اور اب اس بات کی ضرورت سمجھی جا رہی ہے کہ نئی نئی منڈیاں تلاش کی جائیں تاکہ سرمایہ حرکت میں رہے۔ ان منڈیوں کی تلاش کے لئے حکومت کی طاقت کی ضرورت ہے تاکہ اس کی حفاظت میں سرمایہ کمزوری کی جا سکے۔ ری پبلکن پارٹی جو سرمایہ داروں کی ترجمان ہے وہ ایمپیرل ازم کی حمایت کرتی ہے تاکہ زیادہ سرمایہ غیر ملکوں میں لگایا جاسکے۔

1900ء میں ایک امریکی دانشور چارلس ای کوہنٹ نے "امریکہ مشرق میں" کے عنوان سے ایک کتاب لکھی۔ اس میں اس نے امریکی سرمایہ اور اس کے مسائل پر بحث کرتے ہوئے ایمپیرل ازم کی ضرورت پر زور دیا۔ اس کے دلائل کے مطابق تمام صنعتی ملکوں میں سرمایہ جمع ہو گیا ہے اور اب اس سرمایہ کی مزید کسی منافع بخش صورت میں ہی ملکوں میں سرمایہ کاری نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا کی تمام اقوام آزاد تجارت کی پالیسی پر عمل پیرا ہوں تو سیاسی اور فوجی طاقت کے استعمال کی ضرورت نہ ہو اور ہر صنعتی ملک آزادی کے ساتھ اپنی منڈیاں تلاش کرے مگر چونکہ عملی طور پر یہ ناممکن ہے اس لئے منڈیوں کے حصول کے لئے طاقت کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے۔ امریکہ کی اس سطح میں کامیابی کے امکانات اس لئے زیادہ ہیں کہ اس کے ہاں بڑے بڑے صنعتی ٹرسٹ ہیں جو دوسرے صنعتی ملکوں سے تھوڑی بلادیہی کے لئے مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اس لئے امریکہ کے لئے ایمپیرل ازم کو منتخب کرنے کا بہتر کرنے کا سبب نہیں بلکہ یہ اس کی ایک ضرورت ہے جس کے ذریعے اس کے دائرہ سرمایہ کی تلاش ممکن ہے۔

اور امریکی اخبار "سپریمک لیڈر" جو سرمایہ دار طبقہ کی نمائندگی کرتا تھا اس نے سیاسی حالات کی تبدیلی کو ضرور رکھتے ہوئے یہ استدلال دیا کہ اس دور میں (دسویں صدی) نوآبادیات پر قبضہ کرنا مناسب نہیں کیونکہ ملکوں کو فتح کرنا لوگوں پر حکومت کرنا اور ان سے خراج پیتا یہ جاگیردارانہ دور میں ممکن تھا۔ اب یہ نوآبادیات ایک بوجھ بن چکی ہیں کیونکہ قبضہ کی صورت میں انتظامیہ اور دفاع پر کئی خرچ ہو جاتا ہے اس لئے اب قبضہ کرنے کے بجائے ان کو اپنے ذریعہ اثر لاکر یہاں منڈیاں حاصل کی جائیں۔ ان منڈیوں کے حصول کے لئے جن ذرائع کی ضرورت

ہوتی ہے وہ یہ ہیں۔

امپیرلسٹ طاقتیں جدید ترین ہتھیاروں سے مسلح ہوں اور بڑی بڑی فوجیں رکھیں تاکہ ان کے ذریعہ ان کا رعب و دبدبہ قائم رہے۔ یہ سفارت کاموں کو اپنے حلقہ اثر کے ملکوں میں بھیج کر نہیں اس پر توجہ کریں کہ وہ اپنے ملکوں میں منصوبوں کو پورا کرنے کے لئے قرضے طلب کریں۔ جب منصوبوں کو عملی جامہ پہنا جائے تو ان کے ٹھیکے حاصل کریں۔ ہمسامہ ملکوں کو اس بات کا یقین دلائیں کہ وہ اسی وقت قرضے کر سکتے ہیں جب ان کے ہاں مزدوروں، شاہراہوں، پلوں اور ریلوے لائنوں کا جال بچھایا جاسکے ان منصوبوں کے لئے انہیں قرضے فراہم کریں اور اپنے دہریہ کی مدد سے ان منصوبوں کو پورا کرائیں۔ اگر ان ملکوں کو دفاع کی ضرورت ہو تو ان سے دفاعی حلیے کے جائیں اور قرضوں کی دوسوہائی کی غرض سے ان پر فوجی دباؤ لگائے رہتا جائے۔ جن میں سے ایک یہ بھی ہے کہ طاقت ور بحری جہاز ان کے قریب مستعد ہوں میں رہیں تاکہ انہیں اپنے عدم تحفظ کا احساس رہے۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان میں سے اکثر ایسے منصوبے ہوتے تھے کہ جن کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ اور اکثر ایسی ریلوے لائنیں بچھائی جاتی تھیں کہ جن کے راستے میں کوئی ضرورت نہیں گزرتے تھے، سڑکوں کا جال اس طرح بچھایا جاتا تھا کہ صرف بڑے شہروں کے ارد گرد ہوتی تھیں اور ایسے بڑے اہم علاقے جہاں تھے کہ جن کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا تھا۔

امریکی ایمپیرل ازم جس کی بنیاد اسیسویں صدی میں ڈالی گئی تھی اب ایک طاقت ور عمل اختیار کر چکا ہے۔ امریکی حکومت کی خارجہ اور دفاعی پالیسی سرمایہ داری نظام کو برقرار رکھنے اور اسے مستحکم کرنے کے لئے ہے۔ امریکی سرمایہ کاری اب بھی ریاستی طاقت کے ذریعے ہوتی ہے مگر وقت کی تبدیلی کے ساتھ ہی اب امریکی ملٹی نیشنل کمپنیاں بھی طور پر اپنے اوراق کو استعمال کر کے سرمایہ کاری کرتی ہیں۔ ان دونوں صورتوں میں ان کا اختلاف اس میں ہوتا ہے کہ جن ملکوں میں سرمایہ کاری کی جائے ان ملکوں میں عوام کی سیاسی آزادی کو کچل کر رکھا جائے تاکہ عوام ان کے مخالفت کے خلاف آواز نہ اٹھا سکیں۔ اس لئے آمرانہ اور مطلق العنان حکومتیں میں ان کے لئے یہ آسان ہوتا ہے کہ وہ حکمران طبقوں کو مراعات دے کر اور انہیں اقتدار میں رکھنے کی ضمانت دیکر اپنا آلہ کار بنالیں۔ اس لئے تیسری دنیا کے ملکوں میں یہ جمہوریت کے بجائے طاقتور انتظامیہ اور فوج پر بھروسہ کرتے ہیں کہ جن کے ذریعے وہ ان ملکوں میں عوام کا استحصال کر سکیں۔ اس لئے ایمپیرل ازم کی جڑیں صرف اسی صورت میں قائم ہو سکتی ہیں جب عوام میں شعور پیدا ہو اور وہ اپنی حکومت قائم کر کے اپنے مفادات کا فرد تحفظ کریں۔

نوآبادیاتی نظام اور اس کی ابتداء

والتر روڈی

نوآبادیاتی ملک جو پرپ سے آزادی کے بعد بھی ترقی یافتہ رہے؟ اس سوال کا جواب تاریخ کے پس منظر اور حالیہ شواہد کی بناء پر یہ آسانی سے دیا جاسکتا ہے کہ ان نوآبادیات کو آزاد ہونے کے باوجود نیوکونٹیل ازم کے درجہ ترقی سے روکا گیا اور جان بوجھ کر انہیں پسماندگی کی حالت میں رکھا گیا۔

کفر برگ تیسری دنیا کی اصطلاح سے خوش ہوتے ہیں کیونکہ اس کا استعمال تفہیم کے انداز میں کیا جاتا ہے اور اس کا مطلب "تفرڈسٹ" اور "تفرڈکلاس" سے بیا جاتا ہے۔ اگرچہ حقیقت میں یہ اصطلاح دوسری عالمگیر جنگ کے بعد ان ممالک کے لئے استعمال ہوئی جو سیاسی طور پر غیر وابستگی کی پالیسی پر عمل پیرا ہوئے (سرد جنگ کے حوالے سے) اس لحاظ سے یہ اصطلاح عالمی سیاست میں "تیسری طاقت" کو ظاہر کرتی تھی اور اس کا مطلق ایشیا و افریقہ کی مائیزوینی حرکت غیر وابستہ ممالک اور گروپ 77 پر ہوا۔ (غیر وابستہ تحریک 'امن' ہتھیاروں کی کمی' نوآبادیاتی نظام کی مخالفت' آزادی کی تحریکوں اور ترقی کی حمایت کرتی ہے۔ گروپ 77 کو جو بیس تیسویں نے 'تیسری دنیا' کے نام سے پکارا ہے۔) ہر حال ہم تیسری دنیا کی طرف اس طرح سے گریں گے کہ وہ ملک جنہیں غیر ترقی یافتہ ہونے کا یہی تجربہ ہو، پسے ہوئے نوآبادیاتی نظام کے ذریعے اور اس یوگ کوئل ازم کے ذریعہ۔ اس تحریف میں بہت سے بلکہ آجاتے ہیں جس میں ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ساتھ ساتھ آئرلینڈ بھی ہے۔

نسائی تاریخ میں انسان نے اپنی صلاحیتوں کے ذریعہ فطرت کے ذرائع کو استعمال کر کے اپنی بلا کے لئے جدوجہد کی اور آہستہ آہستہ فطری ماحول کو اس غرض سے تعمیر کیا تاکہ وہ غذا، رہائش اور اپنی دوسری ضروریات کو حاصل کرے۔ ابتداء میں ہتھیاروں کی ایجاد کے بعد فتنہ زراعت میں ترقی ہوئی جس کی وجہ سے زندگی کی ضروریات وافر مقدار میں پیدا ہو گئیں اور انسان کا معیار زندگی بڑھتا چلا گیا۔

پوری دنیا میں ابتدائی معاشرہ قبیلوں میں تقسیم تھا اور ان میں جائیداد پر مجموعی طور پر قبضہ تھا۔ مورت کی خاطر برگ کلسوں کو انہیں میں تقسیم کر لیتے تھے اور وہ بھی پیداوار ہوتی اس میں

سب برابر کے شریک ہوتے۔ اگرچہ اس معاشرہ میں اونچ نیچ کا فرق ضرور تھا، لیکن بنیادی طور پر لوگوں کا اپنی محنت اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی پیداوار پر کنٹرول تھا۔

وقت کے ساتھ ساتھ جیسے جیسے پیداوار بڑھی، تاکہ معاشرہ نے خاص خاص شعبوں میں مبادرت حاصل کرلی۔ زراعت کی وافر مقدار نے نہ صرف ان لوگوں کو غذا فراہم کی جو دوسرے پیشوں میں مصروف تھے بلکہ بادشاہوں اور تختیوں کو بھی ان کی بنیادی ضروریات دیں۔ اس کے بعد سے معاشرہ طبقوں اور درجوں میں تقسیم ہو آچلا گیا اور ان میں سے کچھ غلاموں کو استعمال کرنے لگے (جیسے دہلی)۔ اس کی وجہ سے کچھ معاشرے قبائلی نظام سے جاگیردارانہ نظام میں تبدیل ہو گئے۔ لیکن زراعت پیداوار کی بنیاد رہی۔ زمین پر معاشرہ کی ایک اقلیت کا قبضہ ہو گیا جنہوں نے طاقت کے ذریعہ پیداوار کا بڑا حصہ خود ہتھیانا شروع کر دیا۔ اس معاشرہ میں کلسن کا تعلق زمین سے کرنا ہو گیا، لیکن اسے صرف اس قدر ملتا تھا کہ وہ زندہ رہ سکتا تھا اور اس کی محنت کا زیادہ شریک بنیاد کے حصہ میں آجاتا تھا۔

دوسری اہم تبدیلی جو یورپ کے سرمایہ دارانہ نظام میں آئی وہ یہ تھی کہ اب اس میں حچوں کا اضافہ ہو گیا۔ جاگیردارانہ لہجہ کے ناجر اور سوداگر جو کالوں اور ٹیکسٹریوں کی شکل میں سرمایہ دیکھنے لگے طاقت ور ہونا شروع ہوئے۔ مزدور جو اب تک زمین سے متعلق تھا، اس نے اس سے رشتہ توڑا اور اپنی مزدوری سرمایہ دار کے ہاتھوں فروخت کرنا شروع کر دی۔

اس تمام عرصہ میں کچھ معاشرہ نے زیادہ پیداوار کی اور زیادہ دولت جمع کی۔ لیکن اس دولت کو برابر کے ساتھ تقسیم نہیں کیا گیا اور یہ ان لوگوں کے حصہ میں آئی جو ذرائع پیداوار پر قابض تھے۔ ہم یہاں اس بات کو دہانا چاہتے ہیں کہ یورپ نے کس طرح تیسری دنیا کی دولت کو لوٹا اور اس سرمایہ سے یورپ کے لوگوں کو مادی اور حکمران طبقوں کو خصوصی فائدہ ہوا۔

تیسری دنیا کے بارے میں ایک ملحد یہ ہے کہ یہ ترقی پذیر اقوام ہیں، اور ان کی یہ ترقی یورپی ملکوں کے نقش قدم پر ہو رہی ہے۔ اس سے یہ مطلب نکلا ہے کہ تیسری دنیا میں ابتدا ہے اور ترقی کی صورت پر ابتدائی دور میں ہے۔ اس لئے ابھی تک یہ غیر منصفانہ ہے، اسے منصفانہ بنانے کے لئے ملٹی شعبہ کی فنی و سائنسی ایجادات کی ضرورت ہے۔ دنیا کی وادی تاریخ سے چند چٹا ہے کہ ایک زمانہ میں ہم سب ہی غیر ترقی یافتہ تھے، لیکن ان میں کچھ اقوام نے اپنی اعلیٰ ذہانت کی وجہ سے ترقی کی، جبکہ دوسری اس دوڑ میں پیچھے رہ گئیں۔ اس قسم کے جاننا اس خیال کو تقویت دیتے ہیں کہ نوآبادیاتی نظام اپنے ساتھ ترقی کی برکتیں لایا۔ حالانکہ یہ بالکل درست نہیں۔ ابتدائی مسلم سطحوں میں یونانی اور رومی شامل نہیں تھے کیونکہ ان سے

چھری نیگ نور موخرم علی

یہ رہا میں اہلین اور پر کل ان لوہین ملکوں میں سے تھے جنہوں نے لوہا دیوالی نظام کی ابتدا کی۔ شروع میں ضوں نے ہندوستان اور چین کی دولت مند اقوام سے تجارت شروع کی اور سکہ سلسلے اور قیمتی جوہر ت کو سونے و چاندی کے عوض خرید لیا۔ ان کی یہ تجارت شمالی افریقہ کے راستہ سے ہوئی تھی جو کہ طویل اور مشکل تھا کیونکہ راستہ میں عرب، انڈان کے ممالک میں سے جہازات تھے، اس لئے ایک ایسے راستہ کی ضرورت تھی جو پر رہا کو براہ راست مشرق سے ملائے۔

پندرہویں صدی کے بعد سے پرتگیزیوں نے فریق کے مغربی ساحلوں سے سوا "مضامین" وراثت اور نظاموں کی تجارت شروع کر دی۔ 1495ء میں پوپ کے ایک فیصلے نے انہیں ان تمام ممالک کی تجارت کا مالک بنا دیا جو مشرق میں ان کے رابطہ میں آئے تھے۔ 1487ء میں انہوں نے راس امپہ کے گرد پتھر لگا دیا اور 1499ء میں وِسکوفی کا افریقہ کے مشرقی سواحل تک جا چکا تھا اور بحر ہند کے عبور کر کے ہندوستان، ایران اور عرب کے سواحل سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کے بعد وہ آگے بڑھے اور ملائیشیا، فلپائن اور انڈونیشیا تک پہنچے جہاں ان ملکوں میں سواحل کی تجارت پر انہوں نے کنٹرول کر لیا۔ پرتگیزی اور آگے بڑھتے مگر چین اور جاپان کی طاقتوں نے انہیں حد نہیں دینے دی۔

اسی دوران میں سپاہی جو پختگیسریوں کی وجہ سے افریقہ میں اپنے قدم نہیں جھانکتے تھے اور جنہیں یورپ کے لوہن نے ایشیا و افریقہ کے استحصال سے روک دیا تھا اور یہ حق صرف پختگیسیوں کو دیا تھا انہوں نے اپنی توجہ مغرب کی جانب مرکوز کی تاکہ وہاں سالہ جات کی تجارت کا بیج بھریں۔ ۱۶۹۲ء میں کولمبس راستہ کی تلاش میں روانہ ہوا اور کرے میں بڑا بیج لایا اور انہیں "بازنخریب البند" کا نام دیا۔ دوسرے سفر میں وہ اپنے ساتھ ایک سرخ رو کو قید گاروں کو اسلوا توڑا (جو اب چلی اور ڈومینیک ریپبلک سمجھتے ہیں) لے آیا۔ اس شخص نے یہ حاکم یہاں سے سونا حاصل کیا جسے اور ان مذاقوں میں گنے کی کاشت کی جا رہی تھی۔

پہلے چین، بعد ازاں شمالی افریقہ اور مشرق وسطیٰ میں عظیم الشان سطعیں قائم ہو چکی تھیں۔ یورپ کا حملہ آرمینیا، مصر اور حبشہ میں ہوا جب کہ مصر، سیریا اور وادی سندھ کی تہذیبیں 2 ہزار قبل مسیح میں وجود میں آچکی تھیں۔ یہ پڑی پڑی سطعیں تھیں جن کا نظام سلطنت انتہائی مضبوط اور ترقی یافتہ تھا کہ کثرت کاری کے درجہ ضرورت سے زیادہ پیدا کرتا تھا۔ اس کا نظام آبپاشی اعلیٰ سائنسی بنیادوں پر تھا اور یہ اس وقت کاوں سے مہولہ فطرت نکال رہا تھا جب کہ برطانوی جزائر، یورپ کے دوسرے کھیلوں میں لوگ غیر ماہر اور کلچر کے ہتھیاروں سے ہتھیار کر کے لڑ رہے تھے۔

یورپ کے ممالک کا مشرقی خلیجوں سے رابطہ اعلیٰ کے ذریعہ ہوا۔ تیسویں صدی میں اردو
یورپ بنگھڑے سے واپس آیا تو اسے وہاں کی دولت اور تہذیب و تمدن پر لہرستہ چرائی گئی۔
اس وقت یورپ ایشیا کے علاقے میں انقلابی صورت حال پیدا ہوئی اور تجارت اور دست کاری میں
بہت پیچھے تھا۔ چین اور ہندوستان کو بہت کم برقی اشیاء کی ضرورت ہوتی تھی کیونکہ وہ اپنی
ضروریات میں خود کفیل تھے۔

اور یہی بات لاطینی امریکہ اور افریقہ کے لئے درست تھی۔ نیکیوں میں بڑھ کر اور جود میں اتکا دونوں ترقی یافتہ اور متعلقان معاشرے تھے اور ان دونوں معاشرہوں میں وحاشوں اور پھینش اشیاء کا لین دین ہسپانویوں کی آمد سے قبل موجود تھا۔ ولیدی سیاحوں نے جب افریقہ میں چین شریک دست اور متعلق دیکھیں تو وہ حیران رہ گئے۔ اسی طرح جب یورپیوں نے پہلے پس زہلہ سے کے آثار دریافت کئے تو وہ اس قدر حیران ہوئے کہ انہوں نے اس ظہر کو پھیلا کر یہ مفید اقوام کے قہر کہہ دیا۔

ابن سناشیل میں ہر چیز بخلی جلتی تھی وہ امن کی درمی پیدوار کی وافر مقدار تھی جس کی وجہ سے شہر کی گلیوں خوب چمکی اور اس کے نتیجہ میں محنت کی تحسین عمل میں آئی۔ اس سے پہلے چاہے کہ عربی اقوام کی آمد سے قبل یہ ممکن تھا کہ وہاں تیسری دنیا کھلائے ہیں وافر مقدار میں پیداوار کرتے تھے۔ خاص طور سے ایشیا اور وسطی امریکہ کے ممالک۔

یورپی نوکریاؤ کی فحاش کے وہ اثرات ہوئے۔ اول تو اس نے بن ملکوں کی اپنی ترقی کی رفتار کو روک دیا۔ ان کے سرکاری اور ان کی نجی عیدوں اور کان سے چھین لیا۔ اس وجہ سے یہاں کے تمام کی ملائیں متاثر ہوئیں اور ترقی کا عمل رک گیا۔ دوسرے یہ کہ دنیا کے اکثر ممالک اب ساری سرکاری ادارہ نظام کے پیچھے ہیں مگر رفتار ہیں جس کی وجہ سے ان کا مسلسل استحصال ہو رہا

بعد سے ہپ لوی کرے ہیں ہزاروں آباد ہونے کے لئے آئے چلے گئے اور بڑے بڑے امریکہ کی سرزمین پر پہنچ گئے۔

کرے ہیں ہزاروں سے وہ بہت کم دولت حاصل کر سکے یہ ان کے لئے بھرنا تھا۔ اس کی امریکہ کی سرزمین نے پوری کر دی (خصوصیت سے جمہوری اور وسطی امریکہ نے) اس میں انہیں اتنی کامیابی ہوئی کہ انہوں نے ایشیا میں تجارت کی غرض سے پٹنمبریوں سے لڑائی فتح کر دی۔ ہسپانیوں اور پٹنمبریوں کی اجارہ داری کو پوپ کے 1493ء کے فرمان نے نقص کا درجہ دے دیا۔ 1494ء میں ٹورڈے سی را کے معاہدے نے ہر حال کو برازیل کی مملکت سرزمین کے حقوق دے دیے۔ 1521ء میں میگنن نے دنیا کا پھر لگاؤ اور ٹپاؤن کے ہزاروں پر انہیں کے حق کا اعلان کر دیا۔

نوآبادیاتی نظام کے ساتھ ہی غلاموں کی تجارت کی ابتداء ہوئی۔ اس سلسلہ میں ڈانٹریڈی کے لکھا ہے کہ "جس عمل سے افریقہ کی سرزمین سے غلاموں کو حاصل کیا گیا یہ تجارت نہیں تھی بلکہ یہ جنگ، دھوکہ، ڈاکہ اور اغوا کی وارداتیں تھیں۔"

اس تجارت کے اثر سے افریقہ پر چہ کن اثرات ہوئے تقریباً تمام افریقہ کے علاقوں سے غلام حاصل کئے گئے اور مشرق وسطیٰ و شمالی افریقہ اور مغربی افریقہ کے علاقوں کو جاؤ کر مہم کو غیر زنی یافتہ کر دیا۔ آبادی کے ایک بڑے حصہ کو غلام بنانے سے تجارت و کاشت کاری متاثر ہوئی۔ مشرق وسطیٰ و شمالی افریقہ کے علاقوں کو اس عمل نے افریقہ کی آبادی کو صدمہ کر دیا۔ یہ وہ وقت تھا جب کہ انسانی آبادی کی توانائی پیداوار کو بوجھانے کے لئے ضروری تھی۔

آبادی کی شرح

سال	1650	1750	1850	1900
افریقہ	100	100	100	100
ایشیا	103	144	274	423
یورپ	257	437	656	857

اگر برطانیہ یا یورپ کے کسی ملک کے باشندوں کو غلام بنا کر دوسرے ملکوں میں بھیج دیا جاتا تو ان کی محنت و مزدوری سے دوسرے لاتعداد املاک تو ان ملکوں کے لئے زنی کرنا ناممکن ہوتا۔ یہی وجہ تھی کہ افریقہ کی ترقی اس عمل نے روک دی اور اسے آگے چل کر بھی نقصان پہنچا۔

غلاموں کے ساتھ ہر قسم کی زیادتی کی جاتی تھی جس میں مارنا، اذیت دینا اور جسم کے مختلف حصوں کو جلانا شامل تھا۔ ان میں سے بہت سوں نے در عمل کے طور پر بتاؤ تھے بھی کس اپنے ملکوں پر چلے بھی گئے اور غلاموں کو آگ بھی لگائی۔ جب برطانیہ اور فرانسیسیوں نے کرے ہیں کے جزائر کو نوآبادیات بنا لیا اور یہاں پوپ کی ضرورت پیدا کرنے کے لئے شکر کالی اور روٹی کی کاشت شروع کی تو اس مقصد کے لئے غلاموں کی محنت و مزدوری کو استعمال کیا گیا۔ اس پالیسی کے خلاف رد عمل بھی ہوا اور جیٹا کے پھاڑوں میں سبوں نے اپنا آزار و معاشرہ قائم کر لیا۔ اور اہل برطانیہ کو گورنر جنگ میں شکست دیدی۔

ہانچ میں ایک غلام تو سیں لا اور تے غلاموں کی بغاوت کی سربراہی کی اور فرانچس سے لاکر 1804ء میں آزار جسموہ قائم کی۔ غلامی ختم ہونے سے قبل تقریباً 41 بیوی غلاموں کی بچاؤ تھیں ہوئیں۔

ہندوستان میں اہل برطانیہ نے بنگال سے ٹوٹ کھسوت کی ابتداء کی۔ یہ ہندوستان میں لکشاٹل صنعت کا مرکز تھا اور یہاں سے صنعتی اشیاء درآمد کی جاتی تھیں۔ 1857ء میں کلائیو نے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کے ذریعہ یہاں مسلمان حکمرانوں کو شکست دی، اس کے بعد یہاں بوجھوں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ کمپنی کے ہاتھ اپنا کپڑا کم قیمت پر فروخت کریں ورنہ کپڑا بھد میں منگے داسوں پوپ میں جلا جاتا تھا۔ اس روئے کے نتیجہ میں کمپنی نے بنگال کے جزائر کو غلامی کر دیا اور صوبہ کے تمام ذرائع کو چھوڑ لیا۔ انہوں نے تجارتی اشیاء پر ان ایجنسیوں کے وسیع سے بھی انکار کر دیا جو کہ ہندوستانی تاجر دیا کرتے تھے کاشت کاری پر نئے نئے ٹیکس لگائے گئے جس کی وجہ سے کسان غریب ہو گئے۔ جو اہل مال ہونے اس صورت حال پر کھابہ۔

"سیا سی عدم تحفظ اور شکلات' بارش کی کمی اور برطانوی ٹوٹ کھسوت کی پالیسی' ان سب نے ل کر 1770ء میں بنگال و بھار میں بھارتیہ قہ کو پیدا کیا۔ کہا جاتا ہے کہ ان علاقوں سے عین بعد سے زیادہ آبادی ختم ہو گئی۔ ان میں سے ہزاروں بھوک اور قحط سے آہستہ آہستہ موت کا شکار ہوئے۔ علاقے کے علاقے ویران ہو گئے اور ان کی جگہ جنگ پیدا ہو گئے جنہوں نے کاشت کے علاقوں اور گاؤں کو تھل لیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے پاس طاقت اور بڑے دوقوں تھے کہ جن کی مدد سے وہ ان بھوکے لوگوں کی مدد کر سکتے تھے لیکن انہوں نے نہ تو پٹی دہ داری کا احساس کیا اور نہ ہی لوگوں کی مدد کی کوئی خواہش کی۔ ان کا کام صرف دولت جمع کرنا

اور مالہ اکٹھا کرتا تھا اور یہ کام انہوں نے پہلی بحث سے کیا کہ اس بھانک قحط کے پادوسوں سے بچنے والوں سے پورا پورا مالہ وصول کیا جائے اور وہی جمع کیا۔ اور پھر اس کے سرکاری کاغذات سے پتہ چلتا ہے یہ انہوں نے جتنی کے ساتھ کیا۔

الحار ہویں صدی میں "اسپین کی تخت نشینی جنگ" کے نتیجے میں انگریزوں "فرانسیس" اور "ہولینڈ" نے مشترکہ کوشش کے ذریعہ ہسپانوی سلطنت کو ختم کر دیا۔ فرانس نے جب کوشش کی کہ وہ تمام سلطنت کو شرقی وراثت کے قانون کے ارپہہ ہتھیالے، تب کہ انگریزوں اور "ہولینڈ" نے اسے روکنے کی کوشش کی۔ اس میں اسپین اور فرانس کو شکست ہوئی اور "اتریخت" (UTRECHT) کے معاہدہ کے تحت اسوں نے اپنا وسیع علاقہ انگریزوں کو دیا۔ اسی معاہدہ کے تحت انہوں نے شمالی امریکہ کا فرانسیسی حصہ اور غلاموں کی تجارت پر 30 سالہ اجارہ داری حاصل کر دی۔ اس کے بعد فرانسیسی ہندوستان میں پہلے آئے مگر سال بھی ملے، برطانیہ سے انہیں شکست دی۔

اسپین نے "ایٹرنک" کا اور مایا تہذیبوں کو باقاعدگی کے ساتھ تباہ و برباد کیا اور ان کی دولت کو لوٹ کھسوٹ کے اس میں حصہ کر دیا۔ کورنے کی سربراہی میں فاتحین نے ایٹرنک تہذیب کے سولے کے بنے ہوئے خوبصورت مثالی کے کاموں کو بچھا کر اس میں سولے کے ڈھلے میں تبدیل کر دیا۔ انہوں نے خود ہی لوگوں سے سولے اور چاندی کی بنی ہوئی چیزوں کو بچھتا۔ اور انہیں اسپین کی کالوں سے حاصل کیا گیا موز سونا اور چاندی امریکہ سے برسرِ نقل کیا گیا۔ اس کو حاصل کرنے میں امریکہ کے مقامی باشندوں سے بھری محنت و مزدوری لی گئی، یہ وہی 17 آدمی کو مجبور کر کے چٹوٹی کی کالوں میں کام کما دیا گیا۔ ان میں سے اکثر نے کام سے انکار کیا اور اکثر کام کی جتنی سے مرگے۔ تباہی کی اکثریت یورپی غلاموں کی وجہ سے، جن کی ان میں مزاحمت نہیں تھی چپے خسرو اور پیچک موت کا شکار ہوئے۔ اور اس کے نتیجے میں علاقہ کے علاقہ خیر ہو گئے۔ "ہیٹرنک" انکا اور مایا آبادی دس ہزار میں سے گھٹ کر ایک سو پچاس سال میں صرف آدمی میں رہ گئی۔ رہنموی پر قبضہ کرنے کی غرض سے جان بوجہ کر جرائم پھیلائے گئے۔ کریس (CRIS) اور ارواک (ARAWAKS) جو کہہ بین کے رہنے والے تھے، ان کو صلیبی سے مٹا دیا گیا۔ یہی کچھ پگھیسری ہندوستان میں کر رہے تھے، باشندوں کا قتل عام اور انہیں اذیت دینا ان کے مشاغل تھے۔

اس پالیسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ امریکہ کی آبادی اس قدر گھٹ گئی کہ انہیں محنت و مزدوری کیلئے دوسرے ذرائع تلاش کرنا پڑے اور اس مقصد کے لئے افریقہ کو منتخب کیا گیا جہاں سے

سے غلاموں کو برکتہ کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا۔

چودھویں صدی میں افریقہ غلاموں کی تجارت شروع ہوئی اور پگھیسریوں اور سپانوں نے اسے کرے بین تک پھیلایا اور وہاں سے اسے امریکہ لائے۔ اگرچہ پگھیسریوں نے 1690ء تک برائیل میں سونا وراثت نہیں کیا تھا، مگر انہیں گھنے کی کاشت کے لئے غلاموں کی ضرورت تھی۔ کاشتکاری کے روایتی طریقے میں زمین پر لہذا بوجہ والا اس کی مثال برائیل کاشت شرق کا بدلتہ ہے۔ جو بہت درخیز ہوا کرتا تھا، اس کے مکے جنگل، معدنیات اور اس کی مٹی کاشت کے لئے بہت اچھی تھی لیکن پگھیسریوں نے ہزار ہی اس علاقہ کو ختم کر دیا اور یہ علاقہ پٹریٹی اور سخت راج زمین میں تبدیل ہو گیا، یہی حال دوسرے علاقوں میں ہوا جو ان کے قبضہ میں آ گئے تھے۔

برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ نے سلیڈ وراثت گردی کا دوسرا مرحلہ اس وقت شروع کیا جب سوہویں صدی کے آخر میں برطانیہ اور ہالینڈ نے اپنی بحری طاقت کو بڑھایا اور زوال پزیر اسپین اور پرتگال کی سلطنتوں میں سے اپنے لئے علاقے حاصل کرنا شروع کئے۔ "ہولینڈ" نے پگھیسریوں سے ایشیا کی تجارت کو جیت لیا اور ان کی افریقہ سے سولے "فاطمی وراثت" اور غلاموں کی اجارہ داری ختم کر دی۔ انگریزی بحری قواں رہنے اور ایک جن کی ملکہ الزبتھ اول نے سربراہی کی تھی، انہوں نے اسپین کے جہازوں پر حملے کرنا شروع کئے جو امریکہ سے سونا لوٹ مار کے بعد لے جایا کرتے تھے۔ سڑہویں صدی میں انگلینڈ اور فرانس نے شمالی امریکہ کی مین لینڈ پر قبضہ کی طرف توجہ دی، جہاں ہسپانوی آباد نہیں ہوتے تھے۔ یہ سنے آباد کار مغرب کی طرف بڑھتے چلے گئے اور مقامی باشندوں کو بچھے دھکیلتے کئے۔ ان دونوں قوموں نے انہیں اپنی جی جنگوں میں استعمال کیا۔ اس سربہ بھی نقل عام ایک سربہ ہوئی سکیم کے تحت عمل میں آیا۔ انگلینڈ کے بادشاہ جارج سوم کے اعداؤ کے مطابق:-

"ہر مردہ انڈین کے قتل کی شہادت پر اس کی کھوپڑی لانے والے کو چالیس پانچ

— اور ہر مردہ انڈین صورت اور ہاتھ سال سے کم عمر کی کھوپڑی لانے والے کو بیس پانچ میں گئے۔"

آج ہزار ہا غلاموں میں امریکہ کے مقامی باشندوں کے قتل عام کو بڑے فخر سے دکھایا جاتا ہے اور کسی شرم اور شہابی کے بغیر ان کی تعریف کی جاتی ہے۔ امریکہ کے مقامی باشندوں کو تجارت سے روکنا انہیں کہہ کر ہٹا دیا جاتا ہے۔

جیسے جیسے یورپی آباد کار امریکہ میں بڑھتے گئے ایسے ایسے قہار کو پہلے اور نیل کی کاشت

کیے افریقی غلاموں کی ضرورت پڑتی تھی۔ آگے چل کر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے جنوب میں روٹی کی کاشت نے غلاموں کی ضرورت کو اور بڑھا دیا۔ اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے یورپیوں نے افریقیوں کو کلائنگ کے پار غلام بنا کر پہنچانا شروع کر دیا۔ ان تجارتی سرگرمیوں نے یورپیوں کو تین طرح سے فائدہ پہنچایا "غلاموں کو امریکہ میں فروخت کرنا اور ہمارے ملک سے خام مال کے ساتھ واپس یورپ جانا جن میں شکر اور روٹی خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ افریقہ میں یورپ کی تجارت شدہ اشیاء فروخت کرنا اور کم کی ہو گئیں اور بعد میں ان افریقیوں کو دیکھنا جو ان کا ساتھ دیتے تھے۔

غلاموں کی اس تجارت میں وہ افریقی غلام جو زمرہ امریکہ پہنچتے ان کی تعداد ایک لاکھ لڑے کے مطابق ایک سو ملین تھی جب کہ کئی ملین قید کے خلاف حراست کرتے ہوئے یا جہازوں میں پھانسیوں سے مر گئے۔

انٹار میں صدی میں امریکہ میں برطانیہ کے خلاف بغاوت پھیل گئی اور 1783ء میں شمالی امریکہ کی نو آبادیات نے ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے نام سے ایک آزاد مملکت بنالی۔ کچھ عرصہ بعد لاطینی امریکہ بھی انہیں سے آزاد ہو گیا۔ لیکن پورا "ی ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے پہلے پہل اپنا اثر و رسوخ قائم کر لیا۔

سفید آلود کار آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی گئے جہاں انہوں نے مقامی باشندوں سے جنگیں لڑیں تاکہ انہیں دھکیل کر ان کی زمینوں پر قابض ہوں "امریکہ کے مقامی باشندوں کی طرح ان کی جدوجہد بھی آج تک جاری ہے۔

اٹلی، جاپان، پہلے صنعتی انقلاب کے بعد امریکہ "آسٹریلیا" نیوزی لینڈ، "ہندوستان" انڈونیشیا اور بھارتی امریکہ میں آباد ہونا شروع ہو گئے تھے اور یہاں سے جی تو انہیں دولت کی ٹوٹ کھسوت کا عمل شروع ہو گیا تھا۔ غلاموں کی تجارت، انکا اور اینڈرک ٹنڈیوں کی ٹوٹ، جتلی اور دھلی امریکہ کی کانوں میں جبری مزدوری، بھگل میں ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کرنا اور درائع پیداوار طاقت کے رویہ حاصل کئے گئے اور نوآبادیات کو ان میں سے بہت کم دیا گیا۔ اس وجہ سے نوآبادیات ترقی کی لڑائی میں پیچھے رہ گئیں اور یورپ کے لئے یہ دوسرا صنعتی ترقی میں مددگار ثابت ہوئی۔ تقریباً 23 ہزار فن چاندی امریکہ سے انہیں لائی گئی۔ چونکہ چاندی اس وقت ایک معیاری دھات تھی اس وجہ سے اس سے افراد زر کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ مشہور ماہر معاشیات کینز (KEYNES) نے تبہ کو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:-

"ہمارے یورپی اور کم محو کا مطلب لڑاں منافع ہے۔ لڑاں منافع سے زیادہ

بچت ہوتی ہے اور جسے کو سرمایہ لانے کی خواہش ہوتی ہے۔۔۔ اسی امریکہ کی دولت نے یورپی سرمایہ داری کو پیدا کرنے اور فروغ دینے میں مدد کی۔"

لیکن صرف چاندی و چھوٹے تھیں تھے جو یورپ لائی گئی ہو۔ درست ماہر نے ادا ادا لگایا ہے کہ اس تمام ٹوٹ کھسوت کے نتیجہ میں ایک ہزار ملین پاؤنڈ کی قیمت کی اشیاء یورپ لائی گئیں۔ اگرچہ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی وجہ سے یورپی صنعتی انقلاب آیا مگر اس دولت نے اس کی مدد ضرور کی اور اس کے نتیجہ میں یورپ صنعتی سرمایہ کی ضرورت نے دنیا کے دوسرے ملکوں کو اپنا محو بنالیا۔

امپیریلزم کا عہد

یجرری بیک

760ء اور 1840ء کے بعد برطانوی صنعتی انقلاب نے ابھرتے ہوئے صنعتی سرمایہ داری کے نظام کے ذریعہ نوآبادیاتی نظام کو پختہ کرنے میں مدد دی۔ اس دور کی صنعتی ایجادات بہت اہم ہیں جنہوں نے صنعتی عمل کو آگے بڑھایا۔ 1784ء میں ہارگریو (HARGREAVES) نے اسپننگ جینی (SPINNING JENNEY) وائس نے بھاپ کا انجن (1779ء) کرٹ رائٹ (ART WRIGHT) نے وائر فریم (1769ء) کو مشن نے میول (MULB) (1779ء) اور کرٹ رائٹ (CORT WRIGHT) نے پاور لوم (1785ء) ایجاد کئے۔

ڈیوگنٹیم لکھتا ہے:

”ایجادات اور دیباچے اکثر اتفاقیہ اور حادثاتی معلوم ہوتی ہیں۔ اور لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ انھیں صدی میں مشینوں کی ایجادات صنعتی ضروریات کے نتیجہ میں ہوئیں۔ یہ کہنا کہ کرٹ رائٹ اور وائس اس لحاظ سے خوش قسمت تھے کہ حالات ان کے موافق تھے یہ کہہ کر ان کی ذہانت سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔“

محل ایجادی پٹی جگہ اہم نہیں ہوتی بلکہ اہم یہ چیز ہوتی ہے کہ اس کے اشتہال کو فروغ دینے کے لئے اس میں سرمایہ لگا دیا جائے کیونکہ جب تک یہ نہیں ہو گا ایجادات بے عمل رہیں گی اور اس لئے بہت سی ایجادات صدیوں تک بیکار پڑی رہیں اور ان کو استعمال میں نہیں لایا گیا۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ابتدائی دور میں یورپی اقوام کی لوٹ کھسوٹ نے سرمایہ کو حاصل کرنے کے مواقع دیئے بعد میں اس سرمایہ کو ایجادات کی ترقی اور فروغ میں استعمال کیا گیا۔ اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو وائس کے انجن میں ملاہوں کی تجارت کا منافع شامل تھا جس منفع میں سب سے زیادہ انقلابی تبدیلی آئی وہ ٹیکسٹائل کی صنعت تھی۔ انیسویں صدی کے شروع میں برطانیہ میں کپڑا تیار ہونے لگا تھا مگر اس کے مقابلہ میں مشرق کا ہوا کپڑا زیادہ سستا اور اچھا ہو کر آتا تھا اور اس کی کپڑے کی صنعت مشرق سے مقابلہ نہیں کر سکتی تھی۔

اس لئے برطانیہ کو اپنی صنعت کو زخمہ رکھنے کے لئے اس کی حفاظت کی ضرورت تھی۔ اچانک وائس کے بیان کے مطابق

”ہندوستان کا کپڑا برطانیہ کی منڈیوں میں 30 سے 50 فیصد تک برطانیہ کے بنے ہوئے کپڑے کے مقابلہ میں منافع کے ساتھ بیجا جاتا تھا۔ اس لئے اس بات کی ضرورت محسوس ہوئی کہ چنی کپڑے کی صنعت کو بچانے کے لئے ہندوستان کے کپڑے پر 70 سے 80 فیصد تک ایلی ٹیکل چارٹس اور ہاکہ حالات میں اسے بالکل ممنوع کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہیں کیا جاتا تو پائیس (PAISLEY) اور ہامسٹرکی میں شروع ہوتے ہی نہ ہو جاتیں۔“

اس کا اثر ہندوستان کے ساحل پر چلا کھن ہوا۔ اس پالیسی کے تحت نوآبادیات میں سے ایسی تمام صنعتوں کو ختم کر دیا گیا جو ان کی صنعتوں کا مقابلہ کر رہی تھیں۔ جیسا آئرلینڈ والے چاہتے تھے کہ اولی کپڑا عظیم تو ان کی اس کو مشعل کو ایک برطانوی قانون کے ذریعہ روک دیا گیا۔ اور یہی کچھ آج ہو رہا ہے کہ تیسری دنیا کو ایک سو سو کچھ مٹیوں کے تحت غیر صنعتی بنایا جا رہا ہے۔

ایک مرتبہ جب یہ صنعتیں منظم ہو گئیں تو پھر ان کے خطا کی کوئی ضرورت نہیں رہی۔ جب پیداوار زیادہ ہوتی تو اشیاء کی تیاری پر کم لاگت آئے گی۔ اس وجہ سے وہ مصنوعات ختم ہو گئیں جو باقیوں سے تیار کی جاتی تھیں۔ اس موقع پر آئرلینڈ تجارت کی ترویج کی گئی کیونکہ زیادہ اشیاء کی پیداوار کے بعد نئی منڈیوں کی ضرورت احتمال مآزی ہو گئی تھی۔ اس ضرورت کو محسوس کیا جا رہا تھا کہ آئرلینڈ تجارت دنیا کی منڈیوں کو دوست دے گی اور اس کی وجہ سے خاص خاص صنعتوں کو فروغ ملے گا اور پیداوار میں مجموعی طور پر اضافہ ہو گا۔ ہر ملک وہ پیدا کر سکے گا جو اس کے ذرائع کے مطابق ہو گا۔ اس نظریہ کے تحت پالیسی یہ تھی کہ خام مال نوآبادیات سے لیا جائے اور یورپ سے تیار شدہ مال پر کم کیا جائے گا۔ اس کے نتیجہ میں ہندوستان کے کپڑے کی صنعت چاہہ کر دی گئی تاکہ وہ یورپی صنعت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ اس وجہ سے یورپ کو ایک نئی اور بڑی منڈی حاصل ہو گئی۔ افریقہ کی کپڑے کی صنعت کو پہلے ہی یورپ والے ہندوستانی کپڑے کی درآمد کے ذریعے ختم کر چکے تھے۔ بعد میں اس کی جگہ بھی برطانیہ کی صنعت نے لے لی۔

یورپ کے صنعتی انقلاب نے دست کاری اور کاریگری کے فن کو چھوڑ دیا۔ مشینوں کے ذریعہ مال تیار ہونے کے بعد ان کے مال کی قیمت نہیں رہی اور یہ لوگ بھوکا مر گئے۔

یورپ میں تو یہ لوگ فیکٹریوں میں کام کرنے لگے، اگرچہ کام کرنے کا ماحول سخت گندا اور غلیظ تھا، لیکن نوآبادیات کے معاشرہ میں ان ہنرمندوں کے لئے کوئی جگہ نہیں تھی۔ یورپ کو ان نوآبادیات سے صرف خام مال اور غذائی اشیاء کی ضرورت تھی اس لئے وہیں کارنگہ مجبور ہوتے کہ دوبارہ سے کاشت کاری کریں۔ جب کہ برطانیہ میں انیسویں صدی کے درمیان لوگ کاشت سے ریوڑ و فیکٹریوں میں کام کر رہے تھے لیکن ہندوستان اور برازیل میں لوگوں کی اکثریت کاشت کاری میں مصروف تھی اور یہ سب آج تک اسی طرح سے قائم ہے (1970ء) کے بعد اور ہندوستان کے مطابق ریوڑ اسے متحدہ امریکہ دنیا کی صنعتی پیداوار میں تیسرے درجے کا مالک ہے۔ یورپی ممالک تین اکرچہ اب تک صنعتی طور پر طاقت ور ہیں لیکن آہستہ آہستہ یہ کمزور ہو رہی ہیں۔ بیسویں دنیا صرف 1.6 فیصد صنعتی پیداوار کی مالک ہے۔ بیسویں دنیا کی صنعتی ترقی کے لئے وہ سائنس نہیں جو انیسویں صدی میں یورپ کے لئے تھی۔

مصلحتوں کے لئے خن اشیاء کی ضرورت تھی جیسے ربڑ، روئی، سیس (Sisal) اور معدنیات ان کی ترقی اور فروغ کے لئے کوششیں ہوئیں اور تقریباً تمام نوآبادیات کاشت کاری اور کانوں میں تبدیل کر دی گئیں اور ان کو اس قسم کے موقع نہیں دیتے تھے کہ وہ اپنی صنعتوں کو آگے بڑھائیں اور تجارتی طور پر آزاد ہو۔ ان کو مجبور کیا گیا کہ وہ خاص خاص چیزوں کی کاشت کریں جیسے لکڑیوں کو کوکائی، چائے اور ربڑ کی کاشت کرائی گئی۔ ایک ہی قسم کی فصل کی کاشت نے کاشت کاری اور زمین کی طاقت کو مٹا دیا۔ اس کے بعد ان فصلوں کی پیداوار کو دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے منتقل کیا گیا مثلاً بیڑوں سے رہ بیڑوں لایا گیا اور یہاں سے جاپ اور فلپائن لایا گیا۔ کیلا انڈونیشیا سے افریقہ اور وسطی امریکہ میں لایا گیا۔ ان میں سے بہت سی فصلوں کو لٹک کے کیم کاربن کے ارسے تجربہ کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جایا گیا۔

نوآبادیات میں اس قسم کے ٹکس لگائے گئے کہ کسانوں کو اس بات پر مجبور کیا گیا کہ وہ صرف "پیش روپ" کو اپنی زمینوں پر کاشت کریں۔ دوسری فصلوں کو نہ صرف نظر انداز کیا گیا بلکہ انہیں کم زرین زمینوں اور غیر ملکیوں میں کاشت کرایا گیا۔ زمین کو اس بری طرح کاشت کاری کے لئے استعمال کیا گیا کہ اس کی پیداواری قوت ختم ہو گئی اور اس نے "خراکار" بیسویں دنیا کے ملکوں میں قحط کو جنم دیا۔

یورپ کو چین کی منڈیوں کی ضرورت تھی اور یہ وہ صرف طاقت کے ذریعہ حاصل کر سکا تھا۔ چین کو اس وقت تک یورپ کی کسی چیز کی ضرورت نہ تھی کیونکہ وہ اپنی ضروریات کے لئے

ہر چیز پیدا کر لیتا تھا۔ برطانیہ کی ایسٹ انڈیا کمپنی جو چین کی چائے میں دلچسپی رکھتی تھی اس نے دجل اندازی کے موقع تلاش کرنا شروع کر دیے اور اس نے ہندوستان میں تجارت کی ہوئی چین کی کھیت کے لئے تاجرانہ طریقے استعمال کئے۔ ایک مروجہ جب مشینات کی یہ تجارت چین میں قائم ہو گئی تو پھر یورپ کو وہاں دوسری اشیاء فروخت کرنے کے راستے مل گئے۔ 1839ء میں چین کے حکمرانوں نے اس غیر قانونی تجارت کو روکنے کی کوشش کی لیکن انہیں مصلحتوں کی جنگ میں شکست ہوئی اور انہیں اس پر مجبور کیا گیا کہ وہ برطانیہ کو ایک گائیک سمیت پانچ ہزار کھانوں میں تجارتی سہولتیں فراہم کریں۔

یورپ نے نوآبادیات کی پیداوار کو سرمایہ کاری میں استعمال کیا، سرمایہ کمال کے شروع ہونے سے (1869ء) پہاڑ کے انجن کی اور ریلوے کی بنیاد کے بعد یورپی صنعتوں کے لئے منڈیوں کا بے انتہا اضافہ ہو گیا۔ 1912ء تک برطانیہ نے 14 لاکھ ریلوے لائنیں بچھائے، یہ خرچ کیا انہیں نے نوآبادیات کے لوگوں کی لالچ و بہور کے لئے کچھ نہیں کیا۔ انہوں نے اس بات کی بھی کوئی کوشش نہیں کی کہ اندرونی تجارت کو فروغ دیں یا لوگوں کی سہولت کے لئے پبلک ریسپورٹ کو بہتر بنائیں۔ ان کا تمام دھیان اس طرف تھا کہ نئی منڈیوں کیسے حاصل کی جائیں اور خام مال کس طرح سے ریوڑ سے زیادہ لیا جائے۔ اس نے نوآبادیات کی پیداوار کھیتوں سے پیدا ہونے والی پیداوار پر لائی جاتی اور یہاں سے جہازوں میں لا کر انہیں یورپ لے آیا۔

1880ء تک افریقہ کا ایک حصہ نوآبادیاتی نظام کے تحت آیا تھا جس میں کیپ کالونی، بوئر کے حدودی علاقے، الجوزائر اور تونس تھے۔ یورپ کا اثر صرف ساحلی علاقوں تک محدود تھا لیکن یورپ کو اب افریقہ کی ضرورت تھی۔ اس کی زمین کانیں، منڈیوں اور لوگوں کی منت کو وہ اپنی صنعت کے لئے لازمی خیال کرنے لگے تھے۔ اس نے اس صدی کی ابتدا میں افریقہ کی خود مختاری کو منہ بوٹ کی طاقت کے ذریعہ ختم کیا گیا۔ یہ منہ بوٹ اب اس مقصد کے لئے آئی تھی کہ غلامی کی تجارت بند ہوئی چاہئے کیونکہ اب افریقی غلاموں کی منت و مزدوری کی امریکا کو ضرورت نہیں تھی بلکہ اب ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ افریقہ میں رہتے ہوئے ان کے لئے پیداوار کو بڑھائیں۔ فرانسیسیوں نے اوگوے (OGOWE) کی زمینوں پر قحط کیا اور جگہ جگہ چڑیاں بنائیں تاکہ غلاموں کی تجارت کو روکا جاسکے، پھر یہ بڑھتے بڑھتے کاکو کی رادی تک پہنچے، جیسے جیسے یہ بڑھے یہ اپنی تجارتی چڑیاں قائم کرتے اور افریقیوں کی مزاحمت کو کچلتے چلے گئے۔ یہی ذرا افریقہ کے دوسرے حصوں میں بھی ہوئی۔

یورپوں کو اس پلٹ کا احساس تھا کہ جب تک امن و امان نہیں ہو گا تو فرنگی قارئین

کانوں اور تجارت میں ترقی نہیں کر سکی گے اور افریقہ کی دولت کو لوٹنے میں انہیں مشکل ہو گئی۔ اس لئے انہوں نے مشرقی اور جاسوسوں کو پورے افریقہ میں پھیلا دیا تاکہ وہ براعظم کے بارے میں معلومات اکٹھی کریں۔ جب انہیں ملے "لیونگ اسٹون" سے مل کر کیا تو اس نے اعلان کیا:

"ہاگو سے آگے 40 ملین لوگ آباد ہیں اور انہیں کھانے کے کپڑے کے کارخانے اس بات پر تیار ہیں کہ انہیں لباس پہنا دیں۔ برعکس کی جگہوں کے چلوں میں پنا ہوا مسخ لیا سوچو ہے کہ انہیں اوزار فراہم کرے۔ اور حضرت عیسیٰ کے پیروکار بے قرار ہیں کہ ان غریب کافر کو عیسائیت کی آغوش میں لے آئیں۔"

یورپ میں اس وقت تک جرمنی، اٹلی اور انجیم، فرانس اور برطانیہ کی صف میں بحیثیت صنعتی ملکوں کے شامل ہو چکے تھے۔ 1885ء میں یہ برلن میں اکٹھے ہوئے تاکہ ایک معاہدہ کے تحت افریقہ کے حصے بٹانے کے جائیں۔ 1900ء تک وہ افریقہ کے براعظم کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے تقسیم کر چکے تھے۔ برطانیہ اور فرانس چونکہ زیادہ طاقت ور تھے اس لئے انہوں نے زیادہ زمین پر قبضہ کیا۔ ڈارل لوگاریڈ جس نے یوگنڈا اور تانگانیا کو برطانیہ کے لئے فتح کیا اس نے کہا کہ:

افریقہ کی تقسیم جیسا کہ ہم سب جانتے ہیں بنیادی طور پر اقتصادی ضروریات کے لئے تھی تاکہ صنعتی یورپ کی ختم ہل اور نقد کی ضروریات پوری کی جائیں۔" لیکن اس کے ساتھ اور دوسری وجوہات بھی تھیں جن کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔ سول ریڈس جس نے جنوبی افریقہ میں سولے اور تھوہرات کی محل میں پہلی دولت اکٹھی کی وہ 1896ء میں اپنے تاثرات بیان کرتا ہے:

"میں لندن کے مشرقی علاقہ میں تھا۔ وہاں بے روزگاروں کی ایک میٹنگ میں شریک ہوا۔ وہاں میں نے جوشیلی تقریریں سنی۔ لوگ مسلسل مدلی، مدلی، مدلی چیخ رہے تھے کہ وہاں جاتے ہوئے میں نے اس سلسلہ میں غور کیا اس کے بعد سے میں انجیریلزم کے حق میں اور زیادہ ہو گیا۔ میرا خیال ہے کہ اس سلسلہ مسئلہ کے حل کے لئے اور برطانیہ کے چار کورڈ لوگوں کو خانہ جنگی سے بچانے کے لئے ہم لوگ جو کہ (تہذیب کے مدد میں سے ہیں) انہیں اور زیادہ زمین حاصل کرنا چاہئے تاکہ وہاں ہمارے ملک کی کھادی کا ایک حصہ آباد ہو جائے۔ نئی نئی مشیناں مل جائیں تاکہ ہر کچھ ٹیکسٹائل اور کانوں میں پیدا ہو آئے اس کی کھپت ہو سکے۔"

افریقہ میں کو اون، تمباکو، کڑی، شکر، میلا، مانی، موہک، پیل، پام، مکمل، روٹی، کوکو، ریر اور موہک پیل کی پیداوار پر لگا ہوا۔ افریقی صرف ان فصلوں کی پیداوار کے بعد اس قابل ہو سکتے تھے کہ ہلڈ شدہ کھانے دے سکیں۔ پھر تصانیع بھی جدید شروع ہو گئے مثلاً آئرن سٹ کی کوکو پیدا کرتا تھا مگر اسے کوکو اور چاکلیٹ کے ڈبے ورنہ کرنا پڑتے تھے۔ سوڈان روٹی پیدا کرتا تھا مگر کپڑا اسے یورپ سے لانا پڑتا تھا۔ یہ تھی نوآبادیاتی نظام کی منطق۔

اس کے بعد معدنیات کی لوٹ کھسوٹ شروع ہوئی۔ اس سلسلہ میں کانوں کی کھدائی کر کے سونا، تانبہ، "جواہرات"، لٹن، لوہا اور ڈنک کو زیادہ سے زیادہ نکالا گیا۔ یہاں تک کہ ان میں سے کچھ معدنیات کا نوآبادیاتی نظام کے ساتھ ہی بالکل خاتمہ ہو گیا۔ ڈالبرڈیٹی سے واضح طور پر بتایا ہے کہ اس عمل سے کون فائدہ میں رہا۔

"یہ مری بنگ، عظیم کے بعد سے مٹی سے باکسائٹ (BAUXITE) کو لے جایا گیا۔ فرانسیسی اور امریکی سرمایہ دہوں کے ہاتھوں یہ باکسائٹ المینیم بن گئی اور بڑے بڑے صنعتی ملکوں کے شہروں میں اس سے بجلی کا سلسلہ "سکریٹ کے قائل" بدلتی خانے کے برتن، شیشے کا سلسلہ، زیورات کے ڈبے اور امیر کرائٹ میں اس کا استعمال ہونے لگا۔ مٹی کے باکسائٹ کی وجہ سے جہاز رانی میں ترقی ہوئی اور شمالی امریکہ کی ہائیڈرو الیکٹرک پاور کو فروغ ہوا۔ جب کہ مٹی میں نوآبادیاتی دور کی باکسائٹ کی کانوں میں صرف کرے کرے سودا خ باقی رہ گئے۔"

نوآبادیات میں مزدوری کی شرح بہت کم ہوا کہلی تھی۔ 1930ء کی دہائیوں میں تانگانیا میں کوئیلے کی کانوں میں کام کرنے والوں کو دن بھر میں صرف ایک شلنگ ملتا تھا۔ روڈیشیا میں مزدور کو مینے میں 7 شلنگ تنخواہ دی جاتی تھی۔ ظاہر ہے اتنی کم مزدوری پر شرح معاش بہت زیادہ تھی۔ اس لئے سرمایہ دار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ ان ملکوں میں مٹی کی مٹیوں کا استعمال کیا جائے۔

یورپی مداخلت کا ایک اور چہ کن نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے موافق پیداواری طریقے ختم ہو گئے اور افریقی ملکوں کی اپنی تجارت کو زبردست دھچکا لگا۔ کانگو میں انجیم کے بادشاہ یوہا دوم کی تخت پائشی کے نتیجہ میں وہاں کی 20 ملین آبادی میں سال میں صرف 10 ملین روپیہ کی آمد ہو باقی بچے انہیں قحطی کی حیثیت سے رہ پیداکرنے کے لئے کام پر لگا دیا۔ ای۔ ڈی سوریل نے کانگو وادی میں فرانسیسی پالیسیوں پر تبصرو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

مقامی لوگوں کے گاؤں کو جلا "انہیں جسیلی اوتھیں رہنا کوڑے مارنا" ان کی

موجود کی عزت کوٹنا اور نوکریوں کو روکا اور کے لئے لہو و نشانہ استعمال کرنا عام تھا۔

"میں نے جمل کر وہ مزید لکھتا ہے:

"تمام ملک پس گیا اور اب محسوس ہوتا ہے کہ شہرہ سال بہت بڑا مطالبہ کیا ہو۔ وہ علاقے جہاں گنجان آبادیاں تھیں اب بکھرے سے لوگوں کی آبادیاں ہیں۔

تجارتی خوشحالی اور صنعتی ترقی کے بعد اب وہ مکمل بحالت میں ہیں۔"

جیسے جیسے مریلیہ داری بڑھی ویسے ویسے بڑی بڑی کارپوریشنوں نے پھولتی پھولتی کہیں کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا اور اپنی اجارہ داریاں قائم کر لیں۔ "وی پی ٹی ایف افریقہ کہتی (UAC)" کہتی (رائسے ڈی افریقہ)" اور "وی پی ٹی ایف فوٹ کہتی" تھی بڑی کمپنیوں نے نوآبادیاتی دور میں جنم لیا۔

یواسے کی نے یورپ میں صنعت بنانے کا کام شروع کیا تھا اور آخر کار افریقہ میں س نے یورپ اور اس سے اشتراک کر لیا اور یورپی یون کے نام سے کام کرنا شروع کر دیا۔ پام آئل، سائین اور مارگرین ہاکرینی یورپ میں انسانی طور پر ایک بڑی کارپوریشن بن گئی۔

یورپ کی طاقتوں نے افریقہ کے علاقوں انیسویں کے بہت سے ملکوں کو فتح کر لیا تھا اور ان کے کیمپ میں خود کو برابر بھی دیکھتے تھے۔ ان سے آنے والوں میں امریکہ سب سے زیادہ اہم تھا جو ایک صنعتی ملک بن چکا تھا۔ جاپان بھی انقلاب کے بعد صنعت کے میدان میں داخل ہو گیا تھا اور تھوڑا بہت دس بجے ان میں شریک ہو گیا تھا۔ اس لئے اب ان کی لہجوں مزید اور ملکوں کو ہڑپ کرنے پر تھیں 'ان میں خصوصیت سے جنگی سلطنت اور ہینسبرگ (آسٹریا ہنگری) تھے لیکن اب دوسرے ملکوں پر قبضہ اتنا آسان نہیں رہا تھا۔ چار صدیوں کی فتوحات کے بعد دیکھنے کے ملکوں کی سرحدیں بند ہو چکی تھیں اور امپیریلٹ طاقتوں میں حریفانہ کشمکش کی ابتداء ہو چکی تھی، کیونکہ اب طاقتوں پر قبضہ اسی طرح سے کیا جا سکتا تھا کہ یہ ایک دوسرے سے چھینے جائیں۔

اس کیمپ میں نے شامل ہونے والے جرمنی اور اٹلی اپنے حصوں سے خوش تھیں تھے اس لئے جرمنی نے دس گویاں کرتے ہوئے ہینسبرگ اور جنگی سلطنتوں کے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہا۔ جب جرمنی آسٹریا ہنگری اور فرانسیسیوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تو برطانیہ، فرانس اور روس اس سے پریشان ہو گئے اور انہوں نے تھیں میں دھاپ کر کے خود کو "آٹھویں طاقتیں" کہا اور دونوں گروہوں میں اختلاف سے پہلی جنگ عظیم کی ابتداء ہوئی۔ اٹلی، جاپان اور ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اتحادیوں کا ساتھ دیا کیونکہ ان کو سپر تھی کہ اس صورت میں انہیں زیادہ حصہ مل جائے گا اور ہوا بھی تھی کہ جب دوسری یورپی طاقتیں آپس میں مصروف جنگ

تھیں تو جاپان نے چین کے ایک حصہ پر قبضہ کر لیا۔ جب 1917ء میں روسی انقلاب آیا تو روسی فسادات سے علیحدہ ہو گیا اور اپنی ساری توجہ خود کو صنعتی ملک بنانے پر مرکوز کر دی۔

پہلی جنگ عظیم کے نتیجے میں جرمنی، آسٹریا اور ترکی کو شکست ہوئی۔ جرمنی کو نہ صرف اپنی یورپی فتوحات سے ہاتھ دھونا پڑا بلکہ اس کی نوآبادیات پر بھی دوسروں کا قبضہ ہو گیا۔ مشرقی یورپ میں گماشتہ ریاستیں بنائی گئیں اور انہیں اتحادی طاقتوں کے ماتحت کر دیا گیا۔ اٹلی اور جاپان کو بھی اس سے تھوڑا بہت فائدہ ہوا لیکن ان کی ہوس پوری نہیں ہوئی۔ اس لئے دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے جرمنی کا ساتھ دیا تاکہ وہ لوٹ میں لوٹ مال نصیبت حاصل کر سکیں۔ نوآبادیات کے حوام کو ان جنگوں میں بیسہ کہ جس سے وہ لے کر لائیں ان میں بھرتی کر کے فیس ایمرپلٹ آفٹوں نے اپنے فتوحات کی خاطر جنگ کے فصول میں دخل کر کہنا کر دیا۔

اسی دوران ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے براعظم امریکہ میں اپنی اسپائر تشکیل دی۔ صنعتی ترقی کی کامیابی کے بعد جنگی اور جنگی دوستوں کے دوسروں خاندان جنگی شروع ہو گئی۔ شان ریاستیں چاہتی تھیں کہ جاپان کے ذریعہ فارسیں سے غلامی کا خاتمہ کیا جائے تاکہ غلاموں کی آزادی کے بعد فیس اپنی صنعتوں کے لئے سستی مزدوری مل جائے۔ اس کے بعد سے امریکہ کی دوسرے کی خواہشات یورپ کی طرح برہنہ ہو چکی تھیں۔ کیونکہ اسے بھی خام مال کے لئے زیادہ سے زیادہ مٹریوں کی ضرورت تھی 1938ء کی ہسپانوی امریکی جنگ میں 'امریکہ نے فلیپائن' کہا 'بچہ لوریکا' کام اور دوسرے جزائر پر قبضہ کر لیا جو کہ ہسپانوی ریاست کے قبضہ میں تھے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ امریکہ کی خاص آبادی گن بوٹ کی پالیسی کی خلاف تھی، کیونکہ ان کا خیال تھا کہ علاقائی پیملاؤ اور فوجی طاقت امریکی ریاست کے ہاتھوں کے بنیادی نظریات کے خلاف تھی (بیل آگرچہ یہ سوال پوچھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے ٹیکروز اور ریڈ ٹھیکر کے ساتھ جو ظالمانہ سلوک کیا 'اس کے بارے میں ان کی کپڑا رائے تھی؟) اس لئے نوآبادیات کے سلسلہ میں امریکہ نے دوسری اپرہنہ رکھی۔ اس نے فلیپائن کو آزادی کی امید دلائی (1946ء میں جا کر پوری ہوئی) اور لاطینی امریکہ کو دیکھ کر غور پر نہیں بلکہ غیر رسمی طور پر نوآبادیات بنایا۔ تاکہ سامنے آنے کے بجائے چھپ کر ان پر حکومت کی جائے۔

1923ء میں منو نظریے کے تحت 'امریکہ نے لاطینی امریکہ کو بچے حفظہ میں لے لیا۔ بعد میں دوسرے منو نظریے کو تصدیق دیتے ہوئے اس علاقہ میں اپنے اثرات کو اور بڑھا لیا اور پٹی دالالت کے عہد کے لئے اعلان کیا کہ

ہمارے کسی معاشرہ میں ایسی بنیادی غرائی اور بے عملی ہو جو ایک مذہب معاشرہ کو توڑنے کا سبب بنے تو براعظم امریکہ اور دوسرے علاقوں میں مذہب اقوام کی برائیت ضروری اور لازمی ہو جاتی ہے۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ بنو نظریہ کے تحت اس بات پر مجبور ہے کہ لائسنس امریکہ میں بنیادی غریبوں اور بے عملی کی صورت میں بین الاقوامی پرنسپلٹ کو استعمال کرے۔

یورپ اور امریکہ کے درمیان ایک فیروسی معاہدہ ہوا جس کے تحت امریکہ نے وعدہ کیا کہ وہ یورپ کی نوآبادیات کے معاملات میں دخل نہیں دے گا بشرطیکہ یورپ اپنی امریکہ کو اس کے لئے چھوڑ دے۔

امریکہ نے اپنے اثر و رسوخ کو بڑھانے اور لائسنس امریکہ کے ذرائع کا استحصال کرنے کی عرض سے وہاں ایسی فصول کی کاشت شروع کی جس سے جلد ہی کلیا جاسکے۔ اس طرح وطن امریکہ ملک بھی دوسری نوآبادیات کی طرح ہو گئے۔ اگرچہ کہنے کو یہ خود غدار تھے مگر ان کی خود غداری ریاست ہائے متحدہ کی مرضی پر منحصر ہوا کرتی تھی۔ اسی کی پالیسی کے تحت یہاں عکوش برقی ہمارے تھے اس لئے اس نے ایسی تمام قوی تحریکوں کو مٹانی سے کچل دیا جو آزادی کی جدوجہد کر رہی تھیں۔ اس فیروسی اسٹارٹ نے آگے چل کر نیو گولڈن ازم کی بنیاد ڈالی۔

نوآبادیاتی نظام کے علم بردار یہ دعوئی کرتے تھے کہ یہ سلیڈ کوئی کا پوجہ تھا کہ وہ غیر مذہب اقوام کو مذہب بنائے۔ ان کے لئے اسکول، ہسپتال اور دوسرے کی سہولتیں مہیا کرے تو کیا اس نظام نے دنیا کی تہذیب کو فائدہ پہنچایا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اس نظام نے تہذیب کو مکے نہیں دیا اور یہ محض ایک منہ پرست ہے کہ جو اس کے حامیوں نے لوگوں کو یہ قول بنانے کے لئے گھڑا تھا۔

1934ء میں جب کہ برطانیہ ایک خلائی ریاست نہیں بناتا تھا یہاں سائی ہسپتال پر ایک شخص کیلئے 6 پونڈ 0 شلنگ خرچ ہوتے تھے جب کہ نائیجیریا میں ایک شخص پر 2 شلنگ سے بھی کم خرچ کیا جاتا تھا۔ والٹر رینڈل صحت کے اخراجات کے سلسلہ میں لکھتا ہے کہ:

”طہران جو کہ افریقہ کا سب سے زیادہ گنجان آبادی والا شہر تھا وہاں 2 غریب جنگ سے پہلے صرف 50 یورپی تھے، ان پندرہ افراد کے لئے برطانوی نوآبادیاتی حکومت نے 11 ہسپتال کا آرمسٹریڈ ہسپتال علیحدگی کی بنیاد پر قائم کر رکھا تھا جب کہ آرمسٹریڈ میں لوگوں کے لئے 40 ہسپتال کا ایک ہسپتال تھا۔“

اس لئے اس نظام میں جو قہرانی صحت سہولتیں تھیں وہ بڑے شہروں تک محدود تھیں۔

جب کہ ریاستوں میں جہاں سے وہ ذراحت کی پیداوار سے بڑے کھاتے تھے، سہولتوں کا فقدان تھا۔ اس نظام میں خصوصیت سے ایسی تمام ذریعہ اور صنعتی پیداوار جس سے انہیں فائدہ نہیں ہوا تھا انہیں نظر انداز کر دیا تھا۔ والٹر رینڈل نے لکھا ہے کہ:

”موجودہ دنیا اور کسانوں نے یورپی سرمایہ داریوں کے لئے مخصوص قسم کی اشیاء پیدا کیں اور ان کی صحت کا صلہ معقول تھا۔ ان کی شکل میں انہیں ملا۔ انہیں وہ معمولی سہولتیں بھی نہیں دی گئیں جو نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھنے کے لئے ضروری تھیں۔ جب کہ تمام آدمی یہ جھپٹا پتے تھے۔“

اس نظام میں ایک خاص قسم کے فطری نظام کو رائج کیا گیا جو اس کو تقویت دے۔ لوگوں کو اس قسم کے قدرتی گیت اور دعائیہ نغمے یاد کرتے ہوئے انہیں صحت کا غلام بنا دیں۔ ان کا حقانی کلچر اور تاریخ اندازہ سے ہی چلی گئی۔ انہیں صرف اپنے غیر فطری عقائدوں سے محبت کرنا اور ان کی اطاعت کرنا سکھایا گیا۔ افریقیوں سے تو یہ کہا گیا کہ یورپیوں کی آمد سے تمہاری ان کی کوئی تاریخ ہی نہیں تھی اور ان کو کل یورپ سے مذہب بنا دیا ہے۔ ان کے نظام تعلیم نے ایسے چھپے لوگوں کے ہفتہ کو پیدا کیا جو ان کا دھندلا رہا۔ اور ان کے لئے انتظامیہ کے پچھلے محدود پر کام کرتا تھا۔

اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ نوآبادیاتی نظام کی عیسائی سے مخالفت کی گئی مثال 1919ء اور 1926ء میں ہیروئے یونین میں ملے سے ملازمین نے سڑا گئیں تھیں۔ گوڈ کو سٹ میں کوکو کے لاشکاروں نے اپنی فصول کو کل یورپ کے ہاتھوں کم قیمت پر فروخت سے انکار کر دیا۔ مردوں نے بار بار غلامانہ فیکسوں کے خلاف احتجاج کیں۔ دیکھا جائے تو احتجاج کی یہ فہرست بڑی طویل ہے۔ دوسری جنگ عظیم نے یورپی امپائر کے احاطہ کو کمزور کر دیا اور تیسری دنیا کے ملکوں سے آزادی کی آوازیں شدت سے بلند ہونا شروع ہو گئیں۔ ریاست ہائے متحدہ امریکہ نے اس وقت ان تحریکوں کی حمایت کی تاکہ وہ اپنا اثر و رسوخ بچا سکے۔

1949ء میں داؤ نے جینی سے غیر فطری طاقتوں کو باہر نکال دیا۔ ہندوستان نے برطانیہ کو مجبور کیا کہ وہ اسے آزادی دے۔ اس کے بعد سے ایک نیا عہد پیدا ہوا، لیکن جو نقصان تیسری دنیا کو ہونا تھا وہ ہو چکا تھا۔

جن والے ڈولے آزاد دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے، مغرب اور ہٹلر ممالک۔ ان ہٹلر میں سے صرف روس اور جاپان نے نوآبادیاتی نظام کی ممانعت کی اور اپنی آزادی کو برقرار رکھا اور طور بھی صنعتی طاقت بنے۔ دوسرے ممالک یا تو مکمل طور پر نوآبادیاتی نظام کا شکار ہوئے یا

اس سے تھوڑا بہت متاثر ہوئے اور اسی لئے آگے چل کر یہ غیر ترقی یافتہ رہ گئے اور انہیں
لوگوں کو اب تیسری دنیا کہا جاتا ہے۔

مقامی لوگوں کی جدوجہد آسٹریلیا، امریکہ، نیوزی لینڈ

راجہ مرزا

نوآبادیاتی نظام کس طرح سے عمل میں آیا اور کس طرح تین سو سال کے عرصہ میں پانچ
تجارتی علاقوں نے ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے ہوئے سالہ جات حاصل کرنے کے لئے
راسخوں پر کھنڈول کیا، مشہور انسائیکلو پیڈیا بریٹانیکا میں ان علاقوں کے ذکر کا نام کر کے انہیں اپنی نوآبادی بتایا؟
تاریخ کا یہ عمل اب دنیا کے سامنے ہے۔ اس عمل میں ہزار ہا لوگ تباہ و برباد ہوئے اور مثال
باشعوروں نے اپنے ذرائع پیداوار اور اپنے کچھ کو خود چھٹا ہو دیکھا، دریاؤں میں کن تہذیبی کا شکار
ہوئے۔

جن علاقوں کو فنی فتح نہیں کر سکے تھے وہاں پر ہونے کے حلقہ میں 'شکاری' سندھوی شیرے
اور زمینوں پر قبضہ کے خواہش مندوں نے دھاوا بول دیا، زمینوں پر قبضہ کر کے وہاں کے مقامی
باشعوروں کو پیچھے دھکیل دیا جہاں وہ یا تو قافہ سے یا چنگچ، 'جیش'، 'افلو کسٹرا' اور جیسی تاریخوں کی
وجہ سے مر گئے۔ صرف ان علاقوں میں جہاں کہ فتوحات کے اثرات ابتداء میں کم ہوئے وہاں
پر مقامی اور یورپی باشندوں میں مناسبت ہوئی جیسے چین اور ہندوستان۔ ان ملکوں میں صرف
بادشاہوں اور حکمرانوں کی حکومت نے چارے ملک کو مستقر بنا دیا اور وہاں کے پرہیزگار
گورنروں اور بد عنوان انتظامیہ کی جگہ سفید امپریٹلزم نے لے لی۔ بیسویں صدی کے شروع
میں موائے بحران کا ل کے چند حصوں، آرکنگ اور امیڈون کے اندرونی علاقوں کے تمام علاقے
اپنی خود مختاری کو بچے تھے اور یورپی امپریٹلزم کے ماتحت آچکے تھے۔

امپریٹلزم کے اس عمل میں ہر کچھ ظلم و ستم ہوا، اس میں بہت سے دوسرے عوامل کو اب
تک نظر انداز کیا گیا لیکن جدید تحقیق کی روشنی میں یہ کہ مقامی باشندوں کے تعلیم یافتہ طبقے نے
کی اس سے ان کی تاریخ اور کچھ کے لئے نئے پہلو سامنے آئے ہیں جس سے نوآبادیاتی نظام کی
تاریخ کو بہتر طریقے سے سمجھا جاسکتا ہے۔

اس تحقیق سے حیران کن حقیقت جو سامنے آئی ہے وہ یہ کہ مقامی لوگوں نے سفید انعام

سے جنگوں میں جیتی جگتیں ہادیں اسی قدر جنگوں میں انہیں کامیابی ہوئی اور ان حالات میں جب کہ ان کی تعداد بھی کم تھی اور ان کے پاس ہتھیاروں کی کمی تھی مگر اس کے باوجود وہ کم جنگوں میں شکست خوردہ ہوئے۔ انہوں نے گورنر طرفہ جنگ اختیار کرتے ہوئے انگریز آبدیوں پر حملہ کیا۔ شمالی آسٹریلیا کے علاقہ خصوصیت سے کوئٹلینڈ میں مقامی آبادی نے انیسویں صدی تک سفید فام لوگوں سے کوئی تعلقات نہیں رکھے تھے یہاں تک کہ مشنریوں نے ان سے شہاد کے تبادلہ کے ذریعے تعلقات پیدا کیے اور انہیں اوزار، آکا اور تمباکو دے کر ان سے محبت و مروتی کے کام لیتے۔ اس طرح حضرت مسیحی کے پاسی وہاں کامیاب ہوئے۔ جمال کہ بادشاہ کے پاسی باہم ہو گئے تھے۔ ان تعلقات کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسیح سے مقامی لوگ ورتہ شدہ بیماریوں کا شکار ہو کر مرنے لگے۔ اس طرح دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں آسٹریلیا کے بادشاہ سے نقل عام کے ذریعہ نہیں بلکہ عربی بیماریوں کے ذریعہ مرے۔ لیکن یہ کہنا باطل علاقہ ہے کہ مقامی باشندوں میں عظیم نہیں تھی بلکہ ان کا کوئی کچھ نہیں تھا وہ جی نور ملکی دونوں لحاظ سے انتہائی منظم تھے۔" سچ رہتا ہے ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

"مقامی باشندے نہ تو یورپی حوصلوں کے نتیجہ میں خاموش رہے اور نہ ہی سنے سنے والوں کی طور طریق سے بے خبر رہے۔ تاریخی شواہد اس بات کی عکاسی کرتے ہیں کہ ان کا کچھ جادہ، غیر تہذیبی اور خشک نہیں تھا اور ان لوگوں میں حالات کی تبدیلی اور نئے تقاضوں کے تحت بدلنے کا جذبہ اہل یورپ کی طرح سے تھا۔ اپنے کچھ اور روایات کے تحفظ کے لئے انہوں نے تبدیلی کے خلاف مزاحمت بھی کی۔ ان کا معاشرہ اگر ایک طرف بہت زیادہ رخصت پرست تھا تو دوسری جانب اس میں جڑی تعلیمی صلاحیتیں بھی تھیں۔ ایسا نہیں جیسا کہ ہمیں بتایا جا رہا ہے کہ ان کا کچھ خشک و رکھتا ہوا تھا اور اس لئے وہ یورپی اقوام کا مقابلہ نہیں کر سکے اور ان کے مقابلہ میں ٹوٹ پھوٹ کر ختم ہو گئے۔"

جنری رہتا ہے اور دوسرے مورخوں کی روایت جنہوں نے حقیقت سے جو مقامی باشندوں کی تاریخ مدینے آئی ہے اس سے ان کے بارے میں یہ تصور کہ وہ پھر کے لڑنے کے لوگ تھے اور ان کے برائے پیداوار سے محدود تھے۔ اس لئے وہ یورپی اقوام سے بہ آسانی شکست کھا گئے۔ سب ظاہریت ہو گیا ہے تقریباً "پانچویں یا آٹھویں صدی عیسوی میں ان کے وقت اس براعظم میں دور رہے تھے ان میں سے بہت سے بحریں کاشت کار تھیں مگر اور کن کھیتے تھے جو مکالموں میں رہتے تھے، کھیت باڑی کرتے تھے اور ان کی آبادیوں کے ایک دوسرے سے تعلقات

تھے۔ جب سفید لوگ آئے تو انہوں نے ان سے تجارت بھی کی اور ان کی چیزوں کی چوری بھی کی اور ان کے ساتھ تعلقات میں خوشامد و جاہ بازی سے اپنے مقصد کو بھی حاصل کیا۔ اگرچہ ان کا کل عام بھی ہوا اور ہزار مقامی باشندے یورپی اقوام کے ہاتھوں مارے گئے مقامی لوگوں کو اس صدی تک غارت کیا جاتا رہا ہے) لیکن انہوں نے جی جی کے لئے سخت مزاحمت کی اور نئے حملہ آوروں سے مقابلہ کیا۔ 1870ء کی دہائی میں ایک سفید فام اکیسویں صدی کے مقامی باشندوں کے مقابلہ کی تفصیل دی ہے کہ کس طرح سے وہ مسیح مقامی باشندوں نے انہیں دیکھ کر لڑی ہوئی انگریزی میں پکارا "سفید آدمی آگے آگے آگے آگے۔"

"پہلی شخصیت ان کی فوج بڑی سٹارٹن نظر آئی۔ اور مجھے ایسا محسوس ہوا کہ یہ کچھ اچھے اچھے ہیں جو کہ عظیم کے ساتھ ایک قطار میں کھڑے ہیں۔ انہیں ایک دوسرے کے ساتھ ملے ہوئے کھڑے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ قواعد سے پوری طرح واقف ہیں۔"

لیکن مقامی باشندوں کا اس طرح سے مل جل کر رہنا اور ان میں اس قدر عظیم کا ہونا ہی ان کے لئے خطرناک ہوا۔ اس وجہ سے ان میں بیماریاں اس طرح سے پھیلیں جیسے جنگ میں آگ۔ مقامی آبادیوں کو ختم کرنے میں یہ انتہائی اہم عنصر تھا۔ نوکس ہٹ لن (NOEL-BUTTLIAN) نے تحقیق کے بعد اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آسٹریلیا کی فتح کے بعد اس کی آبادی کو صحیح نہیں بتایا گیا اور اعداد و شمار کم کر کے بتائے گئے تاکہ جو نقل ہونے یا نہ ہونے کی چیزوں پر غور کیا گیا ہو لوگ بیماریوں سے مرے۔ ان کی تعداد کم ہو جائے۔ اسی میں نظر میں اگر ہم جنوبی اور وسطی امریکہ کی تاریخ کا جائزہ لیں تو یہ بات واضح ہو گی کہ INCA کی وسیع و عریض سلطنت اس قدر کمزور نہ تھی کہ انہیں کے ملک کی صورت میں فوراً ختم ہو جائے۔ اس بات کے تاریخی شواہد موجود ہیں کہ انہیں قاتلین کو انکا کے نوٹیوں نے شکست دی۔ اور بہت سی بیوقوفوں میں انہیں کامیابی ہوئی۔ اپنی فتوحات میں تقریباً 50 سال صرف ہونے اور اس غرض میں دونوں طاقتوں میں جنگیں بھی ہوئیں۔ سازشوں اور خداری سے ایک دوسرے کو نقصان بھی پہنچایا گیا۔ انکا خاندان کا ایک جانشین انیسویں صدی تک زندہ تھا اور انہیں کی حکومت کے حاکم میں سے تھا۔ اس طرح وہ لوہ کو لہیا کے مقامی انہیں جو کہ انکا سے اپنا رشتہ طالتے ہیں۔ وہ اس وقت جنوبی امریکہ کے سب سے زیادہ پر تشدد کردہوں میں سے ہیں۔

جیسا کہ آسٹریلیا میں بیماریوں نے مقامی آبادی کو ختم کیا۔ اسی طرح امریکہ میں 15 یورپی

تاریخوں کا شمار ہوئے۔ مزید یہ کہ ان کی زمینوں پر قبضہ کر کے انھیں ان کی بنیادی ضروریات سے محروم کر دیا گیا اور ہزار ہا لوگ تہی سچے اور عریض کالوں میں کام کرنے کی وجہ سے مر گئے۔ ان مختلف وجوہات کی وجہ سے 150 سال میں 70 ملین کی آبادی گھٹ کر 4 ملین رہ گئی۔ 1492ء میں ہسپانیہ امریکہ میں 49 ملین لوگ آباد تھے جن میں سے 96 فیصد ابتدائی وہابیوں میں ختم ہو گئے۔ اگر ان مرتے والوں میں ان کو بھی شامل کر لیا جائے جو آگے چل کر 400 سال میں مرتے تو ان کی تعداد 100 ملین ہو جاتی ہے۔ ان میں وہ شامل نہیں جو کھانسی، خسرہ اور انفلوینزہ کی وجہ سے مرتے۔ اس بحث سے ایک بات واضح ہو رہی ہے کہ مقامی لوگ محض یورپیوں کے قتل عام کی وجہ سے تباہ و برباد نہیں ہوئے بلکہ اس میں بیماریوں کا بھی حصہ تھا۔ اس لئے یہ غلط سمجھ نہیں کہ یورپی لوگوں کی بے رحمی اور جرائم نے مقامی آبادی کو قس قس کر دیا۔ انھوں نے یورپیوں کا مقابلہ کیا اور میدان جنگ کے علاوہ مقامی میدان میں اپنی جہاں کی جدوجہد کی اور کامیاب رہے۔

ایک اور اکتشاف جو تاریخی تاریخ کے مفروضے کو مسترد کرتا ہے وہ یہ ہے کہ مقامی قوام نے بہت سی جنگوں میں کامیابی حاصل کی اور یورپیوں کو شکستیں دیں اور ان کی خود مختاری کا خاتمہ یورپی دھوکہ بازی اور قریب کی وجہ سے ہوا۔ انیسویں صدی کے دوران بارہ امریکہ میں جو ریڈ انڈین سے معاہدے ہوئے ان کی تعداد 400 کے قریب ہے اور ان میں سے اکثر معاہدے مساوی جودوں پر ہوئے تھے۔ 1866ء میں فورٹ لارامی (FORT LARAMIE) کا معاہدہ اس کی ایک مثال ہے۔ اس معاہدے میں اس سال کے اندر اندر سیوکس (SIOUX) قبیلہ سے کئی ستاروں کے بعد انھوں نے ذہنی و فنی ترمیمیں کیں۔ اصل معاہدے میں 30 ملین ایکڑ اراضی کی ضمانت دی گئی تھی جو کہ بعد میں آہستہ آہستہ ان سے چھینی جاتی رہی۔ یہاں تک کہ 1862ء کی سیوکس بغاوت کے بعد یہ گھٹ کر صرف 10 میل کے چٹانوں میں رہ گئی۔

1874ء میں پنپا (PAHA SAPA) میں موٹا دریا تہ ہوا تو حکومت نے اس معاہدے کے لئے ایک کمیشن بھیجا کہ اس علاقہ کو خرید جائے۔ اس پر وہیں سخت رد عمل ہوا اور لاکھ قبیلہ نے اسے مار بھاگا۔ اس کے بعد 1876ء میں کسٹر کی مہم انھیں سزا دینے کے فرض سے نکال گئی لیکن اسے مشہور جنگ (LITTLE BIG HORN) میں بری طرح شکست ہوئی لیکن اگلے سال ہی ہیڈن میں غیر قانونی طور پر ایک ہل پاس کر کے زمین پر قبضہ کو جائز قرار دے دیا۔ راستے ٹاری میں صرف 10 قبیلہ نے لاکھ کی حمایت کی۔

ایک مرگ سونچ نے اس سوال کو اٹھایا ہے کہ لاکھ نے کیوں ایک ایسے معاہدے پر

دھوکہ کئے جس میں ان کی زمین ان سے چھین لی گئی تھی۔ لاکھ جنگ میں انھوں نے فتح حاصل کر لی تھی اور ریاست اپنے حصہ امریکہ ان سے امن کا خراب تھا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ لاکھ کوئی نظام اور اس کی تہذیب سے مقامی باشندوں پر جبر کن اثرات ہوئے جن میں ان کے نظام کو نکلے نکلے کر دیا۔

انیسویں صدی میں سیوکس نے سمور کی تہذیب میں صارت حاصل کر لی تھی اور وہ جیسے کی کہانیاں اور اس کی صنعت کی تہذیب منہ قائم لوگوں سے کرتے تھے اور اس کے بدلہ میں ان سے ہتھیار، بندوقیں اور کھانے پینے کی اشیاء خریدتے تھے۔ اس وجہ سے انھوں نے کاشت کاری چھوڑ کر اپنی ساری توجہ پیمینوں کے شکار کی جانب کر دی۔ جنگی کالوں پر ان کا گزارا ہونے لگا اور جن کے بدلہ میں انھیں تیار اور نئی مائی چیریں ملنے لگیں۔

لیکن جیسے جیسے پیمینوں کے گلے کم ہونے لگے 'لاکھ کا انحصار اپنے دشمنوں پر زیادہ سے زیادہ ہونا چلا گیا اس صورتحال کی وجہ سے زیادہ سے زیادہ زمینوں پر قبضہ کیا گیا۔ خاص طور سے 1884ء میں دس کمیشن (DAWAS COMMISSION) نے معاہدہ کو منسوخ کرنے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بعد سے ان ریڈ علاقوں کا بھی کوئی مقدس باقی نہیں رہا جو کہ انتظامیہ نے انڈین کے لئے عہد کر دیتے تھے اور مقصد یہ تھا کہ یہ تاجروں، ریل روڈ کے مالکوں، زرعی فارمرز کے خریداروں اور تیل تلاش کرنے والوں سے محفوظ رہیں اور انڈین مسئلہ کے آخری حل (FINAL SOLUTION) سے محفوظ رہیں۔ لیکن 1934ء میں جب انڈین رکی آرگنائزیشن ایکٹ پاس ہوا تو ان کی زمین غیر قانونی طور پر قبضہ میں لائی جا چکی تھی 150 ملین میں سے 90 ملین ایکڑ زمین پیمین جنگ تھی۔ یہ وہ خاموش قتل عام تھا جس سے مقامی باشندے متاثر ہوئے۔

1930ء کی دہائی میں اگرچہ ان معاہدوں کی حیثیت صرف ایکڈمک قسم کی ہو کر رہ گئی تھی لیکن بعد میں بھی معاہدے انڈین کے انھوں میں موثر ہتھیار ہوئے اور ان کی مدد سے انھوں نے اپنی اپنی پہلی زمینوں کو کمپنیاں اور کالوں کے مالکوں کے ہاتھوں سے بچاؤ۔ کیڑی کے دور میں ان کے پرندہ شکار کی وجہ سے ان کی زمینوں کو بڑبڑ نہیں کیا جا سکا۔ کچھ قبیلوں نے نقدی کی صورت میں اپنے معاہدوں کا معاوضہ وصول کر لیا لیکن لاکھ قبیلہ نے جس کی مدد انگریز کمیشن کو نسل نے کی اس نے مزاحمت کی اور حق خود اختیاری کا مطالبہ کیا۔

یہی صورت حال نیوزی لینڈ میں ہوئی جہاں مقامی باشندوں (MAORI) کے ساتھ کیا گیا

معاہدہ وٹائی (WATTANG) انتظامیہ کے ہاتھوں دو بار منسوخ ہوا اور اس کی خلاف ورزی کی گئی۔ ۱۸۴۰ء میں اسی معاہدہ پر دستخط ہوئے تھے اور یہ ان معاہدوں میں سے تھا جس پر دونوں طاقتوں نے مساوی حیثیت میں دستخط کئے تھے۔ اس معاہدہ میں مقامی باشندوں کو ان کی زمینوں، جنگلوں اور اپنی گیری کے اپنی حقوق دینے گئے تھے۔ اور ایک شرط یہ تھی کہ قبضہ کی صورت میں عریضوں کو پہلے مطلع دیا جائے گا۔ لیکن اس معاہدہ اور اس کی دفعات کو دو بار توڑا گیا۔ جس کے رد عمل کے طور پر مقامی لوگوں نے سفید فام نوٹروں پر حملے کئے، انہوں نے ان حملوں کو بہتے جاکر ان زمینوں پر قبضہ کیا۔ اس کا جانکوا لینے ہوئے ایک مقامی مورخ نے اسے ٹیری ویلیئر (TERRY WILLIAMS) نے جو کہ خود مورخ ہے، بتایا ہے کہ سترہویں زمینوں پر قبضہ کرنے کا ایک سوچا سمجھا اور باقاعدہ منصوبہ بنایا گیا تھا جس کے اندر "ہم کے ہاں" (سفید) برہمن کو قائم کرنا تھا۔

ابتداء میں مشنریوں نے سوڑا اسکے روحانی مفاد پر محض کئے اور ان کا زمین سے جو رشتہ تھا اسے کنٹرول کر لیا۔ 1814ء میں پہلی زمین جو خریدی گئی اس میں 200 ایکڑ کی قیمت ایک درجہ کی کھادوں کی صورت میں ادا کی گئی۔ دیا گئی مہذبہ جیسا کہ دیکھنے سے ظاہر ایک خالی حوزہ اعداد "ہاں" اس کو پورا کرنے کے قطع خواہش مند نہیں تھے۔ لیکن اس کے ذریعہ انہوں نے مقامی لوگوں کے عداوت کو دبا دیا اور جیسے جیسے لوگوں کی تعداد بڑھتی گئی وہ زمینوں پر غیر قانونی طور پر قابض ہوتے گئے۔

۱۸۵۰ء کی دہائی میں نئے آنے والے انگریزی قانون اور بدعنوان عدالتوں کی مدد سے زمینوں پر قبضہ کرتے رہے۔ طریقہ یہ تھا کہ سواری جس میں زمین پر بنائی گئیں گے کا تصور تھا، انھیں بلایا جاتا اور کہا جاتا کہ وہ اپنی زمین میں دس یا بارہ حصہ دار بنائیں۔ ان سے یہ کہا جاتا کہ یہ قبیلہ کے سرخی ہیں لیکن حقیقت میں وہ زمین کے مالک ہوتے تھے جیسے ہی یہ رجسٹر کیا جاتا، زمین پر قبضہ کرنے والے ان افراد کو گھیر لیتے اور ان افراد کا حصہ بڑپ کر جاتے۔ اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا کہ ان معاملات میں سواری عدالت بالکل دخل نہ دے۔ زمین کو کھنڈ میں تقسیم کرنے کے اس عمل سے دور اس پرانے سے کہ سواریوں نے اپنی زمینوں کے سوائے کے اخراجات میں مدد ہیں، زمین دہانوں کے امراء اور ان کی ۵۰۰ زمینوں پر یہ زمینوں کا قبضہ ہو گیا۔

بیسویں صدی کے اندر اندر دستوں پر قبضہ کی جاہ کن بائیسویں صدی اور واضح ہو کر سامنے آئی ۱۹۸۶ء میں ایک انکیت کے ذریعے ایسی دستوں پر جس پر چار سالوں سے حکومتوں کا قبضہ

فخر بخود ان کے ہاتھ ٹکلی گئیں۔ چھ سال بعد ایک اور ٹکٹ کے ذریعہ زمین پر صرف افرادی قبضہ چلتا قرار دیا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ 1950ء اور 1960ء کی دہائیوں میں سوئس پٹی میں بیسیں چھوڑ کر شرمیں آباد ہونے اور غوث کی زندگی اختیار کرنے پر مجبور ہوئے۔ کمال سوئس کی زمینوں پر یا تو قبضہ کر لیا گیا یا جو رہ گئے تھے انہیں مجبور کیا گیا کہ وہ اپنی غذائی ضروریات کے بجائے وہ فلسطینی پیدا کریں جن کی سطحی غلام لوگوں کو ضرورت تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ درگم شدہ بھوک، بھوکا، جراثیم، ٹکس، دواؤں، ٹرانسپورٹ اور اسٹوریج کے لئے ان کے مکانج ہو کر رہ گئے۔ ساتھ ہی ان کا مقابلہ بھی الاقوامی تنظیموں سے تھا۔ اس سے اثر انداز ہونا ہے کہ ایسے معاملے جو مساوی بنیادوں پر ہونے ان کی کس طرح سے خطاب و رزی کی گئی اور کس طرح سے مقامی لوگوں کو دھوکہ دیا کہ ان کی زمینوں پر قبضہ کیا گیا۔

یہ کہنا بھی غلط ہے کہ مقامی باشندوں نے اہل یورپ سے کچھ نہیں سیکھا۔ اس کی مثال چروکی (CHEROKEE) قبیلہ ہے جس نے ۱۸۲۰ء کی دہائی میں انگریز زبان کو لکھنے کی ابتداء کی اور اپنا ایک اظہار بھی چھاپنا شروع کیا۔ اصول ہے اپنے بچوں کو مشنری اسکولوں میں تعلیم کی غرض سے بھیجا۔ اگر ایک طرف چروکیوں کو بھی تعلیم سے دلچسپی تھی تو دوسری جانب مشنری افسرین مطلب جانا چاہتے تھے جب ۱۸۲۰ء کے دوران ریاست جارجیا نے کہ جس کو انگریزوں کی حکومت پرست حکومت کی حمایت حاصل تھی چروکیوں کو غمخوار کیا کہ لوگوں جانا چاہے جائیں (یہ علاقہ اس دور میں بہت سے غریب قبیلوں کی قبرستان تھا) تو اس کے رد میں چروکیوں نے اپنے حقوق کے لئے ایک اہم کام چلائی۔ ایک مورخ کے الفاظ میں

”سفید کوئی سے معاملات میں سہاوی باضمحل کو بدترتیب قسم کے تجاوت ہونے“
چھوٹے کھانے جو رسم چلائی، تو ان کی صلاحیتوں اور جرات سداوت خدمات کی وجہ
سے پوری قوم کی توجہ ان پر مرکوز ہو گئی، انہوں نے بیٹی خوشنور کی سے سفید رائے
عالم کو اپنے حق میں پورا کیا اور سفید کا قانونی نکاح سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔“

جب انہیں اس کے علاقے سے نکالنے کا مسئلہ تو مشنری اس معاملہ میں تقسیم ہو گئے لیکن ان میں سے اکثریت نے عرض کیا "کہا" چھڑائیوں کی حمایت کی "اور ان سفید فام لوگوں کی طاقت کی جو ان کی زمینوں پر قابض ہو رہے تھے لیکن کچھ نے حکم کھانے کا ساتھ دیا اور وہ مشنریوں کو تو مٹی جسدہ میں حصہ لینے کے جرم میں جیل بھیج دیا لیکن ۱۸۵۵ء تک سفید فام نوکریں کی تعداد بڑھ گئی اور ۱۵ ہزار یورپی چرائیکیوں کی زمینوں پر آباد ہو گئے اگرچہ ان کے احتجاج کی وجہ سے انہیں نکالنے کا فیصلہ منظور نہیں ہو سکا اور یہ کچھ دولٹے سرداروں نے اس

معاہدہ کو منظور کر دیا اور 5 سال بعد 14 ہزار لوگوں نے لوکلہا کی جانب پیدل مارچ کیا۔ اس پر نام نہاد "آسوں کے دست" کی برصیت کی مثال درست ہائے ضمیر کی تاریخ میں شکل سے لے لی۔ تقریباً ان کا تیسرا حصہ سردی اور فاقہ سے مرگیا۔ فاقہ کی وجہ یہ تھی کہ حکومت کے فیکے داموں نے کھانے کے راشن خود بڑھ کر لئے۔ یہ ضرور ہوا کہ اس سے چوکی کچھ عرصہ کے لئے لوگوں کے منے سے محفوظ ہو گئے اور انہیں چند سال سکون کے مل گئے۔

لیکن ایسی بھی کئی مثالیں ہیں جن میں مقامی باشندوں اور سفید نوکرانہ میں مفاسد کے اچھے مزاج ٹکے "دونوں نے ایک دوسرے سے جو سیکھا جن تجلیات سے دونوں معاشروں میں صحت مند روایات کا ارتقاء ہوا۔ پائپر کا کونا (CUNA) ان قباہل میں سے ہے جو ایتھن کی فحاشات کے بعد بھی باقی رہا لیکن یہ اس سے واپس ہوا کہ اس نے پائپر سے کمر ہین کے ساحلوں میں ہجرت کر لی اور اس طرح ایتھن کا تھین کے قتل عام سے بچ گیا۔ جنوں نے فرانسیسی اور انگریز بحری قوتوں سے رابطہ قائم کیا اور 1925ء میں پائپر کی پولیس فورس کو شکست دیکر سالہاں کے جرم سے میں اپنی آزادی حکومت قائم کر دی۔ اس کے مقابلہ میں مسی رینے (CIBONY) اور کراس (CRIBS) کا محملہ مختلف ہے۔ جنوں بھی ان کا قبضہ تھا۔ وہاں اب ان کی نسلیوں کے کچھ بچے چلے لوگ باقی رہ گئے ہیں۔

کینڈا اور الاسکا کے انوٹ نیسوں میں صدی تک محفوظ رہے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جب فوجی کاروائیوں کی غرض سے شمال کے راستے کھل گئے تو سم جھڑوں اور مشنزوں کا سیلاب ان علاقوں میں آگیا۔ الاسکا میں تیل کی دریافت کے بعد سے مقامی لوگوں کو کارپوریشنوں سے راشن ملنے لگی یہ بھی تاریخ کا ایک الوکہ واقعہ ہے) ایک انیسویں صدی کے بھلی دھانیوں میں جو تبدیلی آئی اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ:

"پچھلے زمانہ میں ہمارے لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے پر مجبور تھے جیسے تھے لیکن پھر وہ ایک جگہ آباد ہو گئے اور مکانات بنا کر مستقل طور پر رہنے لگے۔ اسوں نے پھنسیاں پکڑنا اور ہرن کا شکار کرنا شروع کر دیا" اب ان کی حیثیت انیسویں لگے کی رہی جو مسلسل متحرک رہتے تھے لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اب ہم ایک قوم نہیں رہیں گے، شکاریوں مشنزوں اور سونے کی تلاش میں آنے والوں نے ہمیں مشربہ زلف اور سبز لباس کے عجیب و غریب نام دے دیئے ہیں جو ہماری شناخت کو ختم کر رہے ہیں۔"

سولہ آرتکک میں جنوں اس قبیلہ کے لوگ رہتے تھے اور چکا لکچر 1920ء سے منظم

طریقہ سے ختم کیا جا رہا ہے" ان میں سے بہت سوں کو اب اپنے انوٹ ہونے کے بارے میں پتہ تک نہیں۔ لیکن اب صورت حال بدل گئی ہے "مقامی باشندے الاسکا میں پیدائشی ذرائع پر کنٹرول رکھتے ہیں۔ گرین لینڈ کے انوٹ ڈنمارک سے تھیں خود مختاری کے حصول کی کوشش کر رہے ہیں۔ انہوں نے یورپیئم کی کٹوں پر قبضہ دینے سے انکار کر دیا ہے۔ کینڈا کی مقامی حکومت نے شمال مغربی علاقے ڈینے (DENE) اور انوٹ کو اجازت دیدی ہے کہ وہ اپنے صوبے بنا کر ان میں خود مختار اختیارات کے ساتھ حکومت کریں۔

اس علاقہ میں میٹس (METIS) بھی زمین کے حقوق کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ انڈین اور سفید نوکرانہ کی مخلوط نسل ہیں۔ ان کے لیڈر لیوی ریل (LOUIS RIEL) نے انیسویں صدی میں حکومت کے خلاف ایک بغاوت کی سربراہی کی تھی۔ اس سے اس بات کا بھی ایمان ہوتا ہے کہ بے علاقوں میں جہاں کم آبادی تھی اور فطری ذرائع بھی کم تھے وہاں جو لوگ آباد ہوئے انہوں نے نسلی تفریق کو روک دیا اور مقامی آبادی میں مکمل مل گئے۔

لیپ نوآبادیاتی نظام ماضی کا ایک حصہ بن چکا ہے۔ اور اس کی جگہ اب پہلے سے زیادہ طاقت ور قومیں وجود میں آگئی ہیں جنہوں نے تیسری دنیا کو غیر متحرک بنائے رکھا ہے۔ اب بھی مقامی باشندوں کے ذرائع پیداوار پر قبضہ ہو رہا ہے اور ان کی روحانی زندگی اور کچر میں برابر غارت کی جا رہی ہے۔ السوس یہ ہے کہ اب تک مقامی لوگوں کے شعور اور ان کے ان کی چم کو پوری طرح سے نہیں سمجھا گیا مثلاً گوشتے والا کے بالا اور مشرقی تیمور کے باشندوں کے ساتھ مسلسل نسلی تعصب برتا جا رہا ہے (اس طرح جیسے آسٹریلیا و نیوزی لینڈ کے مقامی باشندوں کے ساتھ ماضی میں ہوا تھا) ہم جان کر ڈیڑھ ایک امریکی ریڈ انڈین کے الفاظ کے ساتھ یہ مضمون ختم کرتے ہیں۔

"1980ء کی دہائی میں ہم مزاحمت اور شعور کے ساتھ کام کرنا چاہتے ہیں اور

چاہتے ہیں کہ آنے والی نسلیوں کو حریت و طاقت پیدا کر جائیں۔ ہم یہ کہنا چاہتے

ہیں کہ "ہم جنہیں اس بات کی اجازت نہیں دیں گے کہ ہمیں کھال لاد" ہمیں

انسانی حقوق سے بھی کئے جاتا ہے، ہمیں شہری حقوق کو بھی پار کرنا ہے اور پھر

فطری حقوق کو پانا ہے کیونکہ تمام فطری دنیا کا یہ حق ہے کہ وہ زندہ رہے۔"

کلچرل امپیریلزم

رابرٹ سیل

میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ شروع ہی میں ان دو الفاظ کی تشریح کر دوں جو میں اس مضمون میں استعمال کرنے والا ہوں۔ یعنی کلچرل اور امپیریلزم۔

امپیریلزم کی اصطلاح میں ان معنوں میں استعمال کرنا چاہتا ہوں کہ ایک نسل یا قوم کے لوگ جو سیاسی و معاشی طور پر طاقت ور ہوں، دوسری نسل یا قوم پر جو سیاسی و معاشی طور پر کمزور ہو اس پر طلب اور تسلط حاصل کر لیں (جیسا کہ کئی سیاسی و معاشی طور پر کمزور یا طاقت ور ہونے کو اضافی سمجھا جاسکتا ہے) طاقت ور اقوام کا کمزور اقوام پر اثر و طلب کا ذکر تاریخ کی کتابوں، نوآبادیاتی جنگوں و آزادی کی جنگوں کے حوالے سے آتا ہے یا جب ہم ہندوستان یا پانچ امریکی نوآبادیات، کامن ویلتھ اور فرانسیسی لہجہ کی اصطلاحات استعمال کرتے ہیں تو اس سے طاقت ور کا کردار پر قبضہ کا مراد ہوتا ہے۔

لیکن میں جس معنوں میں اس اصطلاح کو استعمال کرنا چاہتا ہوں وہ دو ٹکڑوں کا تصادم ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام ہے اور اسے صحیح بھی قہوں کر مہیا جاتا ہے کہ یورپ کا کلچرل اور سیاسی اداروں کی وجہ سے مستحکم ہے، لہذا یہ کلچر دوسری قوموں اور ملکوں کے مقابلہ میں افضل ہے۔ جو ملک کلچر کے لحاظ سے کمزور ہیں انہیں عام طور سے "ترقی پذیر" کہا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان کے پاس ہماری جتنی عیسائی اور سیاسی ادوار سے نہیں ہیں۔ حقیقت میں کلچر کی برتری اور کمتری کا یہ تصور جدید ہے کیونکہ دینی جو سیاسی و معاشی لحاظ سے یونانیوں کے مقابلہ میں بہت زیادہ مستحکم تھے مگر وہ اس بات کو تسلیم کرتے تھے کہ یونانی کلچر ان کے مقابلہ میں زیادہ برتر ہے۔ اسی طرح غیر مذہب قرائن نے جیسا کہ انہیں کہا جاتا ہے، اور جنہوں نے دینی مسیحیت کو ختم کر دیا تھا، وہ اس بات کو مانتے تھے کہ انہوں نے دینی کلچر سے بہت کچھ سیکھا ہے، لہذا کلچر کی برتری کا یہ تصور بالکل جدید اور ہمارے دور کی پیداوار ہے۔ آئیے میں اس پر مزید روشنی ڈالوں گا۔

جب میں کلچر کا لفظ استعمال کرتا ہوں تو یہ ان محدود معنوں میں نہیں جو پمپلی کے دن

میں نیم باکسیری میں دکھایا جاتا ہو، بلکہ بن وسیع معنوں میں ہے جو لوگوں کے ذہن کی نمائندگی کرتا ہو۔ لہذا میں ذہن، تعلیم اور باہر اعلیٰ معاشی مسائل اور مذہب کی روشنی میں اس کی تشریح کروں گا۔ طاقت کی بحث صرف ایک امریکی امریتوںات ایڈورڈ ہال کی ہے جو شاید آپ نے نہیں پڑھی ہو۔ وہ آسان زبان میں لکھا ہے کہ "کلچر جابلہ خیاں ہے" یعنی لوگ اپنے کلچر کے ذریعہ اپنے خیالات ایک دوسرے تک پہنچاتے ہیں۔ میں اس میں مزید اضافہ کرتے ہوئے یہ کہوں گا کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ بھی کیا جاتا ہے۔

قوموں کے ساتھ ساتھ امپیریلزم کی شکل بھی بدلتی رہی ہے۔ اس لئے میں پہلی نووی پریگیزنی، ولادیویری اور دوسری امپیریلزم کے بارے میں کچھ نہیں کہوں گا۔ میں اپنی توجہ یہاں صرف بیٹھو نیکنس امپیریلزم پر مرکوز رکھنا چاہتا ہوں۔ اس دائرے میں برطانوی اور امریکی آتے ہیں جو کسی حد تک فرانسیسی بھی۔ دونوں نے ایک ہی عہد میں اپنی نوآبادیات قائم کیں۔ میں اس کی پڑاؤ شکل امریکہ میں برطانوی اور فرانسیسی کلچر کے اثرات سے کہوں گا، جو وہاں کے مقامی باشندوں پر ہر ایک اس کے بعد میں ان اثرات کی شکستہی کہیں کا جو برصغیر ہندوستان میں ہندوستانوں پر ہونے اور آخر میں مختصراً "فریقہ" کے بارے میں کچھ کہوں گا اور اس بات کا بھی جائزہ لوں گا کہ کلچرل امپیریلزم علم ہو چکا ہے یا نہیں کسی دوسری شکل میں نمودار ہوا ہے۔ اب میں اس تاریخی پس منظر کی طرف آتا ہوں کہ یورپی اقوام کیوں عیسوی دینی کلچر کو حقیر سمجھتی ہیں؟ اس دکان کو ایک ہم عصر فرانسیسی مصنف نے جیسی خوبی کے ساتھ ایک جملہ میں ادا کیا ہے وہ لکھتا ہے کہ

"یہ بہت الوس کی بات ہے کہ کچھ دانشوروں کی یہ کوشش ہے کہ وہ اپنے

ملکوں کے کلچر کو یورپی کلچر کے ہم پلہ قرار دیتے ہیں۔"

یہ بحث ہی مطروحات الفاظ ہیں کہ جن کا آپ تصور کر سکتے ہیں۔ میں آپ سے پہلے بھی کہہ چکا ہوں کہ تاریخی کلاسیکل دور میں سوچنے کا یہ انداز نہیں تھا کہ جن اقوام نے دوسروں پر فتح حاصل کر لی ہے تو محض اس وجہ سے ان کا کلچر افضل ہے، اس کی مثالیں تاریخ سے ملتی ہیں مثلاً یورپ کی مثال دانیہ جس نے ٹکر کی بحث سے جتنی کو بدش کی۔ وہ یونانی و دینی تہذیبوں کے ام اثرات جو کہ قرون وسطیٰ کی اسلامی تہذیب میں محفوظ رہیں، پیدا ہوئی۔ اس کے بعد انھیں دسویں صدی میں "نور الفروزی" کا دور آیا تو اس میں پہلے اپنے نظریات دہ دنیات کی وجہ سے اسلامی کلچر سے علیحدہ رہا۔ اس کی گرفت کمزور ہوئی اور یہ تصور قبیل ہوا کہ تمام انسانوں میں عقل یکساں طور پر موجود ہے اور یہ تمام دنیا میں اور تاریخ کے ہر دور میں یہاں تک کہ

عیسائیت سے پہلے بھی لوگوں میں موجود تھی، اور اخیر دہائی اقام کے پھر میں دلچسپی لیتا چاہئے اور ان کے لئے رواداری کے جذبات رکھنا چاہئیں۔ اس کے نتیجہ میں اس دور میں غیر عیسائی اقدار اور روایات اور غیر برہنہ طاقتوں میں دلچسپی پیدا ہوئی۔ خاص طور سے قدیم دور کی طاقتوں میں۔

دلچسپی کا یہ رجحان بہت عرصہ کے ساتھ فرانسیسی فلاسفوں کی فکر میں جھلکتا ہے مثلاً روسو کے یہ نظریوں کے نظریات کے مطابق امریکہ کے ریڈ انڈین اور چین کا معاشرہ، مقابلہ ہادیں صدی کے یورپیا معاشرہ اور ان کی تفریق حکومتوں کے پاکیزہ اور اچھے حال۔ ایک اور دوسرے فرانسیسی مصنف لوبریئر (LABRUYERE) نے کہا کہ "فکر اور عمل کا تعلق تمام اقام سے ہے۔" انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ یورپیا اقام کو دور دراز ملکوں کی تفریق و ثقافت میں دلچسپی لیتا چاہئے۔ ان فرانسیسی مفکرین کے نزدیک شمالی امریکہ کے ریڈ انڈین نسبتاً زیادہ خوش اور روشن خیال وحشی ہیں (جیسا کہ وہ انہیں کہتے ہیں) اس لئے اہل یورپ کو ان کی زندگی سے سبک دیکھنا چاہئے اس سے "شریف انڈین" کا تصور پیدا ہو جو بعد میں امریکوں کے ذہن میں راسخ صورت میں پیدا ہوا (HIAWA THA) اور پھر بعد میں "کاٹھ پوتلے اور انڈین" کی شکل میں لیا۔ فرانسیسیوں نے اس نقطہ نظر کو اس لئے اختیار کیا کہ وہ شمالی امریکہ میں آباد لوگوں کی حیثیت سے نہیں آئے تھے بلکہ ان کا شعبدہ بھائی سیاحت اور فکار تھا۔ اس لئے ریڈ انڈین انہیں اچھے اور کام کے لوگ تھے۔ انہوں نے صرف ان کی معاشرتی زندگی میں دلچسپی لیا کہ وہ کس طرح گزار اوقات کرتے ہیں کیا سوچتے ہیں اور کس طرح رہتے ہیں؟

اس کے برعکس برطانوی "پے آؤٹھ" اور "جیس جوں" میں بحیثیت آباد کار آئے تھے اس لئے انہیں یہاں زمین اور زمین پر کام کرنے والے چاہئیں تھے۔ انہوں نے اول تو ریڈ انڈین کو خاندان بدوش سمجھ کر ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیا مگر جب انہوں نے ان کی زمینوں پر کام کرنے سے انکار کر دیا تو اس صورت میں وہ ٹیکسوں کو بحیثیت غلام لے آئے۔ دیکھا جائے تو امریکی براعظم میں اہل برطانیہ پہلے ٹیکسوں کو غلاموں کی حیثیت سے لائے والے نہیں "ان" سے پہلے 15 ویں صدی میں برازخرب ہند میں ہسپانوی ٹیکسوں کو لاپکے تھے۔ میں غلامی کے موضوع پر زیادہ نہیں کہوں گا کیونکہ اس صورت میں وہ بالکل طرف سب سے کم اثرات ہوئے ہیں، طاقت ور کنڈور کا زیادہ سے زیادہ استعمال کرتا ہے اور اسکی تعلقات کی نوعیت بہت کنڈور ہو جاتی ہے۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر 18 ویں صدی نسبتاً روشن خیالی کی صدی تھی تو پھر

اس دور میں غلامی کو کیوں برداشت کیا گیا؟ میرا خیال ہے کہ اس کی دو وجہات تھیں۔ اول یورپیا لوگوں کی نگاہوں میں کالے اور سفید دو امتیازی پیدا ہو گئے تھے۔ خاص طور سے انڈین کے ٹیکسوں جنہیں وہ خود سے بہت مختلف سمجھتے تھے۔ دوم "جسے میں زیادہ اہم سمجھتا ہوں کہ یہ ٹیکس غلام جو 12 فریب ہند میں مجھے کے سمجھتے اور امریکہ کے جنوب میں کپاس و تंबاکو کے کھیتوں میں کام کرنے کے لئے لائے گئے تھے یورپیا و سفید اقام کی معیشت کے لئے اہم ضرورت بن گئے تھے۔ یہ بھی ضروری ہو گیا تھا کہ سفید لوگوں کے ثقافتی معیار اور معیار زندگی کو بلند پر قرار رکھنے کے لئے "کالے لوگوں کو کسی بھی قسم کے مواقع نہیں دینے چاہئیں اور ان کا معیار زندگی بہت رکھا جائے۔ یہ ایک طبعی بات ہے کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شمالی امریکہ کے ٹیکسوں ریڈ انڈین کے مقابلہ میں زیادہ بہتر رہے، کیونکہ جب امریکہ میں سفید کے انحصار "MANIFEST DESTINY" کا نظریہ پیدا ہوا تو اس کی دہائیوں میں اگر ریڈ انڈین یا تو ختم ہو گئے یا ان کو محفوظ علاقوں میں دھکیل دیا گیا تو اس کے ساتھ ہی ان کے بارے میں "شریف انڈین" کا تصور بھی ختم ہو گیا۔ اور اس کی جگہ وہ خوں آشام اور جنگجو بکرانہ امریکہ جن کو "کھڑے پائے اور انڈین" کی شکل میں کرچ تک فی۔ وی پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ان کے بارے میں جن خیالات کو پھیلا یا گیا، یہ تھے کہ "انڈین سب" بھڑا باز اور بیکار لوگ تھے۔ ان کے بارے میں یہ تصور قیبل کرتے ہوئے اس بات پر غور نہیں کیا گیا کہ "ریڈ انڈین" نشہ اس لئے کرتے تھے کہ کیونکہ سفید آدمی نے اسے بستی شراب فروخت کی اور وہ سب و کمال اس لئے بن گیا کہ اس سے اس کی زمین بھین لی گئی۔ جب طاقت ور نے کنڈور کے بارے میں اس خیال کو اس لئے پھیلا یا تاکہ اس ذریعہ سے وہ معاشی منافع حاصل کرے تو ایسی صورت میں حقیقت کو سامنے لانا غور مشکل ہو گیا۔

حقیقت میں اگر دونوں گروہوں کے درمیان کوئی حقیقی رابطہ ہوتا تو اس صورت میں سفید آدمی "ریڈ انڈین" سے بہت کچھ سیکھ سکتا تھا۔ مثلاً سفید آدمی میں نصرت کے بارے میں احترام کا جذبہ پیدا ہو سکتا تھا۔ اور وہ یہ سیکھ سکتا تھا کہ نصرت کی دولت کو کس طرح محفوظ کیا جائے۔ انڈین پھل انڈین ٹیکسوں کے ہی استعمال کرتے تھے، سفید آدمی نے اس کے استعمال کو ترک کر کے اسے بہت کامیاب بنادیا۔ ریڈ انڈین (گرسٹ ایک) میں چھپائیں چکرتے تھے اور اس پر گورہ کرکرتے تھے "اس میں سفید آدمی نے معنی غلط سمجھ کر اسے اس قدر زہر آلود کر دیا کہ اس میں لپ کوئی چھل زندہ نہیں رہ سکتی ہے۔

سفید غلام ریڈ انڈین سے تباہ و برباد کرنا احترام سمجھ سکتا تھا۔ لیکن اس کے بجائے امریکوں

میں ماضی کے بارے میں عقائد آمیز رویہ پیدا ہوا۔ انہوں نے فوجیائی کا پرستش شروع کر دی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کثیر تعداد میں جو سماجیوں میں آکر آباد ہوئے، ان کے بچوں نے امریکی اسکولوں میں تعلیم پا کر انگریزی بولنا شروع کر دی اور اپنے ماں باپ کو جو ٹوٹی پھوٹی انگریزی بولتے تھے، مکرر سمجھنا شروع کر دیا، کیونکہ بڑے لوگ اپنے آپ کی شکوک کی وجہ سے وابستہ تھے اسی لئے نئی نسل میں ان کے لئے کوئی احترام پیدا نہیں ہوا۔

سفید آدمی 'ریڈ انڈین' کی ماضی اور عقائد کی خوبیوں حاصل کر سکتا تھا مگر اس کے بجائے انہوں نے جلدی سے امیر ہوا اور دولت مند معاشرے کا ایک حصہ بننا چاہا۔ نیک امریکی، امر علم بشریات، ریڈ انڈین کے بارے میں لکھتا ہے کہ "ان میں آدمی کی عزت اس بات پر کی جاتی تھی کہ اس نے کیا کیا اس پر نہیں کہ اس کے پاس کیا ہے۔" یہ صحیح ہے کہ کلچر کے تبادلہ کی صورت میں ریڈ انڈین نے سفید آدمی سے گھوڑا لیا جو دیکھا جائے تو ان کے لئے زیادہ فائدہ مند نہیں ہوا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے خرابی بھی بنائیں، مصلک، ہتھیار، شراب اور صنعتی سامان کی بہت سی برائیاں بیکیں۔

اس کے بعد میں ایشیا کی طرف توجہ دی گئی۔ اہل برطانیہ شمالی امریکہ میں آباد ہونے کی غرض سے گئے تھے، لیکن ہندوستان میں وہ تجارت کی غرض سے گئے تھے اور اس حیثیت سے انہوں نے ابتدا میں ہندوستانی معاشرہ کو تبدیل کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی اور وہ ہی انہوں نے جو برقی مذہب اور کلچر کو یہاں کے لوگوں پر مسلط کرنے کی کوشش کی، بلکہ ہندوستان کے پہلے گورنر جنرل ولیم بنٹن نے کلکتہ میں عربی و فارسی زبانوں و شرقی علوم کا ایک کالج کھولا۔ اس کے ایک جانشین مارڈ کارنوالس (یہ وہی صاحب ہیں جنہیں امریکہ کی آزادی کے مسئلہ میں پارک ہاؤس میں خرچ خرچ ہوا تھا) نے بارس میں مسکرت کے لئے ایک کالج کھولا 18 ویں صدی میں 'ہیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں' انہیں اور غیر کلچر کے مطالعہ اور اس کو جاننے کا شوق تھا۔ اس کی کئی مثالیں ہیں مثلاً سرولیم بنٹن نے کیو کارڈان میں ایک بگڑا پتھر کیا تھا جو اب تک موجود ہے (چارچ چارم نے برٹش میں ایک پوبلین جو لایا تھا جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ "۱۶۷۰ میں سکیم ہندوستان اور اندر سے شمع تیلی ہے" جب انھارویں صدی کے آخر سال میں پوبلین امریکہ آیا تو اپنے ہمارے ماہر تعمیرات اور نقش و نقش بھی لے گیا تھا تاکہ وہ وہاں کی قدیم عمارتوں کا مطالعہ کر سکیں۔ اس نے تمام یورپ میں ROSETTA پتھروں کی تحریر کو تفسیر کر لیا تاکہ وہ پ کے عالم اسے پڑھ سکیں اور اس کی یہ خواہش پوری بھی ہو گئی، پوبلین اکثر کہا کرتا تھا کہ اگرچہ اس نے اس پر عمل نہیں کیا) حقیقی فتح جو کسی ماسٹ کو پیدا نہیں کرتی، وہ جماعت پر فتح

ہے۔

ہندوستان میں اسی جی ابراہم کے بعد 'آخر یہ سب کیوں بگڑ گیا؟ میرا خیال ہے کہ جیسے جیسے برطانوی اقتدار ہندوستان میں پھیلنے لگا، ایسے ایسے انتہائی حساس و پیچیدہ ہوتے چلے گئے۔ کارنوالس کا یہ خیال تھا کہ ہر ہندوستانی بے ایمان ہے۔ اس لئے ہندوستان کے انتہائی داروں کو انگریزی لٹریچر پر لکھا جاتا ہے۔ اس سوچ کے نتیجہ میں 1806ء میں ایسٹ انڈیا کالج جو بعد میں ایلی بری کالج کہلائے، اس نے انڈین سول سروس کی تربیت کی۔ اس کے علاوہ یہ ہوا کہ 1813ء میں جیسی مشنریوں کو ہندوستان میں داخلہ کی تجارت لگائی گئی اور انہوں نے کانپوں کو کم صرف عیسائی بنانا چاہا، بلکہ ان کی لٹریچر کی کو بھی بدناما چاہا کیونکہ وہ ان کی زندگی کے بعض پہلوؤں کو بالکل پسند نہیں کرتے تھے۔ ہندوستان میں جہاں مذہب زندگی کے ہر پہلو میں رہا ہوا تھا، ایسے معاشرہ میں انگریزوں نے مذہب اور سیاست کی علیحدگی کی بات کی کہ مذہب ایک علیحدہ چیز ہے اور اس کا دور موع کے سیاسی معاملات اور معاشی مقادرات سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے بدعہ اور بدی کی دہائی کا تصور بھی پیش کیا جو اہل ہندوستان کے لئے اجنبی تھا۔ اس کے بعد انہوں نے منقسم کے نظریہ انقلاب کی تبلیغ کی، اس کے تحت خوش حالی سرت کا باعث ہوتی ہے، اور اس کا انحصار معاشی ترقی اور اعلیٰ تعلیم پر ہے۔ لہذا اہل برطانیہ نے طاقت پرستی اور مذہب کے ذریعہ ہندوستان میں اپنی حیثیت ایک ایسے مسلط کی، جن کا یہ فرض تھا کہ وہ غلام لوگوں کے کلچر اور ان کے لٹریچر کو تبدیل کر کے، انہیں یورپی بنادیں۔ کیونکہ ان کے خیال میں یورپی کلچر مذہب سے زیادہ اعلیٰ تھا۔ انتظامیہ کے عہدیدار جن کے لئے تجارت ممنوع کر دی گئی تھی، انہوں نے اس مشن کو پورا کرنے کی جدوجہد کی۔ یہ وہ دور ہے جسے ہم 'سفید آدمی کے یو جی' کا دور کہتے ہیں۔

گورنر جنرل ڈیم پیٹنگ (1828-1835ء) کے زمانہ میں یہ فرق واضح ہو گیا۔ اس زمانہ میں یہ وہ آدمی خاص طور سے قابل ذکر ہیں "لارڈ میکالے اور ٹیمس ل' جو ایک آفس میں ملازم تھے اور اسے محفل پرستی کا امام اور "ثقافت پرست" کہا جاتا تھا۔ اگرچہ وہ کبھی ہندوستان نہیں آیا مگر اس نے ہندوستان کی تاریخ پر کئی جلدوں میں ضخیم کتاب لکھی۔ ان دونوں نے ہندوستان میں برطانوی متقلبین کو اپنی طور پر متاثر کیا۔

پیٹنگ کہا کرتا تھا کہ "انگریزی زبان تھا۔ ترقی کی کھلی ہے۔" اس نے فارسی زبان جو برائے ذہان تھی، اسے ہٹا کر انگریزی کو رائج کیا۔ اس کے ساتھ ہی وہ دور شروع ہوا کہ جب اندین سول سروس کے لوگوں نے ہندوستانی کلچر میں دلچسپی لینا بہت اہمیت ختم کر دی۔ پیٹنگ

کہا کرتا تھا کہ "تعلیم کے ذریعہ ہندوستان کو دوبارہ سے زندگی دی جا سکتی ہے۔" لیکن اس نے اپنے پیروؤں کے مقابلہ میں برطانیہ اور مسکرت کی سرپرستی کرتے تھے، انھوں نے تمام تعلیمی لٹریچر برطانیہ کے لوگوں اور برطانیہ کے لئے وقف کر دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اس سے اہل ہندوستان خوشحال ہوں گے اور پھر مسکرت کی کڑواہٹ گے۔ لیکن بد قسمتی سے کلچر کے یہ رائے زیادہ خوشگوار ثابت نہیں ہوئے۔ یہاں تک کہ صرف قانون کی مثال دیں گے۔ میکالے خود کہا کرتا تھا کہ ہندوستانی انگریزی قوانین سے ناواقف ہیں۔ یہ بات اس نے درجن ہینڈلز پر مضمون لکھتے ہوئے کہی تھی۔

"کسی کو پتہ نہیں ہوتا تھا کہ اہل انجمن برطانویوں سے کیا طور میں آئے گا؟ یہ ان جوں پر مشتمل ہوتی تھیں جو اہل لاکھوں انسانوں پر جن میں انھیں کنٹرول تھا، ان کی رہائش سے ناواقف تھے۔ بد قسمتی کا وہاں ایک انجمن زبان میں ہوا کرتی تھی، مڑائیں انجمن زبان راجہ میں بٹائی جاتی تھیں۔ اس کے نتیجے میں برطانویوں میں مقامی لوگوں کے بدترین اخصاص جمع ہو گئے ہیں جن میں جڑ جڑوں شہوتیں دینے والے،

مادی خدمت، باز، فریبی اور غیر اہل کاروں کی ایک فوج ہے۔

اہل برطانیہ نے ہندوستانوں میں کسی چیز کو زیادہ سے زیادہ حاصل کرنے کا جذبہ پیدا کیا، جب کہ ہندوستانی فلسفہ میں جس پر زیادہ زور دیا جاتا تھا وہ یہ تھا کہ کوئی خواہش صحت پیدا کرے۔ لیکن اہل برطانیہ نے ان سے یہ نہیں سیکھا۔ اس کا اندازہ کہہ کر جس مل کے لڑکے جان سینورٹ مل کی زندگی سے ہو جائے تھے اسٹیوٹ مل ہندوستانی فلسفہ اور مذہب کو تجارت سے دیکھتا تھا وہ انھیں کے نظریے کے ذریعہ اپنی اپنی زندگی میں اس بات پر یقین رکھتا تھا کہ زیادہ مسرت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ تعلیمی اور سماجی اصلاحات کی جائیں۔ اس میں ترقی و کامیابی پوشیدہ ہے۔ کلچر 1826ء میں وہ ایسوسی اور اپنی ماؤ کا شمار ہو گیا۔ اسی زمانہ میں اس نے اپنی خود نوشتیں سوانح حیات میں لکھا کہ "ان حالات میں مجھے یہ خیال آیا کہ میں خود سے یہ سوال کھول کر فرض کر دوں اگر انسان کے تمام مقاصد اس دنیا میں پورے ہو جائیں اور ان تمام اوصاف، ذالیات و تقادیر میں جس تبدیلی کا وہ خواہش مند ہے، وہ آجائے تو کیا یہ تمہارے لئے خوشی و مسرت کا باعث ہو گا؟ اس پر میرے وقت الشعور سے ایک ناگفتاواصحت جذبہ نے جواب دیا کہ "نہیں" اور اس کے ساتھ ہی میرا دل بیٹہ گیا۔ وہ بنیاد کہ جس پر میری پوری زندگی کا انحصار تھا وہ فادہ مٹ گئی۔ میری تمام خوشی جو انجم کو حاصل کرنے کی جدوجہد کے لئے وقف تھی، اب اس انجم میں مجھے کوئی کشش نظر نہیں آتی۔ اب میں کسی طرح سے

دیکھتا ہوں ان حالات میں دلچسپی ہوں، ایسا نظر آتا ہے کہ میرے لئے ذمہ رہنے کے لئے کچھ باقی نہیں رہا ہے۔"

یہ بکر خواہش تجربات بھی مل کو اس بات پر مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ اس کی تحقیق کرنا کہ پورے کلچر سے علاوہ "مختلف" آب و ہوا اور مختلف طرز زندگی کا ایک اور کلچر ہے، اور اس میں شاید اس کے مسائل کے بارے میں کچھ کہا گیا ہو اور اس میں شاید اس کے ذہنی و باؤ کا علاج ہو۔

انیسویں صدی میں اچھوتوں اور عورتوں کو گناہ سے دو سنگ تھیوت نے شدید عاید کیا۔ ان میں سے ایک ڈاکوٹن کا نظریہ تھا جسے اس شکل میں جیسا کہ اس نے پیش کیا تھا، "تھیں نہیں کیا گیا" بلکہ اسے اس طرح سے پیش کیا گیا کہ جو سوشل نیٹیو کو برداشت کر رہا ہے وہ مضبوط اور طاقت ور ہو جاتا ہے۔ انیسویں صدی میں طاقت ور کا مطلب تھا کہ جن کے پاس بہت سی برادریاں ہوں اور جو ان کی مدد سے حکومت کرتے ہیں۔ ان کا حق ہے کہ وہ گھروں کو اپنے وقت میں رکھیں، گھر کے گھر کے یہ نصرت کا اصول ہے۔

دوسرا نظریہ نسل پرستی کا تھا جسے پہلے ایک فرانسیسی سفارت کار گوینیے (GOBINEAU) نے پیش کیا تھا۔ اس میں ایک انگریز نژاد اسٹیوارٹ جیمز نے جس نے رچرڈ واکر کی لڑکی سے شادی کی تھی اور جرمنی میں جا کر رہنے لگا تھا، اسے مزید اٹھارہ نسل پرستوں کے نظریات سے اوروں کے خیالات کو سمجھ کر دیا اور اس بات پر زور دیا کہ نسل کا قدس ہو؟ انتہائی اہم چیز ہے۔ اس کی مثال انھوں نے گرسے ہونڈ اور ریس کے گھوڑوں سے دی۔ اگر ایک خالص نسل پیدا کی جائے تو یہ انتہائی طاقت ور اور زندہ رہنے کی اہل ہو گی۔ ان کے کہن میں یہ "نرسل نیٹو" در بیکو سیکھن تھی۔ ان کے درجہات کے مطابق یہودی اور نگرہ سب سے پہلے درجہ میں تھے۔

بد قسمتی سے یہ نظریات اس وقت فیشن میں تھے جب کہ برطانوی اور فرانسیسی افریقہ میں اپنا اقتدار پھیل رہے تھے اور جب کہ ہندو برطانوی حکومت ہندوستان میں طاقت ور ہو چکی تھی۔ میں نے تو کچھ کہا ہے، شاید اس میں تھوڑا بہت مبالغہ ہو، لہذا میں میکالے کی تحریر سے ایک اقتباس پیش کرتا ہوں جو اس پر مبنی کے جذبات کی عکاسی کرتا ہے۔ میکالے نے ایک نکالی نگرہ کے بارے میں حسرت اور حقارت کے ساتھ لکھا کہ "انگریزوں کے لئے جو حیثیت طاقتوروں کی تھی اور طاقتوروں کے لئے جو حیثیت ہندوؤں کی ہے اور ہندوؤں کے لئے جو حیثیت برطانویوں کی ہے، وہی حیثیت نگرہ کی برطانویوں کی نظر میں ہے۔" برطانویوں کی جسمانی طاقت کمزور

دناڑک ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ان میں توانیت ہے۔ ان کے تمام مشاغل بیکار ہوتے ہیں اور ان کی حرکات و سکنات سست ہوتی ہیں۔ ان کا ذہن بھی ان کے جسم سے مشابہت رکھتا ہے۔ بیکار گزرتا ہے۔ یہ مردانہ مزاجت کے لئے بیکار ہے۔ اس لئے اس گزرتا ماضی میں جو لوگ سخت برداشت کرتے ہیں نور طاقت ور ہوتے ہیں ان کی عزت و احترام کیا جاتا ہے اور یہ لوگ ان کے لئے سوائے عمارت کے اور کچھ نہیں دیکھتے۔ لمبے چوڑے دھڑے، اچھے برائے، چیدہ و اچھے ہوتے جھوٹ کے لئے ہوتے، دھوکہ دہی، دودھ حلی، ان کے وہ اختیار ہیں جو یہ سچے دفاع اور حیلے میں استعمال کرتے ہیں۔ یہ گنگا کے آریس علاقے میں رہنے والے لوگوں کی عادت ہے۔ اس کالب و بھو ایاہی ہے جیسا کہ برطانوی بینک سکول کا ہیڈ ماسٹر، ان بچوں کی رپورٹ لکھ رہا ہو جو اچھے کلاڑی تھے۔

میں کسی طرح بھی ہندوستان میں برطانیہ کے حتمی کارناموں کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتا۔ انہوں نے ہندوستان میں ہندو گائیں 'شاہراہیں' پل اور ہسپتال تعمیر کرائے ہوئے تھے۔ مسیحیوں نے ان میں 'ان' اور ہندوستانوں میں خیالات کا کوئی مفید تبادلہ نہیں ہوا' اور نہ ان میں ایک دوسرے کے لئے احترام کا جذبہ پیدا ہوا۔ اہل برطانیہ نے دراصل اس حقیقت کو نہیں سمجھا کہ ہندوستان میں ان کی کامیابی 'ان کی نسل برتری کی وجہ سے' تھی بلکہ ان کی نیکنائوں کی ترقی اور ہندوستانی معاشرہ کی کمزوری کی وجہ سے ہوئی جو رات پات اور بے سبب کی بنیادوں پر ختم تھا۔ میں ایک بار پھر ایک اور معاصر جان لارنس آف پنجاب کی رائے بیان کروں گا جس نے 1858ء میں کہا تھا کہ 'ہم یہاں عوام کی مرضی و ان کے انتخاب سے نہیں آئے ہیں بلکہ ہم اپنی اخلاق برتری' حالات کی موافقت اور طبیعت ایزدی کی مرضی کے سبب طاقت میں آئے ہیں اور یہ وہ چارٹر ہے کہ جس کی بنیاد پر ہم ہندوستان میں حکومت کر رہے ہیں۔"

دکڑیہ کے عہد کے ایک ہر چارلس ڈلک (DILK) نے برطانوی سلطنت کی سیاحت کے بعد لکھا کہ "مجھے پورے سفر کے دوران جو خیال میرے ساتھ ساتھ رہا، اور جس نے میری رائیاتی کی، اور وہ چلی جس نے پراسرار اور غبی سر زمینوں کے محفوظ خزانوں کو ہمارے لئے کھولا، ہاری نسل کی شان و شوکت کا تصور تھا جو کہ تقریباً ساری دنیا کو اپنے کھیرے میں لے چکی ہے۔ یہ اس کے مقدر میں تھا کہ وہ چاروں طرف پھیلی جائے" ایسا محسوس ہوتا ہے کہ برقی کے تصور نے اسے تقریباً اچھا کر دیا ہے اور اسے ہی سر زمینوں میں کوئی فکر اور سوچ ہی نظر نہیں آتی جسے وہ سمجھ سکتا۔

یہ ناکہ سلفہ آدمی کے بوجھ کا نشانہ تھا، مگر کہ میں اسی خیال نے مقدمہ کے اٹھارہ کی شکل

اقتدار کی کمی اور بگڑا خیانت تھے کہ جب فرانسیسیوں نے افریقہ میں اپنا اقتدار قائم کیا۔ فرانسیسیوں کو خصوصیت سے ایک خاص مسئلہ کا سامنا تھا۔ کیونکہ وہ نہ صرف مرہبہ دارانہ کلام کے وارث تھے اور وہ کہادیات کو اپنی سماجی ضروریات کے تحت ضروری نہیں کرتے تھے بلکہ وہ فرانسیسی اندھپ کے بھی وارث تھے۔ اور اس طرح مصلحت 'اخوت' اور 'آزادی' پر یقین رکھتے تھے۔ اس وقت سے کلا کوئی ان کا بھائی ہو، تھا لیکن وہ خود کو بڑا بھائی سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اس مشن کے تحت کام کیا کہ ایک فرانسیسی کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ وہ کاسٹر آولی کو جہاں تک ہو سکے 'فرانسیسی بنا دے۔ لہذا افریقہ دو مختلف قسم کے کچھڑوں میں بٹا کر چلا۔ کچھڑوں کے ایک طرف انگریزی لڑا ہے۔ انگریزی میں پہاڑے لاد کر رہے ہوئے، جب کہ دوسری جانب فرانسیسی لڑا ہے۔' رمان کو یاد دکر رہے ہوئے تھے۔

تاریخ کے اس مختصر بیان کے بعد اب ذرا دور حاضر کو دیکھا جائے۔ کیا ماضی میں جو کچھ ہوا تھا وہ تبدیل ہو گیا ہے؟ کیا ہم نے اسے ملزم کے ساز و سامان کو چلا کر دیا ہے؟ یا اسے ملزم نہیں متقاعد کر اب مختلف اور زیادہ اچھے طریقوں سے حاصل کر رہا ہے؟ سہانہ نوآبادیاتی طاقتیں اب حد کو اصلاح شدہ سمجھتی ہیں اور اب ٹھیک جی نظر آتا ہے کہ کون کون انہوں نے اپنی نوآبادیوں کو آزادی دے دی ہے اور انہیں اپنی دلی امداد بھی مہیا کر رہے ہیں لیکن کیا حقیقت میں وہ آزاد ہیں؟ دراصل ان ملکوں کے لئے پرانے انداز میں حکومت کرنا مشکل ہو گیا تھا اس لئے انہوں نے جدید ہتھیار استعمال کئے۔ یعنی اگر قدیم لاکھوت میں میر ہو کر پیدا کر دی جائے کہ ان کی تسکین صرف مغربی ٹیکنالوجی کے ذریعہ پوری ہوگی تو اس شکل میں بھرے بغیر اسے اپنی سلطنت کا ایک حصہ بنایا جا سکتا ہے۔ اگر اس امداد کا واحد مقصد ان ملکوں میں سیار زندگی بلند کرنا ہے تو یہ پورے اقوام متحدہ اور ایسی ہی دوسری ایجنسیوں کو گھبراہٹیں دینا چاہئے جو اس امداد کو بہتر طریقے سے تقسیم کر سکیں گی۔ برطانیہ اور فرانس اس رقم سے جو کہ اقوام متحدہ کو بلاور چاندہ دیتے ہیں۔ دس گنی رقم امداد کے طور پر مختلف ملکوں کو دیتے ہیں۔ اس میں برطانیہ کی یہ شرط ہوتی ہے کہ 65 فیصد امداد کی رقم سے ان کی اشیاء خریدی جائیں گی۔ تقریباً 75 فیصد امداد یہ ان ملکوں کو دیتے ہیں جو ان کی سہانہ نوآبادیاں تھیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے احمق ہیں جو اب استعمال کیے جاتے ہیں؟ ان میں سے لیان سب سے اہم ہے کیونکہ اگر کسی ملک کے عظیم قوموں کو چلایا جائے اور ان کے سیاسی شعرات کی گہرائی کی جائے تو ان پر آسانی سے اپنے خیالات و نظریات کو مسلط کیا جاسکتا ہے ایک فرانسیسی مصنف نے اسے اس طرح بیان کیا ہے:

"کسی زبان کی معلومات کلچر اثر انداز ہوتی ہے" اور زبان کے درجہ جس بات کا اعتبار کیا جاتا ہے وہ لوگوں کی مداح تک پہنچ جاتی ہے۔"

اور حقیقت میں یہ صحیح بھی ہے۔ ایک تھنلے کے ہاشوے نے مجھ سے فرانسیسی اثر کے بارے میں کہ تھا کہ:

"انہوں نے میری مداح کی گمریوں تک مجھے مذہب بتا دیا ہے۔"

یہ بات اس نے بڑی تخی کے ساتھ کہی تھی۔

جب یوینسکو کی کسی منتقل میں فرانسیسی اور انگریزی بولنے والے افریقی تقریر کرتے ہیں تو فرانسیسی اور انگریزی کلچر کے تبدیلات کو بچانا چاہتا ہے۔ فرانسیسی بولنے والے افریقی فصاحت و بلاغت اور منطق انداز میں بولتے ہیں جب کہ انگریزی بولنے والے فصاحت کے ساتھ مزاحیہ فقرات اور جملوں کا استعمال کرتے ہیں۔ یوینسکو کی اس بین الاقوامی تنظیم میں 1945ء میں قائم ہوئی تھی اور جس کا مقصد مساویانہ بنیادوں پر قوموں میں کلچر کا تبادلہ تھا۔ اس کی کاروائی چار لیاؤں میں ہوتی تھی اور یہ چاروں زبانیں تھیں یعنی انگریزی، فرانسیسی، ہسپانوی اور روسی۔ اس کے قیام کے بعد اس کے ڈائریکٹر جنرل میں سے ایک انگریز، ایک امریکی ایک اطالوی، ایک فرانسیسی اور ایک میکسیکو کا ہوا۔ (مجھے علم نہیں کہ یہ کیسے ڈائریکٹر جنرل بن گیا) دراصل یہ بولنے والے کلچر کے پروجیکٹس کی انجمنی ہو گئی ہے۔ اس کا 80 لیمڈ بجٹ امریکہ، روس، جاپان اور 11 مغربی ممالک دیتے ہیں۔ اس میں سے یہ 75 لیمڈ بجٹ تعلیم، سائنس اور ٹیکنالوجی پر خرچ کرتی ہے۔ یوینسکو کے اندازہ کے مطابق 700 ملین لوگ ان پڑھ ہیں۔ اور پروگرام یہ ہے کہ ٹی وی، ریڈیو کے ذریعہ تعلیم کو پھیلایا جائے۔ یہ جب تک ممکن ہے کہ پروگرام مقامی زبانوں میں ہوں، لیکن انداز ہے کہ یہاں بھی بولنے والوں کو استعمال کیا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ان پڑھ لوگ پرائیمنڈس کا شمار ہو کر رہ جائیں گے اور ٹی وی میں یا تو وہ پاکستان کے مقابلے دیکھیں گے اور یا یورپی مزاحیہ پروگرام۔

فریقہ و تشیع میں ہم سے لوگ ہیں جو خود کو کلچر کے حصول کا شمار نہیں سمجھتے اور ہر بولنے والے کو نہیں کر لیتے ہیں جیسے کہ جاپانیوں نے کیا۔ انسان چونکہ کائنات کا مرکز ہے اس لئے وہ ایک دوسرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ میں یہاں یوینسکو کے ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل کے الفاظ مثل کے طور پر نقل گا جو انہوں نے 1947ء میں کہے تھے:

"ہمیں سب کو مل کر اس جاندار تعلیم پر عمل کرنا چاہیے جس میں تعلیمی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا جائے" اور جس میں فکری و سائنسی تحقیق ہو، جو اس خیال پر مبنی ہو

کہ انسان اس کائنات کا جوہر ہے۔"

میں آخر میں اس بات کا تجزیہ کروں گا کہ یہ انسان اور مرکز کائنات کیا ہے؟ اور یہ نقطہ نظر ہمیں کہاں لے جائے گا؟ اور اس کی افقیت کو جانچنے کا بیان کیا ہو گا؟ دراصل اس کا میں منظر سیاسیت کا نظریہ مگر تھا جس کے رد عمل میں 18 مئی صدی میں یہ خیال ابھر کر انسان اس دنیا میں کوئی بوجھ اور قرض لئے ہوئے پیدا نہیں ہوا، بلکہ وہ اپنے بنیادی حقوق لئے دنیا میں آیا ہے۔ اس کا ذکر بڑے اعلیٰ انداز میں امریکی اعلان نامہ آزادی میں ہے۔

"تمام انسانوں کو بنیادی حقوق سے نوازا ہے۔" ڈیوئی "آزادی اور خوشی کے ذرائع ہر انسان کے حقوق ہیں اور خالق نے انہیں ان سے نوازا ہے۔ اگر انسان ان حقوق سے محروم ہوتا ہے تو یہ کہتا ہے کہ یہ خدا کی لطف ہے۔ جب انسان وہ اٹھتا ہے، یا انسانی کا شمار ہوتا ہے، بنیاد ہوتا ہے، مفلسی کی اہت برداشت کرنا ہے، پونہ ہوتا ہے اور مرنا ہے، تو وہ خدا کی شایستگی کرتا ہے۔ لیکن جب سے انسان نے خدا پر یقین کرنا چھوڑ دیا ہے تو اس دنیا سے دنیاوی ریاست کی طاقت پر یقین کرنے لگا ہے۔ اس لئے آج جب ہم مسائل سے دوچار ہوتے ہیں تو ریاست کو قصور وار ٹھہراتے ہیں۔ اسی سے ملای ریاست کا قصور ابھرا۔ اور یہ خیال کیا جانے لگا کہ اگر مفلسی کا انتظام ہو، کھانے پینے کی چیزوں کی بازار میں ہمتات ہو اور چھتیاں مٹانے کے لئے صحت الیواء مقامات پر جا سکتے ہوں تو انسان خوشی و مسرت سے دوچار ہو سکتا ہے۔ ایک امریکی ماہر شکایت ایڈورڈ ٹی ہال یہ فرض کرنا ہے کہ مسرت وہ چیز ہے جس پر امریکہ کا تکیا ہے۔ وہ اپنی ایک کتاب میں اس کے ثبوت میں ایک انٹرویو دیتا ہے جو ایک امریکی پروفیسر نے ترکی میں کسانوں سے کیا تھا۔ اس میں انہوں نے بتایا کہ ان کے ذہن میں کبھی یہ خیال آیا ہی نہیں کہ خوشی بھی ایسی کوئی چیز ہے جس پر ان کا حق ہے اور اس کے حصوں کے لئے کوشش کرنا چاہئے۔ انہوں نے اپنے والے کے ذہن میں یہ ہمت بالکل نہیں آئی کہ گاؤں والے اس کے مسرت کے نظریے کے بغیر زیادہ خوش اور مطمئن ہیں اور ان میں نہ تو خوددانی کی پرستش ہے نہ دولت و طاقت کے حصوں کی جدوجہد نہ مفلسی پر حسرت اور موت کا خوف۔

ہم نے جن ملکوں میں اپنی تہذیب اور کلچر کو پھیلایا ہے وہاں ہم نے ان ملکوں کے معاشی احوال کو جوڑ چھوڑ کر رکھ دیا۔ مسرت کا جو تصور ہمارا ہے وہ ایک اضافی تصور ہے اور یہ انفرادی و اجتماعی نقطہ نظر سے بدلتا رہتا ہے۔ ہمارا معاشرہ چھوٹے چھوٹے ملکوں میں بنا ہوا ہے اور اس میں ہر فرد اپنی مسرت کے حصول میں سرگرداں ہے اور اس لئے مسرت کے حصول کے لئے کوئی معاشی کوشش نہیں ہوتی۔ معاشرہ کے کھوے کھوے کر کے، انسانی انفرادی رفقان اور ملک

صنعتی اثرات کو ہم نے ان معاشروں میں رائج کیا جن کی تعلیم دوسرے مخطوط پر تھی اور اہل مغرب انہیں پس پاندہ سمجھتے ہوئے ان کا تعلق تقدیر کے اندر لے لیا اور اسے قائم کرتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یورپی اثرات نے ان معاشروں کی جن کی بنیاد قائل اور خاندان پر تھی، کئی دوسرا تہذیبی نظام سے بغیر انہیں ختم کر دیا۔ کچھ عرصہ ہو میں نے یوگنڈا کے طالب علم سے بات کی جس نے مجھے بتایا کہ وہ ایتھام میں برطانوی معاشروں سے سخت بیزار تھا کسی نسلی امتیازی درجہ سے نہیں بلکہ لوگوں کی سوشل کی وجہ سے جن میں کوئی اجتماعی زندگی کا احساس نہیں اور جن میں خاندان سے تعلق کے جذبات بھی ختم ہو رہے ہیں۔ اس نے بتایا کہ جب وہ اور اس کے دوست تعلیم کے بعد واپس گئے تو انہوں نے گھر میں بچے خاندان کے لوگوں کے ساتھ رہنا پسند نہیں کیا۔ وہ اندر سے ٹھکے ہو چکا تھا ایک طرف اس کے پاس اجتماعی زندگی کا تصور تھا تو دوسری طرف مغرب کی انفرادیت اس میں رواج پس گئی تھی۔

آخر میں ہمیں یہ گھوں لگا کہ ہم دوسرے معاشروں کے ماحول کو مغربی ماحول اور تکنیکی کی مدد سے ہمارے ہاں کر رہے ہیں۔ یہ اندازہ لگایا گیا ہے کہ ہر سال ایک ملین فن سلفرک ایسڈ سوئین پر گرتا ہے جو کہ دوسرے مغربی ملکوں کے مقابلہ میں زیادہ صنعتی نہیں ہے۔ میں خیال کرتا ہوں کہ وقت کے ساتھ اس سے زیادہ سٹیلز افریقہ پر گرے گا۔ دوسرے براعظموں کے جو لوگ کم ترقی یافتہ ہیں وہ فطری ذرائع مخطوط کئے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ فطرت کو قدرت کا منظر سمجھتے ہیں۔ ایک مضمون میں جسے کلیر سٹیرلنگ (CLARE STIRLING) نے سٹوڈنٹ انٹرنیشنل لکھا، اس کا عنوان تھا "تعلیم اسولن کی مہارت" وہ لکھتی ہے کہ:

"ہزار سال پہلے نیل کی وادی کے لوگ ڈیڑھاڑوں کو ہر اگست کے سچے میں دریا میں پیچھتے تھے تاکہ سیلاب کی دیوبی خوش ہو جائے۔ اس دیم کے بچے تک نیل کا سالانہ سیلاب مصر کے لئے فطرت کا شاندار تحفہ تھا۔"

اس نے اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ چونکہ مغربی تعلیم کی وجہ سے ہمہ گیر تعلیم نہیں ملتی ہے اس لئے وہ علاقے جو اس مغربی تعلیم کی وجہ سے پہلے زرخیز تھے، اب تو ابل زرخیز نہیں رہے۔ اب انہیں مصنوعی کھاد سے زرخیز کیا جا رہا ہے جس پر کافی رقم خرچ آتی ہے۔ اس وجہ سے مٹی کے برآمد کے علاقے حائر ہو رہے ہیں اور نیل کا ایسا صاف پانی کی وجہ سے کٹ رہا ہے۔ اس طرح ہر چیز ایک اچھے جذبے سے نکال گئی تھی اب وہ یہ ظاہر کر رہی ہے کہ کس طرح کوئی لائق فرد اور ادا اقلیت کی بناء پر فطری تہا کی کو دعوت دے رہا ہے۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ زمانہ ماضی کے انسان نے ہم سے زیادہ واقعی زندگی کا فوٹ دیا۔

لہذا اس مایوس کرنے والی کہانی کے آخر میں ہم پر یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ انسانی رشتوں اور جملہ خیالات میں مشرق، مشرق ہے اور مغرب اب تک مغرب ہے۔ اگرچہ ایشیا و افریقہ کے بہت سے ملکوں نے مغربی تکنیکی اور مغربی سیاسی فکر کو قبول کر لیا ہے اور آج یہ ٹیکنک نے دنیا کے ملکوں کو ایک دوسرے سے ملادیا ہے، اس لئے جب ہم چین کے سائنس کا یہ پیغام سننے ہیں کہ "مشرق سرخ ہے" تو دوسری طرف امریکی خزانہ و فوج کو چاند کی سطح پر چل تہی کرتے دیکھتے ہیں تو یہ سوچنا پڑتا ہے کہ ایک فتح اور بھی ہے جو بڑی مشکل ہے مگر ساتھ ہی یہی اہم بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان کسی طرح اپنی فطرت و طبیعت پر قابو پائے اور اسے تسخیر کرے۔

آزادی اور نیو کلو نیل ازم

آئی ہوگ وبلٹ

آزادی اور نیو کلو نیل ازم (NEO-COLONIALISM) نہ تو اور سے نازل ہوئے، نہ اس کا ایک رجحان ہے۔ یہ ایک تاریخی دہائی کے نتیجے میں پیدا ہوئے اور ان کی جڑیں نو آبادیاتی نظام میں پوشیدہ تھیں جس کی کاسیوٹی نے مغربی یورپی طاقتوں کو یہ مواقع دیئے کہ وہ نوآبادیات کے ذرائع پیداوار کو کنٹرول کریں۔ اور ان ذرائع کو اپنی ترقی میں استعمال کریں۔ لیکن اسی عمل کے نتیجے میں تضادات پیدا ہوئے اور ان ملکوں نے دولت و مراعات کو محفوظ رکھنے کیلئے حالات کو بدلنے کے ساتھ خود کو تہریل کرنا شروع کر دیا۔ یہی مارکسی تاریخ کی تفسیر میں انتہائی اہم نکتہ ہے کہ ہر تاریخی دور ذرائع پیداوار اور پیداواری قوتوں کے درمیان تصادم پیدا کرتا ہے۔ یہ تصادم سیاسی اور نظریاتی میدان میں بھی ہوتا ہے۔

یہاں ان کاسیوٹیوں اور تاریخی دہائیوں کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

1۔ عالمی معاشیات 2۔ فکلی سیاست 3۔ جیو پالیٹیکل حالت

نوآبادیاتی دور میں ذرائع پیداوار جس طرح زبردستی حاصل کر کے نوآبادیات کا استحصال کیا گیا اس کے نتیجے میں وہ اہم باتیں پیدا ہوئیں۔

براہ راست سیاسی اقتدار کی وجہ سے معاشی ذرائع پر قبضہ ہو گیا۔ ان کا اثر اقتدار اس قدر بڑھ گیا اور اس کی جڑیں اس قدر گہری ہو گئیں کہ براہ راست سیاسی اقتدار ختم کرنے کے بعد بھی ان کا معاشی اقتدار اسی طرح سے قائم رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ بڑے بڑے زرعی قدامت ان کے قبضے میں تھے۔ جب یہ قبضہ ختم ہوا تو اس وقت تک ذراعت کے پارے پارے ڈھانچے کو بدلا جا چکا تھا اور کھیتوں میں ایسی فصلیں پیدا کی جا رہی تھیں جن کی درآمد ضروری تھی۔ انہوں کی مصنوعات کے منجھکے ان کے پاس تھے اور پھر ان پر بیرونی لین فیسوں کا قبضہ ہو گیا۔ اسی طرح امپورٹ اور عالمی منڈیاں ان فرموں کے قبضے میں ہیں جن کی بین الاقوامی پوزیشن ہے جیسے یو ایٹد امریکی کمیٹی، اور جان ہو سبہ فیو۔ اس وجہ سے نوآبادیات کی کل پیداوار ان کے قبضے میں آئی اور اس طرح "میرٹلنگی جائیداد" کو بین الاقوامی قانون کے

تحت قدس کا درجہ دے دیا گیا۔ اس صورت میں براہ راست سیاسی اقتدار کے بغیر بھی ان کا قبضہ ذرائع پیداوار پر رہا۔ یہ نیو کلو نیل ازم کا ایک انتہائی اہم پہلو ہے۔

دوسرا اہم نتیجہ یہ ہوا کہ نوآبادیات میں یورپی اقوام نے اپنی ضروریات کے تحت انہیں اس بات پر مجبور کیا کہ وہ صرف خام مال پیدا کریں اور پھر اسے یورپی ملکوں کو برآمد کریں۔ اس کے بدلے میں تادلہ کے طور پر ان سے تیار شدہ صنعتی اشیاء خریدیں۔ اس سلسلے میں جو شرائط مقرر ہوئیں وہ یورپی ملکوں کے موافق تھیں اور یہی شرائط اور غیر مساوی تجارت نیو کلو نیل ازم کا ایک انتہائی اہم ستون ہے۔

1950ء کی دہائی میں جب کہ بہت سی نوآبادیات آزاد ہوئیں تو اس زمانہ میں یورپی ملکوں نے اپنی پالیسی کو تبدیل کیا اور خراج ہونے والی اشیاء (CONSUMER GOODS) کی جگہ انہوں نے پیدا کرنے والی اشیاء (PRODUCERS GOODS) جیسے مٹھیں، ادا "پلانٹ" اور انجینئرنگ کے اوزار بننے آزاد ملکوں کو بھیجا شروع کر دیے۔ انہوں نے اس بہت کا اندازہ لگا لیا کہ نوآبادیات میں آزاد ہونے کے بعد خراج ہونے والی اشیاء جیسے کپڑا، ماہی اور سکرٹ کی مانگ نہیں رہے گی، اس لئے اب انہوں نے ان کا درجہ بڑھا کر انہیں ایک ایسی منڈی میں جس میں دنیا جنسین کپڑا بنانے اور ماہی و سکرٹ بنانے کی مٹھیں چاہئیں۔ کیونکہ نئے آزاد ملکوں میں زبردست خواہش تھی کہ وہ صنعتی ترقی میں مغرب کے برابر ہو جائیں۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مغربی طریقہ کو اختیار کیا اور مغربی ملکوں نے ٹیکنالوجی کو منتقل کرنے کے ذریعے ان کے ذرائع پر اپنے کنٹرول پر قرار رکھا۔ چونکہ ان ملکوں میں ٹیکنالوجی کی کمی تھی، اس لئے مغرب کی اچھا وادی قائم ہو گئی اور پھر ان کی سرمایہ کاری کی وجہ سے ملتی پھلتی کمپنیوں وجود میں آئیں۔ اب خام مال کے ذریعہ جڑیں انہیں ملکوں میں تیار کر کے وہیں فروخت کر دی جاتی ہیں۔ نوآبادیاتی دور میں سیاسی و ملکی طور پر ایک اور تضاد اس عمل سے پیدا ہوا کہ یورپی حکمرانوں نے اپنی پسند کے لوگوں کو منتخب کر کے نہیں تربیت دی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ یہ طبقہ حکمرانوں اور رعیت کے درمیان ترجمان کے فرائض سرانجام دے اور جیسا کہ میکس کمارٹا تھا کہ یہ لوگ رنگ و نسل کے اعتبار سے تو بدعوت تھے ہوں گے مگر اپنے ذہنی "فطرت" بن دور ذاتی کے اعتبار سے انگریز۔ انہیں صرف انگریزی لکھنے اور پڑھنے کی تعلیم دی گئی تاکہ یہ بھی کہ وہ یورپی طرز میں سوچیں۔ اسی حقد نے "فرکار اس تضاد کو دریافت کیا کہ ایک طرف یورپی مشترک آزادی، اخراج و مساوات کی بات کرتے تھے اور ان کے نظریات پر یورپی معاشرے میں عمل بھی ہو رہا تھا مگر نوآبادیات میں یہی لوگ "جبر" نسل پرستی اور استحصال کے

ذریعہ حکومت کر رہے تھے۔ انہوں نے مغربی سیاسی تحریکوں کے ذریعہ جمہوریت، قومیت اور موٹل'زم کے بارے میں سیکھا۔

قومیت کے جذبہ نے تعلیم یافتہ اور عوام کے درمیان ایک تعلق پیدا کیا اور جب انہوں نے غیر ملکی مفاد کے خلاف 'راوی کی تحریک چلائی تو اس میں مختلف نسلی و مذہبی گروہ مل کر ایک ہو گئے۔ 'راوی کی یہ تحریکیں کی ملکوں میں بڑی خوں ریز ثابت ہوئیں اور یورپی حکمرانوں نے انہیں بیداری سے کچلنے کی کوششیں کیں۔ اس لئے ایسے تمام ملکوں میں جہاں یہ تحریکیں پھیل رہیں اور عوام نے ان میں شامل ہو کر جالی دہائی دیاں دیں جیسے انڈیا اور الجزائر، ان ملکوں میں آزادی کے بعد ترقی کے امکانات زیادہ روشن ثابت ہوئے۔ لیکن ان ملکوں میں جہاں سیاسی ضرورت کے تحت یورپی طاقتوں کو آزادی دینی پڑی وہاں وہ اپنے تربیت یافتہ لوگوں کو چھوڑ آئے جو کہ مستحسن قسم پرست تھے، اور آزادی کے بعد یہ طبقہ ان کے سے زیادہ شدید ثابت ہوا۔

اس سلسلہ میں فرانز فین نے بڑی حد کی بات کہی ہے کہ بدحوالیوں اور مراعات کے باعث یہ طبقہ اقتدار کے نور بعد ہی سیاسی طور پر شعلوں اور مرنے کا شکار ہو گا اور جب اس کے سلسلے کوئی تاریخی معنی باقی نہیں رہا تو انہوں نے اس بات کی کوشش نہیں کی عوام سے اپنا رابطہ قائم رکھیں۔ اس لئے وہ ایک ایسا طبقہ بن گیا جو نہ کلونیل ازم کی سرپرستی میں سیاسی بل اور فوجی لحاظ سے مستحکم ہو گیا اور عوام سے اپنا رشتہ کاٹ کر ان کا گمناش بن گیا۔

نئے آزاد ہونے والے ملکوں میں جب کئی سیاسی عہدے پر قابض ہو جاتا ہے تو وہ لاتعداد حریف جماعتیں اور امیدواروں میں گھر جاتا ہے اور اسے ہر وقت اپنے عقل ہونے اور اقتدار سے محروم ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ اس لئے وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی طاقت اور عہدے کو پوری طرح سے ذاتی مفادات پورے کرنے میں صرف کرے۔ چونکہ اس کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ اس کی مراعات یافتہ حیثیت زیادہ عرصہ تک نہیں رہے گی لہذا وہ تھوڑے عرصہ میں سب کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اس لئے دولت کے حصول، ذاتی مقبوضات کے لئے وہ جمہوری اداروں کو فوجی ارادے کا پتلا ہے۔ اس عمل سے ترقی دینے کے نژاد ملک 'مرد اور بعضی حکومتوں میں تبدیل ہو گئے اور اپنے تختہ کی خاطر غیر ملکیوں اور ان کی کمپنیوں کے لئے کام کرے گئے۔ اس سے نئے کلونیل ازم کا ملک کی داخلی سیاست میں بھی اثر و سحر پیدا ہوا۔

دوسری جنگ عظیم تک روایت ہائے عہدہ امریکہ نے اپنی صنعتی ترقی کو اس قدر بڑھایا تھا کہ وہ دوسری یورپی طاقتوں کے مقابلہ پر آگیا تھا اور اس منزل پر پہنچ گیا تھا کہ اس کی صنعتی

پیداوار کے لئے غیر ملکی مصنوعات کی ضرورت تھی۔ اگرچہ 1898ء میں متون کلیہ کے تحت امریکہ کا تسلط لاطینی امریکہ پر قائم ہو چکا تھا لیکن وہ برطانیہ، فرانس، جرمنی اور جاپان کی ایشیائی و افریقی نوآبادیات کو جسے رشک سے دیکھ رہا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ اسے بھی ان میں سے حصہ ملنا چاہئے۔ اس وقت امریکہ کی پالیسی 'بکھلے دروازے' (OPEN DOOR) کی تھی۔ وہ بین الاقوامی مناسبات میں آزادانہ تجارت چاہتا تھا۔ وہ یورپی طاقتوں کے 'وادی اثر' کے بھی خلاف تھا اور معلوم نوآبادیات کے عوام کے لئے حق خود اختیاری اور آزادی کا قائل تھا۔

لیکن دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کے خیالات میں بڑی تبدیلی آئی۔ کیونکہ جنگ کے بعد ایک طرف طاقتیں تھیں تو دوسری طرف شکست خوردہ۔ اس میں وہ طاقتیں بھی تھیں جنہوں نے فتح کے علاوہ سب کچھ کھو دیا تھا اور وہ شکست خوردہ بھی تھیں جنہوں نے فتح کے علاوہ سب کچھ حاصل کر لیا تھا۔ لیکن ان میں امریکہ واحد ملک تھا جو سب سے زیادہ فائدہ میں رہا۔ اس لئے ان امریکیوں کی قربانوں کے بدلہ میں جو کہ اتحادیوں کی حمایت میں مارے گئے تھے، قیمت طلب کی اور قیمت یہ تھی کہ امریکہ کے زیر اثر ایک بین الاقوامی معاشی نظام تشکیل دیا جائے۔ یہ بات جنگ کے ابتدائی دنوں ہی میں امریکی کنسلنگ قانون ریشیشن نے ایک بیوروکریٹ میں کہی تھی، جس میں امریکہ کی اقتصادی اور فوجی برتری کو غیر جرمن یورپ میں برطانوی امپائر اور مشرقی ایشیا میں قائم کرنے کا منصوبہ بنایا گیا تھا۔ یہ غیر جرمن علاقے 'گرانڈ ایریا' (GRAND AREA) سے موسوم کئے گئے۔ نوآبادیات کو آزاد کرانا ان کی منصوبوں پر قبضہ کرنا اور وہاں سے تمام مال حاصل کرنا اس منصوبہ کے اہم عناصر تھے۔

اس لئے دوسری جنگ عظیم کے ختم ہوتے ہی گرانڈ ایریا میں امریکی اثر و سحر قائم ہو گیا۔ اتحادی طاقتوں نے بہت جلد اس بات پر اتفاق کر لیا کہ امریکہ کی سربراہی میں بین الاقوامی معاشی تنظیم کو تسلیم کر لیا جائے۔ اس کے نتیجے میں 'ورلڈ بینک' آئی۔ ایم۔ ایف (IMF) اور گٹ (GATT) کے اداروں کی تشکیل ہوئی۔ چند ہی سالوں کے اندر اندر آزاد دنیا کی معیشت کے گزیر سیاسی و فوجی حصار باندھ دیا گیا (NATO) اور نو مین (1947ء) کے نظریہ کے تحت سوڈسٹ ملکوں کے خلاف سوڈ جنگ شروع کر دی گئی تاکہ ان کے پھیلاؤ کو روکا جا سکے۔ امریکہ نے اعلان کر دیا کہ 'ہم مالی پولیس بین الاقوامی ادارہ کے آزاد لوگوں کی دغا کے ہر حصے میں مداخلت کرے گا' اس غیر رسمی امپیریلزم کی امریکی پالیسی نے جو 1970ء تک رہی اس کی جیسی ہوئی مداخلت نے اس کے عزم کو جس پر وہ چھپا دیا اور لوگوں کو اس کے صحیح عزم کا پتہ نہ چلا۔

مثلاً برٹن وڈز (BREITON WOODS) کے بائیری سسٹم میں امریکی ڈالر اور سونے میں ایک رشتہ قائم کیا گیا۔ جب ڈالر کی حیثیت سونے کے برابر قرار پائی تو وہ دنیا کی ایک ایسی کرنسی ہو گئی کہ اسے کہیں بھی تبدیل کرایا جاسکتا تھا اور دوسری کرنسیوں کے مقابلہ میں اس کی قیمت بھی زیادہ تھی۔ اس وجہ سے امریکہ کی تجارتی کمپنیوں کو ڈالر کی قیمت میں ہر چیز سستی ملنے لگی اور ان کی یہ حیثیت ہو گئی کہ وہ دنیا کے ہر ملک میں سہاویہ کاری کر سکیں۔ اس لئے 1945ء سے 1963ء تک امریکہ نے سمندر پار ملکوں میں سہاویہ کاری کی۔ 1968ء کے بعد اسے شہر کی مدد دینی میں امریکی سہاویہ اور اس کے حصص دنیا میں سب سے زیادہ تھے۔

دوسری مثال گٹ (GATT) کی ہے۔ یہ اور امریکہ کے اصرار پر قائم کیا گیا تھا تاکہ تجارت کو آزاد کر لیا جاسکے۔ آزاد تجارت کے بارے میں سمارک نے کہا تھا کہ ”آزاد تجارت مضبوط طاقت کے لئے ایک فطری پالیسی ہے۔“

جب جنگ کے بعد پوری یورپی طاقتیں تھ ہو گئیں اور انہیں اپنی معیشتوں کو دوبارہ لگانا پڑا تو اس وقت امریکہ ہی سب سے زیادہ معیشتیں پیدا کرنے والا ملک تھا۔ اس طرح یورپی ملکوں نے اپنی معیشتوں کو دوبارہ سے چلانے کے لئے امریکی ٹیکسٹوں سے مشینیں اور چھریں خریدیں۔ امریکہ نے انہیں ڈالین ڈالر کی مدد مارشل پلان کے تحت دی اور شرط یہ مقرر کی کہ وہ گٹ کو تسلیم کریں۔ امریکی سہاویہ کاری کی اجازت دیں اور امریکی اشیاء درآمد کریں۔ آخر میں یہ کہ کسی بھی کیونسٹ کو اپنی حکومت میں شامل نہ کریں۔

اس طرح سے اشیاء و افریقہ کے ملکوں میں امریکی امپیریٹرم رائج ابدی حالہ اور بین الاقوامی اداروں کے ذریعہ مسلط کیا گیا اور ان اداروں کو تیسری دنیا کے غیر مسلم ملکوں کو قرضہ دینے اور ان ملکوں میں سہاویہ کاری کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ کئی ’ایم’ ایف’ اور ورلڈ بینک’ کے ادارے ہیں جن پر امریکی تسلط ہے جن شرائط کے ساتھ یہ قرضے دیتے ہیں ان کے تحت حقیقت میں یہ ان ملکوں کی حکومت چلاتے ہیں مثلاً یہ انہیں مجبور کرتے ہیں کہ کرنسی کی قیمت کم کریں، پبلک سیکٹر میں اثراہات لگائیں اور ایسی معیشتیں لگائیں جن سے انہیں فائدہ ہو۔ یہ ان حکومتوں پر اتنا بڑا ڈال دیتے ہیں کہ انہیں پیسے قرضوں کی ادائیگی کی فکر ہوتی ہے اور اسے عوام کو غوراکھ سمجھ کر لے لیتے ہیں۔

جہاں امریکہ ان ان ڈیٹریٹ طریقوں میں کام ہو جاتا ہے جہاں وہ براہ راست مداخلت کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرتا ہے۔ 1945ء میں امریکہ نے یونان، ’کیمبوڈیا‘ نام ’لبنان‘ اور ’سنگاپور‘ کے بیٹے اور مال سلواڈور میں مداخلت کی۔ اس کے علاوہ جب ضرورت پڑتی تو

اس نے یونان، ’ترکی‘ ایران، ’موریتانیہ‘، ’جنوبی ویتنام‘، ’کمبوڈیا‘، ’جنوبی کوریا‘، ’بنگلہ دیش‘، ’چلی‘، ’گھانا‘، ’ڈومینیکا‘ اور ’ہیٹی‘ کی حکومتوں کو بدل دیا۔

تاریخ ایک تسلسل اور تبدیلی کا نام ہے۔ ہر کسٹ سورتوں کا فرض ہے کہ وہ اس قدر کو واضح کریں کہ کون سا تاریخ کا صحیح تجربہ ہی انسانیت اور دنیا کے عوام کی قسمت بدلنے کے لئے ضروری ہے۔

نو آباداتی نظام اور ’امپیریٹرم میں اشیاء‘ افریقہ اور لاطینی امریکہ کے عوام نے انتہائی برداشت کیں۔ اگر ان سے چٹکارا پانے کے سوتے نہیں ملے تو انہوں نے شعور کی کمی کی وجہ سے خلع کر دیے۔ آج پھر تیسری دنیا کے عوام اس بحران کے شکار ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ عوام میں وہ شعور پیدا کیا جائے کہ وہ اس مروجہ آزادی حاصل کرنے کے مواقع کو نہ کھو سکیں۔

1960ء کی دہائی میں وہ غیر رسمی امریکی امپیریٹرم پروان چڑھا تھا کہ اس وقت اپنے ہی بوجھ سے دبا ہوا کنویر ہو رہا ہے اور اس کی باتر رہا۔ حالات میں لگاتار پڑ چکے ہیں۔ اس کے جوہر پر بین الاقوامی تعلقات اور بائو کے ملکوں کے حریفانہ جذبات کی وجہ سے یہ آپس میں برسرِ پیکار ہونا شروع ہو گئے ہیں۔ اس لئے تیسری دنیا کی ملکوں کو امپیریٹرم کی اس معاشی اور سیاسی کنویرٹی سے فائدہ اٹھا کر اپنی ترقی کے لئے کچھ کرنا چاہئے۔

انقلاب کیا ہے؟

زبان میں ہر لفظ اور اصطلاح کی ایک تاریخ ہوتی ہے۔ بعض الفاظ اور اصطلاحات ایک خاص ماحول اور عہد کی نشاندہی کرتے ہیں اور ہر وقت بدلنے کے ساتھ ان کا استعمال ختم ہو جاتا ہے اور وہ حروفِ قراۃ سے بدلے جاتے ہیں۔ مگر کچھ الفاظ اور اصطلاحات ایسی ہیں جو وقت کی تبدیلی اور سماجی و سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ اپنے معنی اور مفہوم کو بدلتی رہتی ہیں اور اس طرح تاریخی عمل کے پہلو پہ پہلوئی جھون اور معنیوں کے ساتھ ذمہ دہتی ہیں۔ فیصلہ الفاظ میں سے ایک لفظ ریولوشن ہے جس کا ترجمہ اردو میں انقلاب کیا جاتا ہے۔

اس لفظ کی تاریخ معاشرے کی بدلتی ہوئی تاریخ سے متعلق ہے کیونکہ اس کا مفہوم اور معنی ہر عہد اور زمانہ میں وقت کے ساتھ ساتھ بدلتا رہا۔ یہاں تک کہ آج یہ لفظ اپنی ابتدائی معنیت کو کروی معنیوں میں استعمال ہوتا ہے اس لئے اگر دیکھا جائے تو اس ایک لفظ میں انسانی تاریخ کی بدلتی ہوئی تاریخ چھپی ہوئی ہے۔

ریولوشن کے لغوی معنی ہوتے ہیں 'واپس پھرتا'، 'رہا'، 'بار بار ہوتا'۔ اس طرح اس کے دو مفہوم نکلے۔ اول 'حرکت کے ساتھ تبدیلی ہونا' دوم 'حرکت کے ساتھ کسی چیز کا دوبارہ سے اپنے مرکز پر واپس آ جانا' ایک پھر میں گردش کرنا یا مدد پذیر کی صورت میں اترنا اور چرنا۔

قدیم یونان اور روم میں ریولوشن انہیں معنیوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس مفہوم کے ذریعہ سیاسی نظام میں تبدیلی تو آتی تھی مگر یہ تبدیلی ایک پھر میں ہوتی تھی۔ اس لئے افلاطون سے لے کر مشہور مورخ پلینی تک نے اس کی تشریف کرتے ہوئے کہا کہ سیاسی نظام ایک پھر میں گردش کرتے ہیں 'یعنی بادشاہت'، 'امیرا' کی حکومت' چکر سہی' اور 'جمہوریت'۔ نتیجہ میں چکر کہ انتشار 'بدلتی' اور 'تغییر' پیدا ہو جاتی ہے' اس لئے اس کا معنی مل گیا ہے کہ دوبارہ سے بادشاہت آ جاتی ہے۔ سیاسی نظاموں کی یہ تبدیلی انقلاب کہلاتی تھی۔ یہ ایک پھر تھا ہر چاروں ممالک اور اسے بار بار دہرایا جاتا تھا اور اس سے کسی صورت میں بدلتا نہیں تھا۔ نتیجہ میں کہ اس وقت تک بادشاہت کے نظام کو سب سے بھر کچا جاتا تھا

اور اس میں تمام بعد وادہاں اور اقتدارت ایک شخص کو سنبھالنے جاتے تھے۔ اسی کی ذمہ داری ہوتی تھی کہ ملک میں امن و امان کو قائم کرے' اس کا اصلی اصولوں سے دفاع کرے' اور رعیت کی نگہداشت ہی طرح کرے کہ جیسے ایک چرواہا اپنے گھڑ کی کرتا ہے۔ اس کے ہر شخص جمہوری نظام کو برائوں کی جزا کھا جاتا تھا کیونکہ اس میں ذمہ داری کسی ایک فرد واحد پر نہیں ہوتی تھی۔ اور عوام کے ایک طبقہ کو یہ حق مل جاتا تھا کہ وہ حکومت کے کاموں میں شریک ہو۔ اس لئے یہ نظام مراعات یافتہ طبقوں کے لئے نا پسندیدہ تھا اور جب بھی یہ نظام قائم ہوتا تو وہ اس کے خلاف متحد ہو جاتے تھے' اور جب اس کے نتیجہ میں ملک میں بد امنی اور شورش ہوتی تو وہ اس کی ساری ذمہ داری جمہوری طور حکومت پر ڈال دیتے' اور اپنی خواہشات کے مطابق دوبارہ سے بادشاہت کو قائم کرتے تاکہ ان کی مراعات بھر سے قائم ہو جائیں۔ اس لئے مراعات یافتہ طبقہ انقلاب کو پسند نہیں کرتا تھا' کیونکہ اس کے ذریعہ بار بار سیاسی نظام بدلنے لگتا تھا' معاشرے کے احوال میں تبدیلی آتی تھی۔ اس لئے ان کی خواہش تو یہی ہوتی تھی کہ کسی طرح سے انقلاب کو روکا جائے اور تاریخ کے عمل کو ایک جگہ ٹھہرے رکھا جائے۔

قرنوں وسطی میں سیاسی حالات کی تبدیلی نے انقلاب کی مفہوم میں ایک تبدیلی کی' مگر یہ اس حد تک صرف بادشاہت کو ایسے نظام سمجھا جاتا تھا کہ جس میں تحفظ' عدل' اصلاح اور سکون تھا' اس لئے بادشاہت کے خلاف کسی بغاوت کو جرم سمجھا جاتا تھا' لیکن جب بادشاہت کا دائرہ اس حد میں مضبوط ہو گیا' اور دوسرے سیاسی نظام اس کی جگہ نہیں لے سکے تو خاندانی بادشاہت نے ظلم' عیاشی اور نا اعلیٰ حکمرانوں کو پیدا کیا' اور انہوں نے جب اپنے اقتدار کے خلاف متاع سے لوگوں پر ظلم و ستم شروع کے تو اس وقت یہ بحث شروع ہوئی کہ اگر بادشاہت خراب ہے تو کیا اس کو ہٹانے کے لئے حالات کا استعمال کیا جائے؟ اور کیا ایسے بادشاہ کے خلاف بغاوت جائز ہے؟ اس بحث میں خرابی کی ذمہ داری مفہوم پر ڈال جاتی تھی وارے پر نہیں کیونکہ دوسری اہمیت کو اس وقت تک زیادہ محسوس نہیں کیا گیا تھا۔ اس لئے اس بحث کے نتیجہ میں خراب بادشاہ کو تو ہٹایا جاسکتا تھا مگر بادشاہت کے ادارے کو تبدیل کر کے اس جگہ کسی دوسرے سیاسی نظام کو قائم کرنے کا خیال کسی کو نہیں تھا۔ 1776ء میں جان آف سائرس بری نے اس بات کا واضح الفاظ میں اظہار کیا کہ کسی ظالم بادشاہ کے خلاف بغاوت کرنا اور اسے قتل کرنا عہد کے عہد سے صحیح ہے کیونکہ یہ قانون کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اقتدار کو اپنے لئے استعمال کرتا ہے۔ اس کے برعکس مشہور جینی رائٹس اکیونانے 1774ء میں کہا کہ آمر اور ظالم بادشاہ کے خلاف بغاوت سے پرہیز کرنا چاہئے کیونکہ اس سے رد عمل کا ایک سلسلہ

شرح ہو جائے گا جس کے نتیجہ میں امن و امان برپا ہو جائے گا۔ اس لئے ہر آمر اور ظالم بادشاہ کو برداشت کرنا چاہئے کہ نگہ بدامری صورت میں بغاوت ہوگی جو معاشرے کے سکون کو برباد کر دے گی۔

اسی قسم کے خیالات کا تصور عہدِ عباسیہ کے "خری عہد میں مسلمان قیصر اندوری نے اپنی کتاب احکامِ اسلامیہ میں کیا کہ اگر کوئی عصبِ طاقت کے زور پر حکومت پر قابض ہو جائے تو اسے اس لئے جان و سکنوں کا خیم کر لینا چاہئے کہ اس کے پاس قوت و طاقت ہے۔

مشہور عیسائی مصنف کلون (1563ء) نے بھی بتا دیا کہ طاقت کی طاقت کی اور کہا کہ تکلیف افغان بغاوت کرنے سے لڑا ہوا ہے۔ ان نظریات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ بادشاہت کے اوارے کا استحکام مرعات و فرائض کے خلاف میں قائم نہ کیے تک ایک ظالم اور عیاش حکمران بھی امراء اور بڑے اہل علم کے مخالفت کا تحفظ کرتا تھا۔ اس لئے ترقی و ترقی میں انقلاب کی اصطلاح کا مفہوم بتا دیا "شورش" سرکشی اور خرابی تھا اور اس مفہوم کو وہ صرف حکمران کے تبدیل ہونے یا حکمران خاندان کے بدلنے کے لئے استعمال کرتے تھے۔ اس میں انقلاب کی کامیابی یا ناکامی سے بحث نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ اسے محض ایک سیاسی اصطلاح کے استعمال کیا جاتا تھا۔

سترھویں صدی تک انقلاب کو انیس چھٹیوں میں لیا جاتا تھا کہ ایک ایسا سلسلہ ہو مرحلہ در درجہ بدرجہ گزر کر پھر اپنے مرکز پر واپس آجائے۔ مگر اس عہد کے آخر میں اس کے معنی میں تبدیلی آئی اور اب اسے اس مفہوم میں استعمال کیا جانے لگا کہ وہ تبدیلی جو راجہ کو الٹ پلٹ کر رکھ دے اور مکمل طور پر کسی چیز کو بدل دے۔ اس میں راست کے معاملات میں کسی تبدیلی کا ہونا "حکمران خاندانوں کا بدلنا" اور دستور کا بدلنا شامل تھا۔ اسی پس منظر میں انگریزی کے شاعر ملن نے 1749ء میں پارلیمنٹ کی سڑکے موت کو بھیج کر کہا "اور کہا کہ انقلاب، ایک اچھی چیز ہے کیونکہ اس کے ذریعہ لوگ حکومت تبدیل کر کے ایسی حکومت قائم کرتے ہیں جو ان کے مفادات کے لئے بہتر ہوتی ہے۔

اسی عہد میں مفکرین نے اس بات پر بھی بحث کی کہ چونکہ حکمران اور عوام کے درمیان ایک عہد ہے، اس لئے اگر بادشاہ معاہدہ سے آگے بڑھ جاتا ہے اور نا انصافی کرتا ہے، اپنے فرائض سے غفلت برتتا ہے تو اس کے خلاف اٹھ کھڑا ہونا چاہئے اور ایسی صورت میں بادشاہت کے اوارے کو ختم کرنا درست ہے۔ ایسی خیالات کو بلی ازم میں حقوق انسان کے نام سے پیش کیا گیا۔ جس کے تحت، قدار اعلیٰ کے مالک عوام کو قرار دیا گیا۔

انگریزی مفکر جان لاک نے حقوق انسانی کے بارے میں کہا کہ یہ وہ نہیں ہیں کہ جنہیں

دستور اور قانون کے ذریعہ لیا جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں انہیں واپس بھی لیا جاسکتا ہے بلکہ یہ حقوق اس لئے ہیں کہ وہ انسان ہے، ان حقوق کی بنیاد غفلت میں ہیں۔ اس لئے یہ معاشرہ کی طاقت کے باوجود بنی رہتے ہیں کیونکہ یہ حقوق معاشرے کی تشکیل سے پہلے اس لئے انہیں کھینچے "پائے" اور ختم کرنے کا حق کسی کو نہیں ہے، اگر کوئی ایسا کرے تو اس کی اطاعت کی ضرورت نہیں، کیونکہ حکومت کا فرض ان حقوق کی حفاظت کرنا ہے انہیں ختم کرنا نہیں۔

حقوق انسان کے اس تصور کے پس منظر میں متوسط طبقے کی خواہشات اور انگلیں تھیں جو حکومت کی طاقت کو محدود کر کے اپنی سرگرمیوں کو وسعت دینا چاہتے تھے، جن میں تجارت اور صنعت کا فروغ شامل تھا۔ آگے چل کر ان خیالات کا اثر امریکی اور فرانسیسی انقلابات پر ہوا اور ان کے دستوروں میں حقوق انسان کو شامل کیا گیا۔

فرانسیسی انقلاب کے بعد اس کے معنی اور مفہوم میں تبدیلی آئی۔ اب اس کا مطلب گردش و لائیں بنا، بلکہ تاریخی عمل کی ہر کیفیت جو بنیادی تبدیلی لائے اسے انقلاب کہا گیا۔ اس کے نتیجہ میں سیاسی تبدیلی کے ساتھ ساتھ قانونی، تجارتی، سماجی اور اقتصادی طور پر ہر بنیادی تبدیلی آئی اسے بھی انقلاب کہا گیا۔

امریکہ میں برطانوی نوآبادیاتی نظام کے خلاف جو جدوجہد ہوئی اسے ابتدا میں امریکی انقلاب نہیں سمجھتے تھے، بلکہ جنگ "آزادی" سمجھتے تھے۔ مگر 1787ء میں اس معنی نے اس کے لئے انقلاب کی اصطلاح کو استعمال کیا اور بعد میں اس کی قبول ہو گئی۔ فرانسیسی انقلاب نے اس نقطہ کو مزید وسعت دی، "نورینسٹن" کی فرانسیسی انقلاب کی علامت بن گئی۔ اس انقلاب نے ترقی اور جمہوریت کے خیالات کو فروغ دیا اور انقلاب کا یہ مفہوم ہوا کہ حکومت کے خلاف عوامی جدوجہد، شہریوں کا فوج سے مقابلہ کرنا اور شہروں کا سیاسی سرگرمیوں اور انقلابی جدوجہد کا مرکز بننا اور اس کے نتیجہ میں بنیادی سیاسی، سماجی و سماجی تبدیلی کا آنا۔

فرانسیسی مفکر کوٹورے نے اس بات پر زور دیا کہ انقلاب کا لفظ صرف ان تبدیلیوں کے لئے استعمال کیا جائے کہ جن کا مقصد آزادی ہو۔ فرانسیسی انقلاب کے بعد وہاں حالات نے جو رخ اختیار کیا، تو اس کے نتیجہ میں "تقدیر" نقل و حرکت گئی اور قدیم نظام کے خلاف کمرے غارت کے جذبات ابھرے، اس سے یہ تاثر پیدا ہوا کہ انقلاب ہر وارے "معاہدہ اور قدر" کو مکمل طور پر ختم کر دیتا ہے، اور اس کے لئے سے معاشرے میں انتشار پیدا ہوتا ہے اس لئے وہ طبقات جو قدیم نظام میں تمام مرعات سے فائدہ اٹھاتے تھے انہوں نے اس کی سخت مخالفت۔

کی اور انقلاب کو جان و مال اور جاندار کے تحفظ کے لئے غلبہ سمجھا اور انقلاب کا یہ تاثر دیا کہ اس سے تشدد، خون ریزی پیدا ہوتی ہے اور اس عمل سے انتشار و بے چینی جنم لیتی ہے۔ اس طرح سے ایک بار پھر لٹا کر دوش والا نظریہ دہرایا گیا کہ تاریخ بد شہادت اناری کی تہذیب اور فنی آمریت کے چکر میں گردش کرتی رہتی ہے۔ اسٹیل کے چارٹر صفر تک اور جرمنی کے چارٹر صہرک نے انقلاب کی اس وجہ سے مخالفت کی کہ اس کے نتیجہ میں آمریت و مطلق الاستاتیت پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ جب انقلاب برجنے کو توڑ پھوڑ کر رکھتا ہے اور عوام کو بغیر تحفظ کے لاکھوئیت کے ماحول میں لٹکڑا کرتا ہے تو اس وقت وہ ہر اس طاقت کی حمایت کرتے ہیں جو انہیں تحفظ فراہم کرتی ہے۔ اس نکتے کے تحت فرانسیسی انقلاب نے نہیں کو پیدا کیا اور روسی انقلاب نے اٹمان کو ختم کیا۔ دونوں نے انقلاب کے اثرات کو ختم کر کے آمریت و مطلق الاستاتیت کو قائم کیا۔

تاریخی عمل کے نتیجہ میں اس وقت انقلاب کا وہ مفہوم ہو گیا ہے وہ یہ ہے کہ اچانک اور تشدد کے ذریعہ سیاسی لوادوں اور ملتی و معاشی اقدار و مطالبات کی تبدیلی کی جن سے اسانی حقوق کی حفاظت ہو اور یہ انقلاب قدیم حد کو ختم کر کے ایک نئے عہد کی ابتداء کرے۔ انقلاب کے اس مفہوم کے تحت فرانسیسی روسی اور چینی وہ بڑے انقلابات ہیں کہ جن کے ذریعہ بنیادی تبدیلی آئی، حکمران طبقے بدل گئے اور پورا معاشرتی و معاشی ڈھانچہ نئی بنیادوں پر استوار ہوا۔ اس لئے انقلاب کا مطلب ہوا کہ وہ تبدیلی جو حکمران طبقوں کو بدلے اور قدیم نظام کو صہرک کر کے نئے نظام کی ابتداء کرے۔ اس عمل میں تشدد کو لازمی طور پر اس لئے اختیار کرنا پڑتا ہے کہ پھر اس کے قدیم نظام کے حامی اپنی مراعات اور حیثیت کو چھوڑنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس لئے صحیح انقلاب وہ ہے کہ جو انسانوں کے پیچھے ہوئے حقوق انہیں واپس دے دے اور معاشرہ میں مساوات اور انصاف کو قائم کرے۔ اتحادیں صدی سے پہلے انقلاب کی پہلی نکتہ سے باہر مقبولیت نہیں ہوتی تھی مگر فرانسیسی انقلاب نہ صرف اپنے ملک میں بلکہ یورپ اور دنیا کے دوسرے ملکوں میں مقبول ہوا اور انہیں اپنے نظریات سے متاثر کیا۔ روسی انقلاب نے انقلاب کے تصور میں یہ تبدیلی کی کہ یہ اچانک سیاسی حکومتوں کے بدلنے کا نام نہیں بلکہ سیاسی تبدیلی ایک حویلی انقلابی عمل کی ابتداء ہوتی ہے کہ جس کے دوران معاشی و سماجی تبدیلیاں لائی جاتی ہیں اور معاشرہ کو مکمل طور پر بدلا جاتا ہے۔

انقلاب کے ان مثبت نتائج نے اس لفظ کو مثیل عام بنا دیا اور اس سے یہ تاثر قائم ہوا کہ انقلاب کے ذریعہ جو بھی تبدیلی آئی ہے وہ عوام کی ملاح و بہبود اور ان کے حقوق کے تحفظ

کے لئے ہوتی ہے۔ اس لئے عوام میں یہ خیال بڑھ گیا ہے کہ صرف انقلاب ہی کے ذریعہ معاشرہ میں بنیادی تبدیلی کو لایا جاسکتا ہے۔ اسی میں ان کی نجات ہے اور اسی کے ذریعہ وہ ختم و ختم سے بچ سکتے ہیں۔

اس وجہ سے انقلاب ایک محرک لفظ ہو گیا ہے جو عوام کی انگلیوں اور خواہشات کا ترجمان ہے۔ اس لئے عوام کے ذہن کو متاثر کرنے کے لئے اس لفظ کو آمیز اور مطلق الامان غنیمتوں سے بھی استعمال کیا کہ جن کی حکومتیں فاشزم کے اصولوں پر قائم تھیں مگر انہوں نے اپنے اقتدار میں آنے کو انقلاب سے موسوم کیا۔ یار ڈا بیٹے بھی جو قدیم نظام کو برقرار رکھنا چاہتے تھے انہوں نے انقلاب کی اصطلاح استعمال کر کے یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ان کی حکومتیں بنیادی تبدیلی کی حامل ہیں اس لئے ان حکومتوں میں جو نام نہاد اصلاحات کی گئیں انہیں انقلاب کا نام دیا گیا جیسے شاہ ایران نے نئی زرعی اصلاحات کو سفید انقلاب کہا حالانکہ یہ اصلاحات نہ تو حکومتی دھانچہ میں کوئی تبدیلی لائیں اور نہ ذراعت میں۔

لو تہذبات کے خارج کے بعد جب ایشیائے افریقہ اور لاطینی امریکہ کے ممالک آزاد ہوئے تو ان ملکوں میں آزادی کے بعد عوام میں یہ امیدیں تھیں کہ وہ بہت جلد فہریت و اللاس اور جماعت سے نجات پائیں گے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے غیر ملکی اقتدار کے خلاف جدوجہد میں حصہ لیا اور جان و مال کی قربانیاں دیں مگر جب ان ملکوں میں یار ڈا بیٹے بر سر اقتدار آئے تو انہوں نے اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے واکہدائی نظام کو اسی طرح سے برقرار رکھا اور انہیں لوادوں کے ذریعہ اپنے عوام کا استحصال جاری رکھا۔ جب عوام میں ایسی حکومتوں کے خلاف نفرت پڑی تو فوج نے اس سے فائدہ اٹھایا اور ان کا تختہ الٹ کر حکومت پر قابض ہو گئی۔ فوج کا اچانک حکومت پر قبضہ کرنا ممکن نہ تھا۔ مگر انہوں نے اسے انقلاب کا نام دیا اور تھوڑے وقت کے لئے عوام میں حیثیت حاصل کرنے کے لئے اصلاحات بھی شروع کیں۔ مگر کیسے بھی اس فنی حکومت نے نہ تو حکمران طبقوں کو بدلا اور نہ ہی عوام کو اقتدار میں شریک کیا۔ اس لئے یہ حکومتیں محض انقلاب کا نام تبلیغ رہیں مگر بنیادی طور ان کا طرز حکومت آمرانہ ہی رہا۔ اسی طرح سے انقلاب کے لفظ کو جب ہر آمر اور ڈکٹیٹر نے اپنے سیاسی مقصد کے لئے استعمال کیا تو اس سے لفظ کی محرک بنیادی فنی فرقہ واریت تباہ کر دیا اور عوام اپنے سیاسی شعور کے بڑھنے کے ساتھ اس فرقہ کو سمجھ گئے ہیں کہ کون سا انقلاب تبدیلی لانا ہے اور کون سا انقلاب محض شعور کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ یہ فرقہ اگر ذہن میں ہو تو انقلاب اسب بھی اپنے میں جماعت اور دلکشی لئے ہوتے سروریلوں میں مگر اور باقی میں امید کی روشنی لے کر آتا ہے۔

انقلاب کا پیدائشی مفہوم

معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ انقلاب کے لفظ کا استعمال دوسرے شعبوں میں بھی ہوا۔ مثلاً اس لفظ کو سولہویں صدی میں سفاروں کی حرکت کے لئے استعمال کیا جاتا تھا اور مشہور سائنس دان کوپرنیکس کی کتاب میں یہ لفظ شامل ہے۔ اس وقت یہ عقیدہ تھا کہ سفاروں کی حرکت سے زمین کے حالات متاثر ہوتے ہیں اور زمین کا انقلاب آسمان پر ہونے والا ہے۔ یہ عقیدہ تھا کہ زمین پر ہونے والی تبدیلیاں آسمان سے آتی ہیں۔ اس کے بعد سائنس کے رجحانوں میں ضرور ایک انقلاب آیا۔ کیونکہ اس تصور کے تحت زمین کی مرکزی حیثیت ختم ہو گئی اور اب اس وسیع کائنات میں دوسرے سفاروں کی طرح ایک معمول اور حقیر سیارہ بن گئی۔ اس نے انسان کی برتری کو بھی ختم کر دیا اور وہ ایک غیر اہم مخلوق بن کر رہ گیا۔ اس کے بعد سائنس دانوں نے جو قرائن نظریات پیش کئے اس نے سائنسی انقلاب کی بنا رکھی۔ اس انقلاب کی وجہ سے معاشرے میں جو تبدیلی تیزی آئی اس سے پورے معاشرے کے معاشرتی، اقتصادی و سیاسی احوالوں کو بدلنے میں مدد دی۔

کوپرنیکس کے بعد دو اہم سائنسی نظریات نے سائنسی انقلاب کو اور موثر بنایا۔ ان میں ایک اداروں کا نظریہ رقیما تھا۔ جس سے مذہب کے عقائد کی نفی کر کے اسے رد کر دیا۔ دوسرا آئن سٹائن کا نظریہ اضافیت تھا کہ جس کی وجہ سے اب ہر چیز اضافی ہو گئی ہے اور کوئی قدر 'ادامہ' یا 'مستحکم' اور عقیدہ اب آفاقی اور ابدی نہیں رہا ہے۔ اس نے عقائد کی دنیا میں ایک زبردست انتشار پیدا کر دیا۔

سائنسی انقلاب کے نتیجے میں حقیقت کا عراج ہوا اور عقیدہ گنہگار ہوا۔ اس کے زیر اثر دوسرے علوم بھی تجربات اور وسائل کی روشنی میں سائنسی اصولوں پر تشکیل ہونا شروع ہوئے تاکہ ہر چیز کی وجہ و ریافت کی جائے اور معاشرتی اور سماجی مسائل کے قوانین و ریافت کئے جائیں۔

سائنسی انقلاب کا اثر یہ ہوا کہ انسانی معاشرہ جو اب تک توہمات اور اندھے عقائد میں جکڑا ہوا تھا اب اس سے بچتا رہا ہے۔ ہر نئی سائنسی ایجاد اور نظریہ انسان کو برابر مافوق

الطبع قوتوں سے آزاد کر رہا ہے۔ انسان اب نہ صرف اس دنیا کو اور کائنات کو سمجھ رہا ہے بلکہ خود اپنے آپ سے بھی آگاہ ہو رہا ہے۔ اس کے سماجی و سیاسی معاملات پر بھی اثرات ہو رہے ہیں۔ مثلاً ایک ماڈرن نسل کا طریقہ سفید اقوام میں بڑا مقبول تھا اور وہ خود کو دوسری رنگ و درنگوں سے برتر سمجھتے تھے۔ اب سائنس نے ان تمام باتوں کی تردید کر دی ہے۔ اس کی وجہ سے دوسری رنگ و درنگوں میں اعتماد اور یقین پیدا ہوا ہے اور وہ ترقی کی دوڑ میں تیزی سے شریک ہو رہے ہیں۔

سائنسی ایجادوں نے انسان کی زندگی پر گہرے اثرات ڈالے ہیں اور ان کی وجہ سے معاشرے میں ذات پات، طبقہ و خاندان کی اجارہ داری کم ہو گئی ہے اور جمہوری اقدار کا فروغ ہوا ہے۔ ذرا غور و فکر سے دیکھا جائے تو ایک دوسرے سے قہرپ کر کے پرانے تضادات اور نفرتوں کو دور کیا ہے۔

سماجی اور سائنسی ایجادوں کو کامیاب بنانے میں چھاپ کی مشین کی ایجاد نے اور چھاپ خانوں کے قیام نے انتہائی اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ خیالات کو پھیلا دیا جائے اور انھیں عوام کے ہر طبقہ تک پہنچا دیا جائے۔ اس وجہ سے چھپ خانے کے قیام کو ایک انقلاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے تعلیم ایک محدود طبقہ میں تھی۔ کتابیں ملنی ہونے کی وجہ سے نہ صرف قیمتی تھیں بلکہ عام آدمی کی پہنچ سے دور بھی تھیں۔ مفکروں اور دانشوروں کے خیالات خاص طبقوں تک محدود رہتے تھے اور عوام تک ان کی رسائی نہیں ہوتی تھی۔ چھاپ خانے نے ان مسائل کو حل کر کے کتابوں اور تعلیم کو عام کر دیا۔ امریکی فرانسیسی 'درسی' اور چینی انقلابوں میں مددگار بن گئے۔ روس نے 'امریکی' نوجوانوں میں تبدیلی کی خواہش کو بیدار کیا بلکہ قدیم نظام کے خلاف نفرت پیدا کی۔ چھاپائی عس کے نتیجے میں جب اخباروں اور رسائل کی ابتدا ہوئی تو اس نے ایک دوسرے انقلاب کی بنیاد رکھی۔ لوگ ہر روز کی خبروں اور تبدیلیاں جانتے ہوئے حالات سے باخبر رہنے لگے۔ اسی لئے پریس کو 'محررہ امیٹ' کہ کیا جس کی طاقت و قوت سے حکومتیں بھی ڈرتی ہیں۔ اسی لئے غیر جمہوری حکومتیں پریس اور کتابوں پر سانسور کی پابندیاں عاید کرتی ہیں تاکہ لوگ حقیقت سے باخبر نہ ہوں اور انھیں سیاسی احساس نہ ہو۔ لیکن فن تمام پابندیوں کے باوجود بچے ہوئے الفاظ لوگوں میں حرکت پیدا کرتے رہتے ہیں اور انھیں متحرک رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

سائنسی انقلاب کے نتیجے میں ذرا غور و فکر سے سب سے انقلاب آیا۔ اگرچہ اس لفظ کو سیاسی معنوں میں استعمال کیا گیا اور اسے سرخ انقلاب کے مقابل میں لایا گیا مگر یہ ضرور ہے کہ

سائنسی ایجادات نے ذرا غور و فکر سے سب سے انقلاب کیا اور اس کو رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں کسی انسان کو بھوکا نہیں رہنا چاہیے مگر آج بھی قحط پڑتے ہیں۔ جنگ سال کے سبب غلہ کی کمی ہوتی ہے اور اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ ذرا غور و فکر سے سب سے انقلاب کیا اور اس کو رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں

اس ضمن میں صنعتی انقلاب کا تذکرہ بھی ضروری ہے۔ یہ ان فنی اور سائنسی ایجادات کی وجہ سے آیا کہ جنہیں انسان کی جگہ دی گئی۔ اب تک ہر کام انسان کرتا تھا اب وہ کام مشینوں کی مدد سے کیا جانے لگا ہے۔ انسانوں اور جانداروں کی حرکت اور توانائی کی جگہ غیر جاندار، شیاؤں نے لے لی۔ دست گاڑی کے بجائے اب اشیاؤں جہیز مشینوں کی مدد سے بنائی جاتے لگے۔ اس سے یہ انقلابی تبدیلی آئی کہ ذرا غور و فکر سے سب سے انقلاب کیا اور اس کو رکھتے ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں

کاروں پر تھی۔ اب وہ جہیز کر صنعت ہو گیا اور پیداوار کا ذریعہ مشینیں ہو گئی۔ صنعتی انقلاب نے معاشرے کے سماجی اور سماجی ڈھانچے کو بدل کر رکھ دیا۔ زمینداری جگہ سرمایہ دار بننے لگی۔ کسانوں کی جگہ مزدور بن گئے۔ پھر نئے قہرپ کر کے پرانے تضادات اور نفرتوں کو دور کیا۔ اس کی وجہ سے یہ ممکن ہوا کہ خیالات کو پھیلا دیا جائے اور انھیں عوام کے ہر طبقہ تک پہنچا دیا جائے۔ اس وجہ سے چھپ خانے کے قیام کو ایک انقلاب قرار دیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس سے پہلے تعلیم ایک محدود طبقہ میں تھی۔ کتابیں ملنی ہونے کی وجہ سے نہ صرف قیمتی تھیں بلکہ عام آدمی کی پہنچ سے دور بھی تھیں۔ مفکروں اور دانشوروں کے خیالات خاص طبقوں تک محدود رہتے تھے اور عوام تک ان کی رسائی نہیں ہوتی تھی۔ چھاپ خانے نے ان مسائل کو حل کر کے کتابوں اور تعلیم کو عام کر دیا۔ امریکی فرانسیسی 'درسی' اور چینی انقلابوں میں مددگار بن گئے۔ روس نے 'امریکی' نوجوانوں میں تبدیلی کی خواہش کو بیدار کیا بلکہ قدیم نظام کے خلاف نفرت پیدا کی۔ چھاپائی عس کے نتیجے میں جب اخباروں اور رسائل کی ابتدا ہوئی تو اس نے ایک دوسرے انقلاب کی بنیاد رکھی۔ لوگ ہر روز کی خبروں اور تبدیلیاں جانتے ہوئے حالات سے باخبر رہنے لگے۔ اسی لئے پریس کو 'محررہ امیٹ' کہ کیا جس کی طاقت و قوت سے حکومتیں بھی ڈرتی ہیں۔ اسی لئے غیر جمہوری حکومتیں پریس اور کتابوں پر سانسور کی پابندیاں عاید کرتی ہیں تاکہ لوگ حقیقت سے باخبر نہ ہوں اور انھیں سیاسی احساس نہ ہو۔ لیکن فن تمام پابندیوں کے باوجود بچے ہوئے الفاظ لوگوں میں حرکت پیدا کرتے رہتے ہیں اور انھیں متحرک رکھنے میں مدد دیتے ہیں۔

انقلاب کی ایک قسم شافعی انقلاب بھی ہے۔ ہر سیاسی حکومت اپنے احکام کی خاطر آرٹ و ثقافت کو استعمال کرتی ہے۔ لیکن دانشور، ادیب و شاعر اور معمر اپنے فن کو اگر عوام کے لئے استعمال کریں تو اس سے انقلابی عمل کو تیز کر دیا جاسکتا ہے۔ ایسویں صدی میں دانشوروں و مصوروں نے آرٹ کو اس مقصد کے لئے استعمال کیا تاکہ عوام کے سیاسی شعور کو بیدار کیا جائے۔ انھوں نے سماجی نظام پر تنقید کر کے اس کی خرابیوں کو اجاگر کیا اور لوگوں کو اپنی طور پر بیدار کر کے انھیں عملی جدوجہد کے لئے تیار کیا۔

سرخ انقلاب میں انقلاب کی اصطلاح اس قدر مقبول ہو گئی ہے کہ یہ اب ہر فنی سائنسی ایجاد نظر سے گزرے بغیر خیال کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ اور 'انقلابی تبدیلی' کو ہر بات کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ ہر جدید اور چمکانے والی بات اس کی علامت ہے کہ لوگ زندگی کے ہر شعبہ میں فیصلہ سازی کی خواہش مند ہیں۔ اور اس تبدیلی کو وہ انقلاب کے ذریعہ پورا کرنا چاہتے ہیں۔

انقلاب کے نظریات

مارکس نے انقلاب کے نظریہ کو مائیکس کی بنیادوں پر استوار کیا اور دنیا کی تاریخ کی تشریح اس طرح سے کی کہ سے مختلف ادوار اور دوروں میں تقسیم کیا اور پھر اس بات کو ثابت کیا کہ تاریخ میں اقوام عالم ایک عہد سے دوسرے عہد میں سماجی انقلاب کے ذریعہ گزرتی ہیں۔ یہ سماجی انقلاب تاریخ کے نئے ناگزیر تھ کیونکہ اس نے بنیادی تبدیلیوں کے ذریعہ انسانی معاشرے کو نئے کی جانب بڑھایا۔

مارکس کے خیالات کے مطابق ہر عہد کی سیاسی و سماجی و معاشی تاریخ اور اسے روایات اور عقائد پیداواری طریقوں کے زیر اثر تشکیل دیتے ہیں اور تاریخ کے ہر عہد میں طبقاتی جدوجہد جاری رہی ہے اور سماجی تاریخ اس طبقاتی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ انسانی معاشرہ میں انقلاب وہ درجہ ہے جو زندگی کے ہر شعبہ میں تبدیلی لاتا ہے۔ چونکہ وہ سماجی انقلاب کو پیداواری اذرائع سے متعلق کر دیتا ہے اس لئے وہ سیاسی انقلاب سے جدا کر دیتا ہے کیونکہ سیاسی انقلاب صرف سیاسی حکومت کی تبدیلی کا نام ہوتا ہے۔ سیاسی انقلاب سماجی انقلاب کا ہر وہ حصہ ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ حکمران طبقوں کا غلبہ ہوتا ہے جو تہمتل انقلاب ہے جو درجہ پیدائش میں تبدیلی لائے اور معاشرہ کو بنیادی طور پر تبدیلی کرے۔ سیاسی انقلاب ایک دوسرے سے ملے ہوئے بھی ہیں اور علیحدہ بھی۔ بعض مارکس۔ "ہر انقلاب قدیم حکومت کو الٹ دیتا ہے اس نقطہ نظر سے یہ سیاسی انقلاب ہے۔"

سماجی انقلاب بیش تر ترقی کی جانب ہوتا ہے۔ اور اس کے ذریعہ سے فرسودہ اور بیکار روایات ختم ہو کر ان کی جگہ ترقی پر مبنی روش خیال قومیں جگہ لیتی ہیں۔ اس طرح سماجی انقلاب میں رعیت پسند اور ترقی پسند دونوں قومیں تصادم ہوتی ہیں اور بغیر طبقاتی جدوجہد کے یہ انقلاب عمل نہیں ہوتا ہے۔

انقلاب کی شرط یہ ہے کہ حالت والاہر ایک طبقہ سے لال کر دوسرے طبقے کے ہاتھ میں آئے۔ انقلاب وہ کہ میں ہیں فرق ہے کیونکہ کوئی صرف غلبہ میں اور جہتیں بدلتی ہیں۔ سے سازش۔ اور یہ ہوتا ہے اور اس کے ذریعہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوتی ہے۔

انقلاب تاریخ میں اس لئے اہم رہے ہیں کہ یہ سماجی استحصال کو ختم کر کے معاشرہ کو آزادی اور اداوایا ہی پر منظم کرتے ہیں۔ یہ تاریخ کی سرحدوں کو توڑتے ہیں اور جب معاشرہ ایک عہد سے دوسرے عہد میں آتا ہے تو اس کی ترقی کی علامت ہوتا ہے ہر دور میں سماجی پیداوار آگے کی جانب بڑھتی ہے اور اس کے ساتھ آزادی کی حدود بھی وسیع ہوتی ہیں۔ ہر نیا دور اس لئے قدیم دور سے آگے ہوتا ہے کہ یہ کیونزم کے حصے کو قریب لاتا ہے۔

لہذا مارکس کے مطابق سماجی انقلاب وہ ہے کہ جس کے ذریعہ نظام میں بنیادی تبدیلی لائی جائے اور یہ تبدیلی عوام کی اکثریت کی خواہش کے مطابق ہو اور اس کو تبدیل کرنے میں ان کی شرکت ہو اس لحاظ سے یہ سیاسی انقلاب سے مختلف ہوتا ہے جو کہ عوام کی شرکت کے بغیر اوپر سے دیا جاتا ہے۔

سماجی انقلاب اس وقت آتا ہے جب کہ اصلاحات کے تمام دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ اس کا پہلا کام ریاست پر قبضہ کر کے اس کے تمام اداروں کو ختم کرنا ہوتا ہے تاکہ پروتاری طبقہ کی آمرت کو قائم کیا جائے۔ سماجی انقلاب جمہوری القاد کے حق میں ہوتا ہے کیونکہ اس کے ذریعہ عوام کی اکثریت کو باعمل ملتا جاتا ہے۔

(BRO) عوام مارکس نے سماجی انقلاب کی اصطلاح کو استعمال کیا جس کا مطلب تھا کہ ایک بار جب سماجی انقلاب ایک معاشرہ میں آجائے گا تو اس کے زیر اثر دوسرے معاشرہ میں انقلابی تبدیلیاں جاری رہیں گی یہاں تک کہ طبقاتی تضادات ختم ہو جائیں گے۔ فرانسل نے روس میں انقلاب کے بعد اس بات کا اعادہ کیا کہ یہ انقلاب یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی آئے گا اور جب یہ عمل شروع ہو گا تو روس کے گاؤں اور داعی شکل اختیار کرے گا یہاں تک کہ حوصلہ ازم دنیا پر فتح حاصل کر لے گا۔

مارکس نے سرمایہ داری کے خلاف پروتاری انقلاب کی راہیں چھینیں۔ اس کے نظریہ کے مطابق جس طرح اب تک تاریخ انقلابات کے ذریعہ بدلتی رہی ہے اسی طرح نظام سرمایہ داری بھی اصلاحات کے ذریعہ ختم نہیں بدلا جائے گا بلکہ اس نظام کے تضادات انقلاب کو لازمی بنا دیں گے۔ اور یہ انقلاب اس نظام کے پروتاری لے کر آئیں گے۔ سرمایہ داری نظام کے تاریخی طبقہ کے استحصال پر قائم ہے انہیں معاشی طور پر محروم رکھ کر اور ان کی محنت کے ساتھ یہ سرمایہ داری کی بنیاد ہے۔ اس لئے پروتاری طبقہ اپنی محنت کے بدلے سے محروم انقلاب کے لئے داعی طور پر تیار رہتا ہے۔ اب یہ انقلابی پارٹی کا فرض ہے کہ وہ ان میں سیاسی شعور پیدا کر میں تاکہ وہ اپنے تاریخی کردار سے واقف ہو سکیں اور جدوجہد کے لئے تیار ہوں۔

مارکس کے مطابق۔ "تاریخ کی پچھل تمام تحریکیں انقلابوں کی نہیں جب کہ پروتاری خود بھی سے معمور اکثریت کی خود مختار تحریک ہوگی اور یہ تحریک اکثریت کے مفاد میں ہوگی۔ اس نے وہ جو نیا سماجہ تشکیل دیں گے اور جسے اکثریت کی حمایت ہوگی وہ ان طبقوں کو بھی پورے پورے حقوق دیں گے جو مستحالی نظام کا حصہ تھے۔ مارکس اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

"ورکنگ کلاس کی آزادی طبقاتی مراعات کے لئے نہیں ہوگی بلکہ حقوق و فرائض کے لئے ہوگی" اور اس کے ذریعہ سے تمام طبقاتی مراعات کا خاتمہ ہوگا۔"

مارکس نے 'پانگ'، 'مانی' اور 'یاکوفن' کے اس خیال کو رد کیا کہ انقلابوں کی ایک محدود جماعت سازش اور تشدد کے ذریعہ انقلاب لائے جاتی ہے اور اس کے لئے صنعتی حدودوں کی نیت اور نہیں متحد کرنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ صرف سیاسی و معاشی انتشار اور -گران -ہ حکومتوں کی فساد پیشوں کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں ان سے فائدہ اٹھا کر عوام کو بے بساختہ شریک کیا جائے۔

مارکس کے نظریہ کے مطابق اس طرح سے سوشلسٹ انقلاب نہیں لے سکتا ہے۔ ایک نئے انقلاب کے لئے اکثریت میں شعور کا ہونا لازمی ہے۔ اقلیت اگر کھلی حالات کو استعمال کر کے انقلاب لے بھی آئے تو یہ پائیدار نہیں ہوگا اس کے لئے پروتاری طبقہ کا پاشعور ہونا منظم ہونا اور اس کا انقلابی جدوجہد سے واقف ہونا ضروری ہے۔ وہ اس پر زور دیتا ہے کہ۔ "سیاسی انقلاب لانے والے اور بے گانگی طور پر والے پروتاری ہیں اور یہ انقلاب کے ذریعہ شان ساشو قائم کریں گے جو استحصال سے پاک ہوگا۔"

پروتاری طبقہ کا اس لئے بھی منظم ہونا ضروری ہے کہ جب وہ سرمایہ داری کے نظام کو ختم کر کے مراعات یافتہ طبقوں کو اقتدار سے محروم کریں گے تو اس وقت حکومت کے انتظام کے لئے ہزار ہا حمایت یافتہ افراد کی ضرورت ہوگی اس ضرورت کو ایک بھونٹی جماعت یا چند افراد پورا نہیں کر سکتے اس لئے ڈرامائی یا بہ تشدد واقعات پائیدار انقلاب نہیں لے سکتے۔

مارکس کے بعد بورژوا طبقوں میں انقلاب کے بارے میں تہذیبی تکی اور وہ اس کو روکنے کی تدابیر کرنے لگے۔ جب کہ مارکس اور اس کے پیروکار انقلابی جدوجہد کے ذریعہ تہذیبی کی کوشش کرنے لگے۔ جب یورپ میں 1848ء کے انقلاب اور 1871ء میں پریس کمیون کو ناکامی ہوئی تو اس کے نتیجہ میں یہ خیال پیدا ہوا کہ مسلح جدوجہد کے ذریعہ حکومتوں کو تہذیبی نہیں کیا جا سکتا ہے اس لئے جمہوری طریقوں سے ارتقائی اور بہ امن جدوجہد کی جائے۔

لیکن نے اس خیال کی بہ زور مخالفت کرتے ہوئے "ریاست اور انقلاب" میں لکھا کہ۔ "ریاست تحریکوں طبقوں کا آلہ کار ہے۔ جب تک ریاست موجود ہے معلوم طبقوں کی کامیابی ناممکن ہے۔ اس لئے انقلاب کے لئے عوام کی پختگی کا انتظار نہیں کرنا چاہئے بلکہ انقلاب کے لئے ایک خوب تربیت یافتہ اور باشعور جماعت تیار کرنا چاہئے۔"

یعنی انقلاب کا ہر نظریہ پیش کیا اس کے پس منظر میں روس میں زاروں کے خلاف ناکام بغاوتیں اور یورپ میں بڑھتی ہوئی سرمایہ دار طبقاتیں تھیں اور یہ طبقاتیں کو آہستہ آہستہ کی دھڑے اور منظم ہو رہی تھیں۔ لیکن نے اس پر زور دیا کہ قلم اور لکڑا دونوں کو استعمال کر کے ساشو کو بدلنے کی کوشش کی جائے۔ پروتاری طبقوں کے لئے زیادہ طاقت و آؤ سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ اقتدار حاصل کرنے کا ذریعہ صرف جنگ ہے اس لئے انقلاب وہ وقت پر منحصر ہے۔

1۔ ایک انقلابی جماعت جو منظم ہو اور حکومت پر قبضے کے لئے تیار ہو۔

2۔ مادی اور سیاسی -گران جو تحریکوں کو کنٹرول کر دیں گی اور جس کی وجہ سے انقلابی جماعت کو عوام کی حمایت حاصل ہو جائے گی۔ جب تک نچلے طبقے تحریکوں سے ہزار نہیں ہو جائیں گے اور جب تک تحریکوں طبقے -گرانوں پر قابو پانے میں ناکام نہیں ہو جائیں گے اس وقت تک انقلابی صورت حال پیدا نہیں ہوگی۔

یعنی کے نزدیک وہ انقلابی جماعت جو اقتدار پر قبضے کے لئے تیار ہو وہ مارکسٹ پارٹی ہوگی۔ اس سے اسے مشابہت کے ذریعہ ان بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر صنعتی مزدوروں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے تو وہ غریب یونین کی سیاست میں الجھ کر رہ جائیں گے۔ ان کے نہیں بڑھ سکیں گے اور اپنی حالت سدھارنے کے لئے انقلاب سے زیادہ اصلاحات پر زور دیں گے۔ صنعتی مزدوروں اور پروتاری طبقہ میں انقلابی شعور پیدا کرنے کا کام دانشوروں کا ہے وہ اس کام کو کرنے کے لئے آگے تھیں۔

1902ء تک لیکن اس بات کا قائل تھا کہ سوشلسٹ انقلاب کے لئے ضروری نہیں کہ اپنی جماعت بنانے کے لئے عوام کا بڑا حصہ شامل ہو۔ بلکہ انقلابوں کا ایک قریب یا دور -مدد بین میں دانشور اور سیاستدان ہوں وہ انقلاب کی راہیں ہموار کر کے انقلاب لے سکتے ہیں۔ مارکس کے بعد اس کے خیالات میں تہذیبی تکی اور اس لئے اس بات پر زور دیا کہ پارٹی میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو شامل کیا جائے مگر اختیارات چند لوگوں کے پاس ہی ہوں۔

انقلاب کی راہ میں لیکن کے نزدیک 'سپیئرل ازم' سب سے بڑی رکاوٹ ہے لہذا انقلابی

قومیں جن میں یورپ اور امریکہ کے صنعتی مزدور اور کسان ہیں اور ایشیا، افریقہ اور لاطینی امریکہ کی پورٹو قوی جنگیں ل کر جدوجہد کریں اور اسے کنٹرول کر کے انقلاب کی رکاوٹوں کو دور کریں۔ سرمایہ داری نظام جو بڑی بڑی کمپنیاں اور فرموں پر قائم ہے یہ اپنے ملک میں مزدوروں کو بھی رعایت دے کر ان کا انقلابی کردار ختم کر رہا ہے۔ روس میں جب پروتاری انقلاب کامیاب ہو تو یمن نے پسو کام یہ کیا کہ روس کو امپیریل ازم کے عالمی دائرے سے نکال کر عالمی سرمایہ داری اور امپیریل ازم کا زور ٹوٹ جائے اور عالمی انقلاب کی راہیں کھل جائیں۔

وقت کی تبدیلی کے ساتھ انقلاب کے نظریات میں بھی تبدیلی آتی چلی، ہر ملک کی حالت کے مطابق انقلابی جدوجہد کا منصوبہ بنایا گیا۔ ہر سوشلسٹ انقلاب اپنی ذات میں جدا لگ ہوتا ہے، اس کا کوئی ایک نمونہ نہیں ہوتا، اس کے دوسرے انقلابوں سے تجربہ حاصل کیا جاسکتا ہے، لیکن ہر انقلاب اپنے خاص ماحول اور حالات میں پروان چڑھتا ہے اور آگے کی جانب بڑھتا ہے۔ اب تک سوشلسٹ انقلاب جس جس ملکوں میں آیا ہے وہ وہاں علیحدہ خصوصیات کا حامل رہا ہے، یمن نے اس سلسلہ میں واضح طور پر کہا کہ ہر ملک میں جدوجہد کو اس کے حالات کے مطابق تبدیل کرنا چاہئے، مگر ہر انقلاب کی بنیادی خصوصیت یہ ہونی چاہئے کہ وہ سرمایہ داری نظام کو بدے اور پروتاری طریقے کو انکار میں لائے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے ہر ملک کو جداگانہ طریقہ اختیار کرنا چاہئے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد نوآبادیات میں وہ قسم کی قومی آزادی کی جنگیں لڑی جھیں کہ ان کو جنگیں جو قومی پورٹو طریقے نے قومیت کے نام پر لڑیں۔ یہ جنگیں دستور کی، قانونی بنیادوں پر لڑی جھیں اور نوآبادیاتی حکمرانوں نے حکومت کے ذریعہ ان ملکوں کو زیادہ کیا تاکہ ان کے جانے کے بعد بھی ان کے مفادات کا تحفظ ہو سکے۔ آزادی کے بعد وہ ان کے بحیثیت بین ملکی اور انہوں نے نوآبادیاتی نظام کو برقرار رکھ کر عوام کا استحصال جاری رکھا۔

دوسری قسم ان ملکوں کی تھی کہ جہاں جاگیرداری اور امپیریل ازم کے خلاف جدوجہد کی گئی۔ یہ جدوجہد خوب سرد اور سخت مقابلہ والی تھی، اس کی مثال یمن، لبنان، مصر، تیونس، الجزائر، بنگلہ دیش ہیں کہ جہاں عوامی جبروتیں قائم ہوئیں اور طبقاتی فرق کو ختم کیا گیا۔

اس وقت اکثر ان ملکوں میں نوآبادیاتی نظام سے آزاد ہونے ہیں، وہاں غیر حسداری حکومتیں قائم ہیں اور ان کے خلاف انقلابی قوتیں سرگرم عمل ہیں۔ اس جدوجہد کے نتیجے میں انقلاب کے نظریات میں نہ صرف تبدیلی آئی، بلکہ اس میں وسعت و وسعت گہریت پیدا ہوئی۔ ان

میں سے اکثر ممالک صنعتی طور پر بنی مائید ہیں اور ان کے عوام کی اکثریت 'جراثیم' اور 'توہمت' کی وجہ سے بہت پیچھے ہے، ان حالات میں انقلاب جدوجہد کس انداز میں شروع کی جائے؟

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے پی کومرا نے اس بات پر زور دیا کہ مقبول قوتیں اور طاقتیں قوت کے خلاف جدوجہد میں کامیاب ہو سکتی ہیں، اس لئے انقلاب کے لئے اس بات کا اظہار نہیں کرنا چاہئے کہ انقلابی صورت حال نکھیل کو پہنچے، بلکہ ایسی صورت حال کو جدوجہد کے ذریعہ پیدا کرنا چاہئے اور مصلوں کے ذریعہ حکومتوں کو کنٹرول کرنے کا منصوبہ بنانا چاہئے۔ اس کی کامیاب مثال یمن اور کیمیا کے انقلابات ہیں کہ جنہوں نے اپنی پس ماندگی کے باوجود انقلابی صورت حال کو پیدا کیا، اور حکومتوں کا تختہ الٹ کر حوالی اقتدار کو قائم کیا۔ اسی منصوبے کے تحت لکڑاگو میں انقلاب آیا اور 'حریت کا تختہ الٹا گیا' اور اب بھی جنگ اس وقت لپٹی ہے جس میں جاری ہے جو ایک طرف حکمران طبقوں اور دوسری طرف امپیریل ازم سے جدوجہد کر رہی ہے اور اپنے حالات و ماحول کے مطابق انقلابی عمل کو آگے بڑھا رہی ہے۔

اگرچہ مختلف راہنماؤں نے انقلاب کے بارے میں اپنے اپنے نظریات کو پیش کیا ہے، مگر تین دانشوروں نے کہ جن میں سے دو نے انقلابی سرگرمیوں میں عملی حصہ لیا، انقلاب کے بارے میں جو نظریات پیش کیے وہ مخصوص حالات کی پیداوار ہیں۔ یہ فرانسیسی، روسی، چینی، اور پورٹوگیزی ہیں۔

یمن کا کہنا ہے کہ نوآبادیاتی دور میں سرمایہ داری، کسانوں اور کاشت کاروں کے مفاد میں مرعات یافتہ ہو گئے ہیں اور اس نے ان کا انقلابی کردار ختم کر دیا ہے۔ اس لئے انقلابی تلاوی تشکیل میں پیچیدہ پیچیدہ پروتاریاں اور یمن پروتاری طبقہ کو ٹاکر نکالنا نہیں اور پھر ان کے ذریعہ انقلاب لانے کی جدوجہد کریں۔ افریقہ کا پروتاری طبقہ انتہائی کمزور ہے اور انقلاب لانے کا اہل نہیں ہے۔ لیکن اس بات کو تسلیم کرنا ہے کہ افریقہ سرداروں، جاگیرداروں، اور مذہبی راہنماؤں کے زیر اثر ہے اور صدیوں کی غلامی، 'توہمت'، جراثیم اور غلامی نے اسے بے حس بنا دیا ہے۔ ان کو اس حالت سے نکالنے اور ان میں شعور پیدا کرنے کے لئے ایک منظم جماعت کی ضرورت ہے۔ چونکہ کسان شہری زندگی کی آلودگیوں سے پاک ہیں اس لئے جب وہ باشعور ہو جائیں گے تو انقلاب کے لئے پرعش ہو کر جدوجہد کریں گے۔

زیر نے جو بویوں میں پی کومرا کے ساتھ تھا اس نے عالمی امریکہ کے مخصوص حالات میں انقلاب کا نظریہ پیش کیا اس کے مطابق لاطینی امریکہ کے کسان خاص طور پر

مسل ہیں اور یہ انقلاب کے لئے طاقت نہیں بن سکتے۔ قومی یورڈ واقعہ بھی اپنے مراعاتی کردار کی وجہ سے انقلاب میں کوئی حصہ نہیں لے سکتا۔ پروتاری اور مزبور قسری زندگی کی بد عنوانیوں میں غوطہ ہو گئے ہیں، اس لئے صرف طالب علم اور دانشور انقلاب لانے میں اہم کردار ادا کر سکتے ہیں، دوسری کشتوں کو ان کی بے حس سے نکل کر انہیں باہل بنائے جاسکتے ہیں۔

دائیں امریکہ میں ہر قسم کی بددھند ٹھیک نہیں، بلکہ صرف گورنر جی جی اس صاحب میں کامیاب ہو سکتی ہے کہ جس میں سیاسی و فنی کماؤ کا اتحاد ہو، یہ محدود گورنر بددھند اچانک ہو، کیونکہ اچانک حیلوں اور سرگرمیوں کی وجہ سے عوام کی اکثریت جو ہے جس ہے، اس میں شعور آنے کا اور چند باہل انقلابیوں کی حرکت انہیں بھجوا کر بیدار کر دے گی۔

پروفیسر مارکوز نے امریکہ اور یورپ کے ہنر مندوں کی بات پر زور دیا کہ ترقی یافتہ ممالکوں میں حدود طبقہ مرہبہ دارانہ نظام کا ایک حصہ بن گیا ہے اور اس کے بعد سے اس کا انقلابی کردار ختم ہو گیا ہے، اب یہ کام مکین پروتاری ہی کر سکتے ہیں مگر یہ حسب حق ممکن ہے کہ جب ان کی تربیت کا کام دانشور اور طالب علم کریں۔ مارکوز نے ان خیالات نے 1960ء کی دہائی میں امریکہ اور یورپ کی یونیورسٹیوں میں طالب علموں کی انقلابی تحریک کا آغاز کیا جس کی وجہ سے ان میں اور پختہ رشتوں میں نصاب کی سادگی اور انتظامیہ کے وساطت میں تبدیلیاں کیں۔

نظامی نظریات نے پچھلے سوئے مظلوم عوام میں چاہے وہ ایشیا میں ہوں، افریقہ میں، مستقبل کے لئے ایک امید پیدا کر دی کہ وہ نظم و انتظام سے لڑ کر معاشرہ کو تبدیل کر سکتے ہیں اور یہ تبدیلی انقلاب کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔

نی یٹیکنی ورنی ایجوکیشن نے بھی انقلاب دشمن طاقتوں کو مسموم کیا ہے۔ ان کا استعمال امریکہ نے دیکھ نام میں گورنر ان کے خلاف کیا، ان میں وہ حساس آئے تھے کہ جن کے ذریعہ ان کے خفیہ خفاؤں کا پتہ چلا گیا، وہ پھر ان پر حملہ کیا گیا۔ اس کے علاوہ طالب کو روکنے کے لئے پولیس فوج، خاموشی تحریکوں کے ادارے ہوتے ہیں، تحریروں و تقرروں پر پابندی، دوسرے مشرب وہ تحریروں سے ہیں کہ جن کے ذریعہ لوگوں تک نئے خیالات کو پہنچنے سے روکا جاتا ہے، اس کے بعد ایذا، تشدد، و بددھند گردی ہوتی ہے جس کے ذریعہ انقلاب کے کارکنوں کی جسمیں اور روحانی قوت کو توڑ دیا جاتا ہے جس کی یہ سب چیزیں مل کر انقلاب کی راہ کو روک سکتی ہیں؟

نہج کا جواب ہے نہیں!!

رسائل ایک سال = مئی پڑا ہوتا ہے کہ انقلاب کیوں آتا ہے؟ کیوں ایسے ہیچے ابھرتے

یہ جو انقلاب کے لئے جدوجہد کرتے ہیں؟ آخر کیوں لوگ اصولوں کی خاطر اپنی جان اور مال کو قربان کر دیتے ہیں؟ جب بھی معاشرے میں سماجی تضادات پیدا جاتے ہیں، عوام اور غلط طبقوں کی حالت غراب ہو جاتی ہے، سماجی بحران، قومی و سماجی شکستہ معاشرے کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے ہیں، لاکھائوںیت و بددھند جاتی ہے، حکومتی ادارے، محالوں پر قابو پانے میں ناکام ہو جاتے ہیں اور معاشرہ عدم تحفظ کا شکار ہو جاتا ہے، تو اس صورت میں حکمران طبقوں کا پس رو مل یہ ہوتا ہے کہ اصلاحات کے ذریعہ معاشرہ کی اس ٹوٹ پھوٹ اور انتشار کو روکا جاسکے، اس لئے ان اصلاحات میں قدر پرانے طبقوں کے پاس ہی رہتا ہے، اور وہ معاشرہ کی سادگی میں کوئی جدائی تبدیلی آئے نہیں دیتے، اس نے اصلاحات کے کوئی مثبت نتائج نہ نہیں دیتے، بعض اوقات حکمران طبقے نظام میں کسی بھی قسم کی اصلاح کر کے پتہ چار نہیں ہوتے وہ ایسی طور پر اس قدر بے اندازہ ہو جاتے ہیں کہ ان میں اصلاح کر کے کی اہلیت ہی ہوتی نہیں رہتی اور نظام اس قدر جکڑ جاتا ہے کہ اس میں اصلاح کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ اس صورت حال میں سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں بچتا کہ انقلاب کے ذریعہ نظام کو تبدیل کیا جائے۔ یہ صورت حال اس وقت جنوبی افریقہ اور اسرائیل میں ہے کہ جمہلی افریقیوں اور فلسطینیوں کے حقوق کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں اور اس لئے ان کے خلاف جدوجہد سخت اور پر تشدد ہے۔ اسی میں اسی صورت حال سے روس دو چار تھا کہ جہاں زار نے اصلاحات سے انکار کر دیا تھا، اور عین کے جاگیردار بھی اپنے نظام کو تبدیل کرنے پر تیار نہیں تھے، اسی صورت حال نے افریقہ میں پر تشددی نوآبادیات میں انقلاب کو پیدا کیا کیونکہ پر تشدد اپنی مراعات چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔

جب حقوق و معاش سے محروم لوگ محروم ہو کر نظام کو تبدیل کر کے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی پر امن جدوجہد کے کوئی نتائج نہیں نکلتے، اور ان کے مطالبات کا کوئی اثر نہیں ہوتا، تو اس صورت میں وہ اپنے حقوق کے لئے سبب بددھند کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ جب ان میں اور حکمران طبقوں میں تصادم ہوتا ہے تو سختی طور پر حکمران طبقے تشدد کے ذریعہ ان کی ہر تحریک کو ختم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر جس قدر تشدد ہوتا ہے، اسی قدر مزاحمت بڑھتی چلی جاتی ہے اور اسی قدر تحریک میں عوام کی اکثریت شامل ہوتی چلی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ حکمران طبقے ختم ہو جاتے ہیں، اور ان کے تشدد کے لوہارے فوج و پولیس و انتظامیہ کو روک دیا جاتا ہے، اور اسی وہ مرحلہ ہوتا ہے کہ جب انقلابی جماعت اس پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیتی ہے۔

اس وجہ سے پچھلے انقلابات ان ملکوں میں آئے ہو سکتی طور پر پس ماندہ تھے اور جہاں

مقتانی لڑتی بہت زیادہ تھی جیسے روس، چین، کیمیا، ویت نام، تائیوان اور افریقہ میں پرکٹوں
نہایت۔ ان ملکوں میں دولت اور مراعات چند طبقوں میں محدود ہو کر رہ گئی تھی اور دوسرے
طبقوں میں باصلاحیت افراد کی ترقی کے تمام راستے بند ہو چکے تھے۔ دوست و دشمنوں طبقوں کے
پاس قسمی غیر حکومت کا خزانہ خالی تھا اس لئے اخراجات کے لئے عوام پر ٹیکسوں میں اضافہ ہوا
اور جب اس کے نتیجہ میں عوام میں بے چینی پیدا ہوئی تو اسے روکنے کے لئے سخت قوا میں کا
نفاذ کیا گیا، تحریک و تقریر پر پابندیاں عائد کی گئیں، مخالفت کو مبالغے کے لئے قید و بند کی صعوبتوں کو
درجہ بنا دیا گیا مگر جب ملک میں ایک بار بد امنی ہو جائے اور حکومتی ادارے انہیں ختم کرنے
میں ناکام ہو جائیں تو اس سے ان کا وقار عوام کی نظروں میں ختم ہو جاتا ہے، ورنہ ان میں
مخالفت کے جذبات زیادہ زور پکڑ جاتے ہیں یہی کچھ ان ملکوں میں ہوا، انقلابی قوتوں کے خلاف
حکومتوں نے حالات کا استعمال کیا اور جب اس میں انہیں ناکامی ہوئی تو اس سے انقلابی تحریک
کی حیثیت میں اضافہ ہوا اور عوام کی بددلیاں ان کے ساتھ ہوتی چلی گئیں۔

ایک مرتبہ جب انقلاب کامیاب ہو جاتا ہے تو اس کا پسلا کام یہ ہوتا ہے کہ قدیم نظام کی
ہر چیز کو مٹا دے اور پرانی یادوں کو بالکل فراموش کر دے۔ اس لئے قدیم نظام اس کے
دادوں، لوہے، روایات کو جس جس کر دیا جاتا ہے اور نئے نظام کی بنیادیں انہیں استوار کی
جاتی ہے، اور زندگی کے ہر پہلو میں نئی ابتداء کے ساتھ کام کیا جاتا ہے۔ حکمران اور مراعاتی
طبقوں کا رول ہوتا ہے، ورنہ سیاسی و معاشی اور معاشرتی اصلاحات کے ذریعہ بنیادی تبدیلیاں
دینی جاتی ہیں، اور نئے نظام کی تشکیل میں عوام کی کثرت شریک ہوتی ہے، کیونکہ وہ انقلاب
عمل سے گزر چکے ہوتے ہیں اس لئے ان کا شعور اور جذبہ نئے نظام کو تباہی بخاتا ہے۔

انقلاب سے صرف ایک ہی سر زمین اور ملک متاثر نہیں ہوتا بلکہ اس سے اس کے
میں اور دوسرے ملک بھی متاثر ہوتے ہیں، اور انقلاب کے خوف سے یا تو حکمران طبقے
اصلاحات کا سہارہ لیتے ہیں۔ یا تشدد کے ذریعہ اپنے اقتدار کا تحفظ کرتے ہیں، لیکن ان دونوں
موتوں میں معاشروں میں تبدیلی ہوتی ہے۔

فرانسیسی انقلاب

دنیا کی تاریخ میں فرانسیسی انقلاب اپنے اثرات کی وجہ سے انتہائی اہمیت کا حامل ہے
کیونکہ اس انقلاب نے معاشرے میں بنیادی تبدیلیاں کیں۔ قدیم نظام کا نام و نشان مٹا دیا اور
اس کی جگہ نئے اداروں اور روایات کی بنیادیں ڈالیں۔ یہ انقلاب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ
یہ فرانس میں تو تھا کہ یورپ میں مذہب و ثقافت کا مرکز تھا اور یہاں علم و دانشوری کی
روایات بھی گہری تھیں۔ اس وجہ سے اس انقلاب نے اپنے ہمہ گیر ملکوں کو فوراً ہی متاثر کیا
اور انقلاب کے دوران اور اس کے بعد میں حال تک یورپ میں جو جنگیں ہوئیں۔ اس نے
یورپ کی تاریخ کو بدل ڈالا۔

فرانس میں یہ انقلاب کیوں آیا؟ ٹیگور نے اس سلسلہ میں ایک دوسرا ہی نقطہ نظر پیش
کیا کہ انقلاب ہمیشہ ظلم و دہشت اور احساس محرومی کی وجہ سے نہیں آتے ہیں بلکہ یہ اس وقت
بھی آتے ہیں جب معاشرہ میں خوشحالی آجاتی ہے۔ فرانسیسی انقلاب کے بارے میں اس کی
راے تھی کہ انقلاب سے پہلے کسانوں کی حالت بہتر تھی اور حکومت ممالک کے حل کے لیے
اصلاحات کرنا چاہتی تھی۔ اصلاحات کی ابتداء کر کے حکومت نے خود اپنے ستمگ اور قائم شدہ
نظام کو توڑ دیا اور انقلابی راہیں ہموار کر دیں۔ کیونکہ جب لوگ حکومت کے ظلم و استحصالی کا
ظہار ہوتے ہیں تو بے بسی کے ساتھ ہر ظلم کو برداشت کرتے ہیں لیکن جب وہ دیکھتے ہیں کہ
حکومت کی سختی کم ہو رہی ہے اور وہ مراعات دینے پر تیار ہے تو وہ اس کے خلاف ہوتے چلے
جاتے ہیں اور ان کے مطالبات کی تعداد بڑھتی جاتی ہے۔ اور حکومت کی ہر اصلاح اور
مطالبات کو انہیں اس کی گزروں کو ظاہر کرتا ہے اور اس کی وقعت عوام کی نظروں میں گر جاتی
ہے۔ اس لئے ٹیگور کے نزدیک حکومت کی اصلاحات نے فرانسیسی انقلاب کو پیدا کیا۔

فرانسیسی انقلاب کے پس منظر میں فرانس کے سماجی و معاشی اور سیاسی عوامل کار فرما تھے جو
تہہ بہ تہہ اس کے معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلیاں لا رہے تھے۔ انھارویں صدی تک فرانس
تین بڑا اور چار گھروں کے مالک تھے، وہ ملک کے تمام برائی اور مالی وسائل پر
تسلط تھے۔ جو لوگ دس سے محروم تھے وہ ان پر انحصار کرتے تھے اور ان کے حاکم ہوا کرتے

تھے۔

لیکن جب معاشرہ میں تبدیلی آئی اور تجارتی طبقہ بھرنا شروع ہوا تو اس نے آرامت سے ہٹ کر تجارت میں دین اور صنعت و حرفت میں اپنی نہایت کواستعمال کرنا شروع کیا اور بہت جلد یہ طبقہ شہروں پر قابض ہو گیا۔ اس طبقہ میں ڈاکٹر، وکیل، تاجر، بنکار، دستکار، ماسٹر کار اور ہنرمند شامل تھے۔ چونکہ اس طبقہ کی پشت پر کوئی جاگیردار یا جائیداد نہیں تھی اس لئے انہوں نے اپنے اپنے پیشوں میں سخت محنت و مشقت کی اور خود کو مالی لحاظ سے بہت جلد مستحکم کر لیا۔ یہاں تک کہ اقتصادی خسارے اور مالی بحران میں یہ شاہی خزانے کو قرضے دیا کرتے تھے۔

جس وقت متوسط طبقہ اپنی نہایت اور محنت کی وجہ سے ابھر رہا تھا اور معاشرہ میں اہم مقام حاصل کر رہا تھا اس وقت جاگیردار طبقہ بے عمل اور غصہ آلود کی وجہ سے زوال پانے لگا۔ کسانوں کی بد حالی کی وجہ سے زراعتی ترقی متاثر ہو رہی تھی۔ چھچھو ہو رہیوں پر قابض تھا اس سے بھی اپنے طریق کار اور کسالتوں کے، خصال کی وجہ سے زراعتی ترقی متاثر ہو رہی تھی۔ اور جیسا کہ پہلے ذکر کیا۔ اور جب زرعی پیداوار کم ہوئی تو اس نے ان کے اخراجات پر اثر ڈالا مگر ان کی زندگی میں جو غصہ آلود تھا اور ان کا نقطہ نظر جس طرح سے تنگ اور محدود تھا اس میں ان کے لئے اس نظام سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا اس لئے وہ ہر حالت میں اس نظام میں رہ کر اپنی مراعات کو برقرار رکھنا چاہتے تھے۔

ان حالات میں پورٹو، طبقہ اپنی محنت اور نہایت سے معاشرہ میں باعزت مقام حاصل کرنا چاہتا تھا مگر اس کے حصول میں قانون، روایات اور عقائد اس کی راہ میں مائل تھیں اور اس کے آگے بڑھنے کے تمام راستے بند تھے اس لئے فرانسیسی انقلاب اس طبقہ کے لئے سب سے زیادہ مفید ثابت ہوا اور اس نے اس سے قائدانہ حکومت و سیاست کے ہر ادارے اور روایات کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ انقلاب کو کامیاب بنانے کے لئے انہوں نے شہر کے نیچے طبقوں اور دیہات کے کسانوں کو استعمال کیا جنہوں نے انقلاب کی کامیابی کے نتیجہ میں علم و حکم اور استحصال کے خاتمہ کی امید کی ان کی شہرت کے بغیر یہ انقلاب کامیاب نہیں ہو سکتا تھا۔

فرانسیس مورے نے بتائے ہیں کہ فرانسیسی انقلاب کو چار سطحوں میں تقسیم کیا ہے: اس کی ابتدا بادشاہ امراء کے دربار سے شروع ہوئی 1788ء میں انہوں نے کوشش کی کہ بادشاہ کی طاقت کو کم کر کے اپنے اختیارات کو بڑھائیں اس عمل نے پورٹو انقلاب کی راہیں ہموار کیں اس کے بعد شہروں اور دیہاتوں میں عوام نے انقلاب بھانپ لیا اور سب سے آخر میں یہ

کسانوں کے انقلاب پر ختم ہوا اور اسی پر فرانسیسی انقلاب ختم ہوا۔

فرانسیسی انقلاب کو سمجھنے کے لئے فرانس کے قدیم نظام اور اس کے تاریخی پس منظر کا جاننا ضروری ہے۔ فرانس میں بادشاہت کا ادارہ بڑا مضبوط اور مستحکم تھا اس کا انحصار مطلقاً چند عہدہ داروں کے ہاتھ میں تھا جو کہ ہمیں ریاست ہوں عوام میں بادشاہ کی حیثیت اور فتح و افغانی شاہی الوہیت کا نظریہ مستحکم تھا اور تمام اختیارات سمٹ کر بادشاہ کی ذات میں جمع ہو گئے تھے۔

فرانس کے دارالسلطنت و رسائی میں بادشاہ کی شان و شوکت اور عظمت کی علامتیں موجود تھیں۔ شاہی درباری عمل و دیوار کی رونقیں، دعوتیں، ناچ و رقص کی محفلیں، سیو تفریح، شکار اور روزہ کے معمولات نے اس شہر کو خلافت و تہذیب کا مرکز بنا دیا تھا اور یورپ کے دوسرے شہروں و درباروں کے دربار کی تقلید میں لگے ہوئے تھے۔

ایک نڈا میں فرانس کے امراء اور جاگیردار بڑے اعتبار سے رکھتے تھے اور عام طور سے یہ درباروں میں اپنی بیوی بچی حویلیوں اور قلعوں میں خود مختار انداز زندگی گزارتے تھے مگر بادشاہ کی مطلق استیلا کی وجہ سے ان کی قوت و طاقت بھی کمزور ہوئی اور ان میں سے وہ امراء جو بادشاہ کے قریب تھے اور جنہیں حکومت کے اعلیٰ عہدے دیے گئے تھے وہ اپنی حویلیوں سے لگ کر دربار میں آتے اور دربار میں وہ گریبا شاہ کی خوشامد میں مصروف ہو گئے۔

طاقت کے اس طرح سے ایک مرکز پر جمع ہونے کے کئی نقصانات ہوئے کیونکہ جب تک بادشاہ کی شخصیت ذہن اور عقلی رقی وہ ان اختیارات کو استعمال کر کے مؤثر طور پر حکومت کا بندوبست کرتا رہا مگر سو روٹی غرض حکومت میں ہر شخص ذہن اور صلاحیت نہیں ہوتا ہے اور اس میں باہیوں کو بھی حکومت کرنا کا حق ملتا ہے اور جب یہ تحت پر مینے ہیں تو حکومت کے سارے نظام اور معاملات کو بگاڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ لہذا جبکہ فرانس میں ہول بولی چار دہم کے بعد ہر بادشاہ تخت نشین ہوئے وہ انتہائی کمزور اور صلاحیتوں سے محروم تھے اور ان میں یہ اہمیت نہیں تھی کہ بدلتے ہوئے حالات کو سمجھتے اور غرایوں کو دور کر کے معاملات کو بہتر بناتے اس لئے ریاست میں خرابی کی ابتدا ہو اقتصادی، عسکری سے ہوئی۔

درباری کے دربار میں بادشاہ اور اس کے امراء کے اخراجات دن بدن بڑھ رہے تھے۔ کیونکہ جب دربار میں جگہ کرنے کو نہیں ہوتا تھا تو فرصت کے اوقات میں اور وقت گزاری کے لئے دعوتیں، رقص و موسیقی کی محفلیں، شکار کی مسافرتیں، خواتین اور مردوں میں لباس و زیورات اور دوسرے لوازمات کی طرف زیادہ توجہ دینی پانے لگی۔ آئے دن نت

سے فیشن کا رواج ہونے لگا اور اس کے ساتھ ہی اخراجات بھی بڑھنے لگے۔ یہ ایسے اخراجات تھے کہ جس کا قائل نہ ملک کی ترقی سے تھا اور نہ حرام کی خلاف ورسی۔ جب اخراجات کی تعداد بڑھی اور ملک کی آمدن کے ذرائع سے انہیں پورا نہیں کیا جاسکا تو پھر قریب سے راس اخراجات کو پورا کیا جانے لگا جس کے نتیجے میں قیمتیں بڑھنے لگیں اور اس کی آمدنی قریب کے سود میں چلی جاتی تھی۔

اس کا دور: اس دور میں خراج فوری اخراجات کا تھا، جیسے ملکوں کے حاکموں کے خوف کی وجہ سے ایک بڑی فوج رکھنی، یہ فوج نہ صرف دشمنوں سے جنگ میں کام آتی تھی بلکہ اس سے اندرونی جھڑپوں اور شورشوں کو بھی پکڑا جاتا تھا۔

اس اخراجات کو پورا کرنے کے لئے ٹیکسوں کی تعداد میں برابر اضافہ ہوتا گیا، حتمی ہالے میں یہ ٹیکسوں کے اس نظام میں مراعات یا دیکھتوں کو بالکل بھوت مٹی ہوئی تھی، ان میں سے بعض متکم ٹیکس دیتے تھے اور بعض بالکل نہیں دیتے تھے، اس طرح سے سارا بوجھ عام پر تھا۔ یہ پسیسی سے مانی طور پر بد حال تھے۔ اس وجہ سے جب ان لوگوں سے ٹیکس لے مانیں گے جس کے پاس ایسے کوئی بھی نہیں ہو گا اور وہ لوگ سب کچھ دے جائیں گے کہ وہ تادمہ مال و دولت رکھتے رہیں تو اس صورت میں تمدن کا کم ہو جانا قطعی بات ہوتی ہے۔

ایک زمانہ میں ریاست کی آمدنی کا ایک ذریعہ سرکاری عہدوں کی خدمت ہوتی تھی، مگر بعد میں سب یہ سہ سہ ہو گئی تو آمدنی کا یہ ذریعہ بھی ختم ہو گیا۔ ذرا مٹی تبدیل ہو حکومت اس سے ہم ذریعہ تھا، اس کی صورت حال یہ تھی کہ امراء کے پاس ریش 25 فیصد حصہ تھا، 10 فیصد بچہ جیج قاضی تھا، وہ یہ دلوں زمین کے لگان یا مہ دینے سے معاف تھے۔ اس طرح ذرا مٹی ٹیکس کا سارا بوجھ چھوٹے کاشت کاروں پر آ جاتا تھا۔

آمدنی کا دوسرا ذریعہ تجارت اور صنعت و حرفت تھی مگر اس کی ترقی اور فروغ میں ایک بڑی رکاوٹ ملک میں جیسے ہوتے تاکہ دھنک کے آئے تھے جو حکومت کی طرف سے قائم تھے۔ یہاں پر بھی ٹیکس وصول کرنے کا انتظام انتہائی ناقص تھا اور عام طور سے اس میں لٹیکہ پڑ جاتا تھا، جس کی وجہ سے بد عنوانی اور رشوت کا عام رواج ہو گیا تھا۔

نہارویں صدی کے درمیان ٹیکس کے اس نظام کو بہتر بنانے کے لئے اصلاحات کی کوششیں کی گئیں۔ ان میں سے ایک کوشش یہ تھی کہ مراعات یا دیکھتوں سے ٹیکس وصول کیا جائے اور آمدنی چھوٹے کی خاطر تجارت پر جو آمدنی رکھتے ہیں۔ انہیں دور کیا جائے۔

اس میں سب سے بڑی مشکل یہ پیش آتی کہ امراء کو جو مراعات ملی ہوئی تھیں وہ وقت کے ساتھ ان کے لئے ہمارے اختیار اور فخر ہو گئیں، ٹیکس نہ دینا ان کے حق کے لئے ایک ایسی مراعات تھی کہ اس سے دستبردار ہونے کے لئے وہ تیار نہ تھے۔ کیونکہ کسی بھی ایک مراعات کو کھولنے کا مطلب تھا کہ اپنے طبقہ کی عزت و وقار کو کم کر دیا، اور خود کو کچھ طبقوں سے منسلک کر دیا۔ اس کے علاوہ ایسے جاگیرداروں اور امراء کی بھی کمی نہ تھی جو وقت کے انہوں دلوں پر ہوتے تھے اور فتنہ خوئیوں میں گرتی ہوئی دلوں کے درمیان معاشی دھاؤں کے تحت خاموشی سے وقت گزار رہے تھے۔ ان کے لئے ٹیکس دینا ایک مایہ بوجھ تھا جسے برداشت کرنے پر وہ تیار نہیں تھے۔

امراء کا مفقہ حیثیت مجموعی اس سے بھی ناوشہ کا مخالف تھا کہ اس نے مطلق سناٹا کے ذریعہ ان کے تمام اختیارات کو ختم کر دیا تھا، اس لئے وہ اس نظام کی اصلاح میں اس کے ساتھ تعاون کر کے اسے مضبوط نہیں بنانا چاہتے تھے بلکہ وہ اس موقع کے منتظر تھے کہ اگر بادشاہ کمزور ہو تو وہ دوبارہ سے اپنے پچھے ہوئے اختیارات کو حاصل کر لیں۔ چنانچہ 1780ء کی دہائی میں انہوں نے بادشاہ کی مان حالت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اپنے اختیارات کو بڑھاتا چلا اور اس سلسلہ میں پارلیمنٹ کے ادارے کے انہوں کی کوشش کی۔

فرانس کے سیاسی نظام میں ہر علاقے کی ایک پارلیمنٹ ہو گئی تھی کہ جس کے رکن امراء ہوا کرتے تھے۔ ان میں سب سے اہم پارلیمنٹ بیس کی تھی۔ یہ ایک قانون ساز ادارہ تھا اور اس کے ذریعہ سے ہی قانون کی منظوری لی جاتی تھی، اگرچہ بادشاہ کو ویٹ کا اختیار تھا مگر اس کے باوجود اس پر اس کا شدید دباؤ ہوا کرتا تھا، لہذا امراء نے پارلیمنٹ کے ذریعہ سے اپنے اختیارات کو بڑھانا چاہا، سب سے پہلے انہوں نے امراء پر ٹیکس لگانے کی مخالفت کی، پھر بادشاہ کی مطلق اعلانیہ کو کم کرنے کی خاطر انہوں نے دستوری حقوق اور آزادی کے مطالبات کئے، اگرچہ سب وہ آزادی کہتے تھے تو اس سے ان کا مطلب صرف اپنی آزادی ہونا تھا، اور جب وہ ناکندہ اداروں کی بات کرتے تھے تو اس سے صرف اپنی ناکندگی چاہتے تھے، مگر یہ غمراہ ایسے تھے کہ انہوں نے عام آدمی کو متاثر کیا اور انہیں بادشاہ کی مطلق اعلانیہ کے خلاف متحرک کیا۔ اس طرح سب سے پہلے امراء نے اپنے مفاد کی خاطر ہر تحریک شروع کی اس نے فرانس کے گھبرے ہوئے نظام میں بھل بھلا کر دی اور اس سے تبدیلی کا آثار ہوا۔

معاشرتی لحاظ سے فرانس میں تین طبقوں میں جاتا ہوا تھا، امراء، جمیع کے عدے دار اور عام مردم نہیں، پھر انہیں "امینٹ" کہا جاتا تھا۔ امراء کا طبقہ مراعات یافتہ تھا، انہیں ٹیکسوں سے معافی تھی، اپنی جاگیرداروں میں یہ عدالتی اختیارات کے حامل تھے اور اپنی جاگیر کی حدود میں یہ خود ٹیکس وصول

کیا کرتے تھے۔ امراء کی بھی دو قسمیں تھیں: ایک امراء شفیقہ کہلاتے تھے یہ فرانس کے قدم امراء تھے۔ دوسرے امراء سخت کہلاتے تھے اور حکومت کے بڑے عہدوں پر فائز تھے۔

امراء کی تعداد تقریباً 4 لاکھ کے قریب تھی چونکہ یہ ایک مراعات یافتہ طبقہ تھا اس لئے انہوں نے اپنے طبقہ کو دوسروں کے لئے بائبل بن کر دیا تھا اور کسی کے لئے جیل امراء میں شامل ہونا بڑا مشکل تھا۔ اپنے طبقہ کے اندر روبرو دیکھ کر قائم رکھنے کے لئے ان کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ حکومت کے تمام اعلیٰ عہدوں پر اس کا قبضہ ہو تاکہ کوئی دوسرا اس کے مقابلہ میں آئی نہ سکے اس لئے 1789ء کے فرانس کے تمام بڑے عہدوں پر صرف امراء کا تقرر ہوا کرتا تھا اور ریاست کے اعلیٰ عہدے بھی انہیں کو ملتا کرتے تھے بادشاہ کے تمام وزراء اور انتظامیہ کے عہدے دار طبقہ امراء سے ہی لئے جاتے تھے۔

چونکہ چرچ کے پاس بھی بڑی بڑی جاگیریں تھیں اس لئے اس کے بڑے عہدے دار بھی اپنی رعایت و رعیت کی وجہ سے طبقہ امراء میں شامل ہو گئے تھے صرف چرچ کے چھوٹے عہدے دار جو کہ ان مراعات سے محروم تھے وہ عوام کے ساتھ تھے۔

وہ بہتوں کے بعد تیسرا طبقہ عوام کا تھا کہ جس میں ابھرتا ہوا متوسط طبقہ بھی شامل تھا۔ یہ ایک میرر برعاقی طبقہ تھا اور آبادی کا تقریباً 95 فیصد حصہ تھا متوسط طبقہ صنعت و حرفت و تجارت سے متعلق تھا اور ان کی دولت و طاقت میں اس وقت اضافہ ہونا شروع ہوا جبکہ نوادیس صدی میں جمہوریت کی راستوں کی دریافت کے بعد میرر کی تجارت کو فروغ ہوا اور متوسط طبقہ کا اثر و رسوخ بڑے بڑے شہروں پر ہو گیا جہاں وہ جاگیرداروں کے تسلط سے آزاد پے پیشوں میں مصروف ہو گیا۔ جب فرانس سے سمندر پار اپنی ریاست کو قائم کرنا شروع کیا تو اس نے تجارت کو مزید بڑھا دیا۔ اس کی وجہ سے صنعتی پیداوار بھی چیزوں کی قیمتیں بڑھیں اور تاجر طبقہ طاقت ور ہوا۔ اس دوران میں تجارتی سرگرمیوں کی وجہ سے درآمدات بڑھتے اور برآمدات اہم تجارتی بندرگاہیں بن گئیں۔ بال و دولت نے شہروں کی وسعت اور خوبصورتی کو بڑھایا اور بڑی بڑی عمارتیں 'پاٹات' شاہراہیں تاجر طبقہ کی خوش حالی کی علامت بن گئیں۔ لیکن متوسط طبقہ نے ساتھ ہی اس بات کا اندازہ لگایا کہ ان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ قدیم نظام اور اس کے ارادے ہیں جو نہ صرف حکومت اور انتظامیہ میں نہیں شامل نہیں ہوتے دیتے بلکہ معاشرے میں انہیں باعزت مقام بھی حاصل نہیں کرتے دیتے۔

متوسط طبقہ میں کئی درجے تھے سب سے زیادہ باعمل اور فعال طبقہ تاجروں کا تھا جن کے پاس مال و دولت جمع ہو گئی تھی اور اب وہ یہ برداشت کر لے چکے تھے کہ انہیں معاشرہ

میں جیلہ گردانا چاہئے۔ یہ لوگ آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے بدلے خواہش مند تھے اور تجارت میں جو رکاوٹیں اور دقیقہ کشیں یہ انہیں ہر گزیت پر دور کرنا چاہتے تھے۔ یہ جب ہی لیکن تھاکہ قدیم نظام کو بدلیں اور اس کے بجائے جس نظام کو انہیں اس میں یہ اقتدار میں ہوں۔ دوسرے طبقے میں انتظامی عہدے دار، وکیل، ڈاکٹر، اساتذہ اور دانشور آتے تھے جن کے پاس دولت تو تھیں مگر دولت اور صلاحیت تھی۔ اہل عورہ یہ لوگ روشن خیول اور ترقی پسند تھے اس لئے قدیم نظام کی آلودگیوں سے بیز رہے اسی طبقہ نے انقلاب کے دوران فرانسیسی انقلابیوں کے ساتھ اور نئے نظام کی تشکیل میں حصہ لیا۔

اس طرح سے فرانس کا یہ متوسط طبقہ دولت و شعور دونوں کا مالک تھا۔ وہ قدیم نظام اور اس کے اداروں کے سخت مخالف تھے کیونکہ انہوں نے ان کے اقتدار کی راہیں روک رکھی تھیں اور ان کی سماجی و سیاسی حالت کو کستہ رکھا تھا۔ اگرچہ ان میں سے کئی اپنی دولت کے سارے بڑے عہدے خرید لیتے تھے جاگیردار اور امراء کے طبقے میں شادیوں کر کے اور زمین خرید کر جاگیردار بن جاتا کرتے تھے مگر ان کی یہ سماجی حیثیت ان کے طبقہ میں شامل ہو کر ملتا کرتی تھی بحیثیت متوسط طبقہ کے دولت اور طاقت کے باوجود سماجی طور پر عزت میں حاصل کر سکتے تھے۔

متوسط طبقہ کے بعد عام شہری آبادی اور کسان تھے۔ عیس کا شہر جس نے انقلاب میں نمایاں حصہ لیا اس کی آبادی اس وقت چار لاکھ تھی جن میں چھوٹے تاجر، وکلاء و مزدور اور گھریلو ملازمین شامل تھے۔ اس وقت تک چونکہ صنعتی انقلاب نہیں آیا تھا اس لئے مزدوروں کی کوئی جماعت نہیں تھی اور پھوٹی جیکٹروں میں مالک اور مزدور مل کر کام کیا کرتے تھے۔ شہروں کی عام آبادی چونکہ انتہائی غریب تھی اس لئے قیمتوں میں درسا اضافہ ان کے لئے معاشی مشکلات پیدا کر دیتا تھا۔ خصوصیت سے مدنی کی قیمت میں اضافہ ہنگامہ کا سبب بن جاتا تھا کیونکہ اس وقت آج کے مقابلہ میں فرانس میں مدنی کا استعمال زیادہ ہوتا تھا۔

ملک کی 80 فیصد آبادی دیہاتوں میں رہتی تھی جو اگرچہ جاگیرداروں کے نظام تو نہیں تھے مگر اس کے تحت ٹکرتے۔ ان میں کچھ خودی زمین کے مالک ہوا کرتے تھے کچھ حصہ داری پر کاشت کاری کرتے تھے۔ مگر اکثریت کھیت مزدوروں کی تھی۔ انصارویں صدی میں جب آبادی میں اضافہ ہوا تو اس کے ساتھ ہی زمین سے محروم کسانوں کی تعداد بڑھ گئی۔ کسی طبقہ کو سب سے زیادہ نیکوں کی اولاد بنی کرنا پڑی تھی۔ ایک طرف یہ چرچ کو مذہبی ٹیکس دیا کرتے تھے تو دوسری طرف حکومت اور زمینداروں کے ٹیکس بھی انہیں کو داکرنا پڑتے تھے اس لئے یہ

طبقہ معافی طور پر سب سے زیادہ بد حال تھا اور تہذیبی کی خواہش سب سے زیادہ اسی میں تھی۔ اس وجہ سے فرانس کے دانشوروں نے لوگوں کو ذہنی طور پر تہذیب کرنے کی کوشش کی۔ انہوں نے قدیم نظام کی خرابیوں کو اور اس کی عیوب کو ظاہر کر کے اس کی مزاہات پر مجھے سکے۔ خصوصیت سے جرج اور لٹینی عقائد ان کے محلوں کا نشانہ بنے، اس نے جہاں قدیم نظام کو کنوڑہ کیا وہاں لوگوں میں روشن خیالی اور ترقی پسندی کے خیالات کو بھی ترقی دی۔ انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ لوگوں کو نفس آزادی ملنی چاہئے کیونکہ صرف اس کے بعد ہی وہ آگے بڑھ سکے ہیں اور ترقی کر سکیں ہیں۔ امن و نشوونما میں والیئر اور روسو خصوصیت سے قابل ذکر ہیں کیونکہ ان کے نظریات نے انقلاب کے راہنماؤں کو متاثر کیا۔

اس حالات میں 1774ء میں ہوئی سورج تحت نشیں ہو گئی یہ اسی مساوات سے یا وحدت مساں میں تھا، اور یہی اس کی جگہ میں بننے کا سخت نشی کے فور بعد ہوئی کی حکومت کا بنی بن کا سامنا کرنا پڑا اور اس دور کرنے اور درن ترکوت کے پہر کی گئی جہ کہ خراب کا ڈیکٹر مقرر ہوا، ترکوت حکومت کے باقی اقدام و عمل طور پر تبدیل کرنے کی حیثیت میں نہیں تھا، اس نے وہ صرف اصلاحات کے درجہ اس میں کچھ تبدیلیاں دلا سکتا تھا، لہذا اس نے دو اصلاحات پر زور دیا:

چنگی ہاکر ختم کر کے اندرون ملک تہذیب پر جو پابندیاں ہیں۔ انہیں ختم کیا جائے۔

2۔ تمام جاگیرداروں پر مالی نافذ کیا جائے

اس پر جاگیرداروں اور امراء کی جانب سے اس کی سخت مخالفت ہوئی جس کے سبب 1776ء میں سے ہٹا دیا گیا جب مرعات یا تہ طبقہ اپنی مرعات کو ذرا بھی چھوڑنے پر تیار نہیں ہوا، حکومت کی مالی حالت اور خراب ہوئی اور اس خرابی کے ساتھ ہی بادشاہ کے اقتدارات اور اس کی حیثیت متاثر ہوئی۔ اس سے فائدہ اٹھا کر امراء نے اس بات کی کوشش کی کہ انہیں اقتدار میں اور زیادہ شریک کیا جائے۔

ترکوت کے بعد مالی حالت کو بہتر بنانے کے لئے ایک دوسرے نقص نیکر کو یہ بند داری دی گئی اس وقت سورج تھل یہ تھی کہ قرضہ پر سود کی رقم بہت زیادہ چھہ تھی لہذا اس کے سامنے مالی اصلاحات کے تین راستے تھے اخراجات میں کمی کی جائے، مزید قرضے لے کر اخراجات پورے کئے جائیں یا ٹیکسوں میں اضافہ کئے جائیں۔ لیکن ٹیکس نظام کو اگر ذرا بھی بدلا جائے تو اس سے متاثر ہونے والا طبقہ امراء کا تھا جو اس پر بالکل تیار نہیں تھے کہ ان پر کسی بھی قسم کا ٹیکس لگایا جائے۔

چونکہ ذرا سی ٹیکس لگانے کا قیعد اسٹیٹ جنرل "فرانس کا دستور ساز ادارہ ہی کر سکتا تھا" اس لئے یہ فیصلہ ہوا کہ اس کا اجلاس بلایا جائے اور اس میں بنیادی نویت کے فیصلے کرائے جائیں۔ اس ادارے کا آخری اجلاس 1789ء میں ہوا تھا اور اس کے بعد سے اس کا اجلاس بلایا ہی نہیں کیا تھا، مگر اب حالات سے مجبور ہو کر مئی 1789ء کو اس کا اجلاس بلایا گیا۔ امراء کو اس سے اس لئے دلچسپی تھی کہ وہ اس کے ذریعہ بادشاہ کی مطلق اسطاعت کو ختم کر کے اپنے اقتدارت برعلاصا چاہتے تھے۔

تقریباً اسٹیٹ (عوام) کو 788ء میں پارلیمنٹ کے اجلاس سے اس بات کا اندازہ ہو گیا تھا کہ امراء اس طرح سے اپنا اقتدار مضبوط کرنا چاہتے ہیں اور کسی بھی صورت میں اپنی مرعات سے دست بردار ہونے پر تیار نہیں ہیں، اس لئے انہوں نے جہاں ایک طرف بادشاہ کی مطلق اسطاعت کی مخالفت کی وہاں دوسری طرف امراء کے اقتدارت کے خلاف بھی نپے جذبہ اتکدار کیا۔

اسٹیٹ جنرل کے اجلاس کے سلسلہ میں سب سے پہلے جھگڑنے کی ابتداء اس سے ہوئی کہ کیا اجلاس قدیم روایات پر ہو یا اس میں تہذیبی کی جائے؟ کیا تہ قدیم روایات کے تحت تقریباً اسٹیٹ کے نمائندوں کی حیثیت، امراء اور جرج کے مقابلہ میں کمزور تھی۔ اس لئے انہوں نے یہ مسالہ پیش کئے کہ اسٹیٹ جنرل میں ان کے نمائندوں کی بھی تعداد اسی قدر ہونی چاہئے جس قدر کے امراء اور جرج کے ہوتے ہیں۔ تینوں طبقوں کے نمائندوں کا اجلاس ایک ہی جگہ پر ہونا چاہئے اور دو جنگ انفرادی طور پر ہو۔

اس موقع پر ایب سے میں نے ایک پمفلٹ لکھا جس کا عنوان تھا کہ تقریباً اسٹیٹ کیا ہے؟ اس کا جواب تھا کچھ نہیں۔ دوسرا سوال تھا کہ کیا فیضا چاہتی ہے؟ اس کا جواب تھا کہ وہ کچھ بتا چاہتی ہے۔ اس سے عائد ہوتا ہے کہ اس موقع پر تقریباً اسٹیٹ دو جاتی طور پر اپنا کردار ادا کرنے پر تیار نہیں تھی بلکہ وہ اپنے حقوق کے لئے ہمدرد کرنا چاہتی تھی۔

ان کے مسائل ہر انہوں نے اسٹیٹ جنرل کے اجتماعات سے پہلے پیش کئے وہ یہ تھے کہ مطلق العنان بادشاہت کا غاتمہ ہو، بنیاد ضرور بنایا جائے ملک کے اندر ناگہم و پتلی کو ختم کیا جائے، فرد اور پس کی آزادی کو تسلیم کیا جائے اور معاشرہ میں مساوات کے اصول کو قائم کیا جائے۔

جب مئی 1789ء میں اسٹیٹ کا اجلاس ہوا تو اس میں تقریباً اسٹیٹ کے نمائندوں کو انتخابی باجی ہوئی کیونکہ اس میں قدیم روایتی رسومات کو برقرار رکھا گیا کہ جن کے ذریعہ ان کی کتبی ظاہر ہوتی تھی، حلقہ انہیں نکالنا ہوا پشما پڑنا تھا اور اسٹیٹ کی عمارت میں علمی دیوار سے

داخل ہوتا پتا تھا۔

اس کے بعد تینوں طبقوں کے پیچھے علیحدہ اجلاس بلائے گئے، جب اس پر قراردادیں لیں گئیں اور ان پر قرارداد کے دو اڑے بند کر دیئے گئے۔ اس پر اسوں نے اپنا اجلاس قریبی ٹینس کورٹ میں منعقد کیا اور وہاں یہ صدر کیا کہ جب تک اس کے مطالبات میں مامی جائیں گے اور وہ اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوں گے اس وقت تک سنے دستور کو نہیں مایا جائے گا۔

29 جون کو بادشاہ نے خطاب کیا اور قراردادیں لیں گے کہ یہ مشورہ دیا کہ وہ پتا اجلاس روایت کو ملحوظ رکھتے ہوئے علیحدہ سے کریں۔ مگر جب وہ اپنے مطالبات پر سختی سے قائم رہے تو ان کا مطالبہ تسلیم کر کے حکم دیا کہ تینوں طبقوں کے نمائندوں کا اجلاس ایک جگہ بلایا جائے۔ مگر سانچہ ہی امراء کے اصرار پر بادشاہ نے فوج طلب کر لی تاکہ اس دباؤ سے وہ اپنا اثر قائم رکھ سکیں۔ فوج کی موجودگی سے قراردادیں لیں گے کہ بادشاہ اور امراء ان کے مطالبات کو تسلیم کرنے میں قسقی پر غور نہیں کریں۔ اس مرحلہ پر ان کی مدد کے لئے عوام آگئے جنہوں نے حالت کا رخ بدلا اور بادشاہ کو طاقت استعمال کرنے کا موقع نہیں دیا۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ عوام کیوں اس مرحلہ پر اپنے نمائندوں کی مدد کے لئے آئے؟ اس کا پس منظر یہ تھا کہ عوام تیسوں کے بدھنے کی وجہ سے پریشان تھے۔ پیرس میں کھانہ کی اشیاء بے انتہا کم ہو گئیں تھیں، خاص طور سے روٹی کی قیمت دگنی ہو گئی تھی جو عوام کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس لئے ان حالات میں انہوں نے، احتجاجی مظاہرے شروع کر دیئے۔ وہ پیرس میں شاہی محل میں جمع ہوئے جہاں کے مقرروں نے ان کی تقریروں کے ذریعہ ان کے مطالبات کو دیکھا۔ خصوصیت سے ان مقرروں میں ایک شخص کھنڈاؤ۔ سولن تھا جو امراء کے خلاف تقریریں کیا کرتا تھا۔ اس لفظ میں جب یہ افواہ پھیلی کہ بادشاہ نے فوج طلب کر لی ہے اور وہ فوج کے ذریعہ حواری احتجاجی مظاہروں کو پکڑا چاہتا ہے، تو اس سے لوگوں میں اشتعال پیدا ہوا اور انہوں نے شاہی اسلحہ خانہ پر بار بار ہولی دھار دیاں سے احتجاجی بوٹ لئے۔

14 جولائی کو عوام نے اس خیال سے کہ رول کے قلم میں اسلحہ جمع ہے اس پر صدر کر دیا اور قلم پر چند کر کے اس کے گورنر کو مار ڈالا۔ رول کے قلم پر عوام کے لئے اور اس پر قطر سے عوام کی قوت و طاقت کا اظہار ہوا اور یہ بات واضح ہو کر سامنے آئی کہ عوام کے ریلے کے آگے حکومت اور اس کے اور سے زیادہ غم نہیں کھسکتے۔ جب درملتی میں بادشاہ کو اس کی خبر دی گئی تو اس نے کہا "یہ تو بغاوت ہے" اس پر کسی نے جواب دیا "بغاوت

نہیں بلکہ انقلاب ہے۔"

اصل کی وجہ اس لحاظ سے ہم قس کر اس نے پیرس سے بادشاہ کی حکومت اور قرارداد کو ختم کر دیا اور پیرس کے شہریوں نے ایک کیوں بنا کر شہر کے انتظام کو سنبھال لیا، پینٹل کارا کا قیام عمل میں آیا، فوج کی تفکیک دی گئی جس کا کمانڈر نے قیامت کو مقرر کیا گیا جو امریکہ کی جنگ آزادی میں انگریزوں کے خلاف لڑ چکا تھا، اس کا تین رگول دلا جیٹا احقر ہوا۔ اس کے بعد سے دوسرے شہروں میں اسی قسم کی تحفیں قائم ہوئیں اور انہوں نے انتقامات کو سنبھال لیا۔

ایک طرف شہروں میں یہ انقلابی تبدیلیاں آئیں تو دوسری طرف رہائشوں میں کسانوں نے مظاہرے شروع کر دیئے۔ کسانوں کا یہ رد عمل اس وجہ سے کچھ میں آنے والا تھا کہ کھدوئی سب سے زیادہ معاشی دباؤ کا نشانہ تھے۔ 1788ء میں فصل کی خرابی کی وجہ سے اس کی، اقتصادی حالت اور مڈیاں خراب ہو گئی تھیں۔ اس لئے جب 1789ء میں ملک میں سی سی گران آیا اور یہ افواہیں پھیلیں شہریوں ہوئیں کہ امراء فوج کے ذریعہ کسانوں پر حملے کرنے والے ہیں، تو کسانوں نے جگہ جگہ بغاوتیں شروع کر دیں، کھانہ کے گوداموں کو لوٹ لیا، امراء کے قلعوں اور حلیوں پر بارشیں دیا اور ہاتھ اوروں کے تمام کاغذات اور قرضوں کی دستاویزات کو جلا دیا۔

کسانوں کی بغاوت نے اسمبلی میں حوصلہ بٹھانے کو پریشان کر دیا، کیونکہ یہ لوگ غی جانداروں کے تقدس کے حامی تھے اور ہاتھ اوروں پر حملے ان کے مفادات کے خلاف تھے۔ لیکن اس وقت تک ملک کا تمام نظام بکھر چکا تھا اور حکومت کے پاس اپنی فوج نہیں تھی کہ وہ ان بغاوتوں کو ختم کر سکے۔ اس لئے ان کے سامنے واحد راستہ یہ ہی تھا کہ کسانوں کو رعائیں دی جائیں اور اس طرح سے ان کے مطالبوں اور بغاوتوں کو روکا جائے۔

چنانچہ 4 اگست کو اسمبلی نے انقلابی اقدامات کا فیصلہ کرتے ہوئے کئی تجاویز منظور کیں کہ جن کے تحت جاگیرداروں کی مراعات کا خاتمہ ہوا، کسانوں کی ہم قلماء حثیت، اندھی لکس، کسانوں سے پیار لینے کے قوانین کو ختم کر دیا گیا۔ لڑائیں کے تمام شر، سوسے اور ہمتیں مساوی قرار دی گئیں۔

اس طرح سے شہروں میں حوصلہ بٹھانے اور رہائشوں میں کسانوں نے قدیم نظام کو الٹ کر رکھ دیا۔

بادشاہ اور امراء حواری طاقت کے اس دباؤ کے آگے جھکنے پر تیار نہیں تھے۔ اس لئے بادشاہ نے جاگیرداروں کی مراعات ختم کرنے کے قانون پر دستخط نہیں کئے اور اس بات کا منصوبہ بنایا کہ مزید فوج کو بلا دیا جائے اور طاقت کے ذریعہ ان بغاوتوں کا خاتمہ کیا جائے۔ عوام

کے جذبات اس وقت اور زور پکڑ گئے جب ورسائی کی ایک دعوت میں امراء نے نین رنگوں والے انگوٹھی پہننے کو پاؤں سے ہوتے ڈالا۔

پیرس کے شاہی محل میں جہاں لوگ جمع تھے وہاں اس واقعہ پر مقررین نے قدر وار تقریریں کیں اور یہ مطالبہ کیا کہ بادشاہ کو ورسائی سے پیرس لایا جائے۔ یہ موقع اس وقت ہاتھ آیا جب روٹی کی قیمت کے خلاف عورتوں کا ایک جلوس ورسائی کی طرف چلا تاکہ بادشاہ اور اسکی سے روٹی کی قیمت میں کمی کرنے کا مطالبہ کیا جائے۔ ان کے ساتھ 2 میل کے سفر میں بیس گاڑے اور عوام کا ایک مجمع بھی شریک ہو گیا۔ انہوں نے ورسائی میں جا کر بادشاہ اور اسکی کو مجبور کیا کہ وہ ان کے ساتھ پیرس چلیں اور پھر جب یہ جلوس واپس ہو رہا تھا اس طرح سے کہ ان کے ساتھ ایک گاڑی میں بادشاہ، ملکہ اور ان کا لڑکا تھے جو مجمع میں گھرے ہوئے تھے۔ اس واقعہ نے جہاں عوام کی طاقت کو مستحکم کیا وہاں متوسط طبقے کے بڑھتے ہوئے اقتدار کا بھی دھماکا۔ اس کے بعد سے بادشاہ اور اسکی پیرس میں عوام کی نظموں کے سامنے تھی اور اب اس کے لئے یہ ممکن نہیں تھا کہ عوام کے مفادات کے خلاف کوئی قانون پاس کر سکے۔

1789ء تک اسکی نے عوامی دباؤ کے تحت فرانسیسی اداروں اور روایات کی انقلابی تشکیل کا کام کیا۔ اس عمل میں اکثریت ان اراکین کی تھی جن کا تعلق متوسط طبقے سے تھا مگر ان کے ساتھ کچھ روشن خیال امراء اور جمہور کے نمائندے بھی تھے۔ انہوں نے جو اصلاحات کیں ان کا حلقہ انتخاب فرانس کے اہم دور سے تھا۔

اس سلسلہ میں اہم بنیادی اصلاح "حقوق انسانی" کے نام سے وہ اعلان ہے جو اسکی نے جاری کیا۔ اس کے تحت اقتدار عوامی بادشاہ سے لے کر عوام کے سپرد کر دیا گیا اور انہیں یہ حق دیا گیا کہ اگر وہ چاہیں تو دستور بدل دیں اور حکومت کے عہدے داروں کا انتخاب کریں۔ اس کے اہم اصولوں میں "ذاتی اور مساوات کے اصول تھے کہ لوگوں کی اہمیت ان کے کام سے ہونی چاہئے اس سے نہیں کہ وہ خاندانی طور پر کیا ہیں۔ اس لئے حدود پر مقرر نہایت کی بنیادوں پر ہر گز خاندانی تعلق اور رشتہ سے نہیں۔ اس میں آزادی تحریر و تقریر اور پریس کی آزادی کا حق دیا گیا اور اس اصول کو قائم کیا گیا کہ کسی بھی شخص کو بلا قانونی جواز کے گرفتار نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ ہر آدمی اس وقت تک بے قصور ہے جب تک کہ اس پر جرم ثابت ہو۔

چونکہ اسکی میں متوسط طبقہ کی اکثریت تھی اس لئے انہوں نے جی خواہشوں سے ہی

اصلاحات کے ذریعہ اپنے اندر کو باقی رکھا اور اپنے مفادات کا تحفظ کیا۔ انہوں نے اپنی اصلاحات سے گریز کیا کہ جن سے معاشی نامماری دور ہوتی خاص طور سے انہوں نے نجی ملکیت کے حق کو برقرار رکھا۔ انتخاب میں حق رائے دہی سب کو نہیں دیا بلکہ یہ حق ان کے لئے مخصوص رکھا جو فیکس اور کرتے تھے اور چاندو کے مالک تھے تاکہ صرف متوسط طبقے کے لوگ روزینہ بنیں۔

لیکن یہ اصلاحات فرانس میں اس لئے انقلابی ثابت ہوئیں کہ انہوں نے قدیم نظام کو الٹ کر رکھا۔ مثلاً جاگیرداروں کے نام قرعے ختم کر دیئے جہاں جہاں سرفہریم عدم کسان تھے اس میں آزاد کر دیا جمہور کا ٹیکس ختم کر دیا گیا، امراء کے سرکاری خطاب کو ختم کر کے تمام شہروں کا درجہ برابر کر دیا۔ شاہی انتظامیہ میں جو جدید میاں تھیں انہیں دور کیا گیا اور اس مقصد کے لئے 83 لاکھ فرانسیس تنقیل دے کر میں 374 کتوں اور 44000 کیوں میں تقسیم کیا تاکہ انتظام میں آسانی ہو۔ تمام عہدے داروں کا انتخاب دو طرفہ کے ذریعہ ہونے لگا۔

اسی طرح عوامی نظام میں بھی تبدیلیاں لائی گئیں اور قدیم نظام میں جو مختلف قسم کی عداوتیں تھیں انہیں ختم کر دیا گیا اور ان سب کی جگہ ایک عداوت مقرر ہوئی جو لوکل گورنمنٹ کے ماتحت ہوتی تھی۔ جموں کا اقتدار انتخاب کے ذریعہ ہونے لگا۔ مقدمہ کی کارروائی مکمل ہوتی تھی اور مقدمہ کے بعد کے لئے جیوری کا طریقہ رائج کیا گیا۔ جیل میں انصاف و تشدد کے طریقے کا خاتمہ ہوا۔ موت کی سزا برقرار رکھی مگر اس میں بھی مساوات کا طریقہ اختیار کیا گیا۔ قدیم نظام میں امراء کا سزا دیا جاتا تھا جب کہ عام آدمی کو پھانسی دی جاتی تھی اب سب کو ایک ہی طریقہ سے سزا دی جانے لگی یعنی گھوڑے کے ذریعہ سزا دیا۔

معاشی اصلاحات میں ٹاپ و قتل کے مساوی سزائوں کا رواج ہوا۔ تاکہ چٹکی اور اندرون ملک کسٹم ڈیوٹیاں ختم کر دی گئیں اور اس طرح تجارت میں جو رکاوٹیں تھیں انہیں دور کر دیا گیا مگر شہر و زمین پر پابندی رکھی گئی۔

اس کے بعد اسکی نے جمہور کی اصلاحات کی طرف توجہ دی۔ اس کا آغاز اس طرح سے ہوا کہ جب اسکی نے پائے ٹیکس ختم کر کے نئے لگائے تو وہ ان کی مصوبہ میں کسی طرح کی وجہ سے حکومت اقتصادی بحران کا شکار ہو گئی۔ اس کا حل یہ سوچا گیا کہ جمہور کی جائداد ضبط کر کے اس آمدنی سے حکومت کے مالی وسائل کو مل کیا جائے۔ چونکہ جمہور کی جائداد نجی جائداد کے ذریعے میں نہیں تھی اس لئے اس فیصلہ پر یوروٹ طبقے کے اراکین تیار ہو گئے اس کے علاوہ اس جائداد کو خریدنے والے بھی اکثر اسی طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لئے ایک بار

جانکا اور خرید کر انہیں جو معاشی فوائد ہوئے اس کے بعد انہوں نے کوئٹہ کی کہ لب کوئی معاشی اصلاحات نہ ہوں تاکہ انہوں نے جو کچھ حاصل کر لیا ہے وہ اس سے محروم نہ ہوں۔

اسپنلی جی ملکیت کے تقدس کی کا کل تھی۔ اس لئے انقلاب کے دوران جو بھی جانکا اور کی قبضی ہوئی ان کو حکومت کی جانب سے معاوضہ دیا گیا ان میں جمہور کی زمینیں بھی شامل تھیں۔ چرچ کو جانکا اور سے محروم کر کے بعد نسروں نے اس بات کی طرف توجہ دی کہ چرچ کے دھانچے کی از سر نو تشکیل کی جائے اس سلسلہ میں 1790ء میں چرچ کا ایک نیا دستور بنایا گیا جس کے تحت چرچ کے علاقوں کو نئے سرے سے تقسیم کیا گیا۔ چرچ کے حدود سے دواور کے لئے بھی انتظام کے ذریعہ کامیاب ہونا قرار پایا اور یہ طے پایا کہ چرچ کے تمام حدود دار اس نئے دستور پر حلف میں جو اسپنلی نے ان کے لئے بنایا ہے۔ پوپ نے ان اصلاحات اور چرچ کے دستور کی سخت مخالفت کی اس لئے چرچ کے لوگ دو محاذوں میں بٹ گئے: پوپ کے وفادار اور دستور کے وفادار۔

اسپنلی نے 1791ء میں ملک کا نیا دستور بنایا جس کے تحت انہوں نے بادشاہت کے ادارے کو تو قائم رکھا مگر اس کے اختیارات کم کر کے نئے دستور کے ماتحت کر دیا۔ بادشاہ متفقہ کامرہ اور تو باہر اس کے اختیارات محدود ہو گئے۔ وہ اپنے وزیر کو منتخب تو کر سکتا تھا مگر وہ نہ اسپنلی میں بیٹھ سکتے تھے اور نہ اس کے رکن بن سکتے تھے۔ بادشاہ کسی نئے قانون کو اسپنلی میں پیش کر سکتا تھا۔ اس کے پاس نہ تو وزیر کا اختیار تھا اور نہ ہی وہ اسپنلی کو دیکھ سکتا تھا۔ اسپنلی عوام کی نمائندہ تھی اور ان کے اقتدار اپنی کی علامت۔

دستور کے عمل ہونے سے قبل ہی کچھ واقعات نے حالات کا رخ موڑ دیا۔ کیونکہ اس دوران میں بادشاہ نے 1791ء میں بیس سے قرار ہونے کی کوشش کی تاکہ شمال مشرق کی سرحدوں پر جا کر وہ اپنی وفادار فوجوں اور آسٹریا کی مدد سے اپنے تحت دیکھئے اقتدار کو واپس حاصل کرے مگر رے کے دوران اسے پہچان لیا گیا اور اسے دیکھیں جس لایا گیا۔ اس واقعہ نے عوام پر بہت گہرا اثر کیا کہ بادشاہ ان کے ساتھ وفادار نہیں، اور وہ انقلاب کے عمل اور اس کے نتائج کو ختم کرنا چاہتا ہے اس لئے اب یہ مطالبات شروع ہو گئے کہ بادشاہت کو ختم کر کے جمہوریت کا آغاز کیا جائے۔

یہ حالات بیس میں ان سیاسی کلیوں کی جانب سے شروع ہوئے جو انقلاب کے دوران قائم ہوئے۔ یہ تھے ان میں خصوصیت سے دو گلب بہت اہم تھے کوڑی میر اور جیکوہن۔ ان کی جانب سے ایک مظاہرہ بادشاہ کے قابل شان دہار کے چوک پر ہوا جسے فوج نے سختی سے کچل دیا۔

دیا اور 50 کے قریب لوگ اس میں مارے گئے اس واقعہ نے پورا پورا اور عوام دونوں کو صدمہ عظیمہ کر دیا۔

اس کے بعد اسپنلی نے جلدی جلدی دستور منظور کر کے خود کو توڑ دیا اور نئے انتظامات کا اعلان کر دیا۔ اسپنلی کے اراکین کا خیال تھا کہ انقلاب مکمل ہو گیا ہے اور قدیم نظام کی واپس خرابیاں بادشاہ کی مطلق العنانیت اور امرہ کی قانونی مراعات ختم کر دی گئی ہیں۔ لہذا اب فرانس کو نئے دستور کے مطابق چلنا چاہئے۔

اکتوبر 1791ء میں جو انتظامات ہوئے ان میں اسپنلی کے پرانے اراکین نے دستور کے مطابق حصہ نہیں لیا۔ اس میں چیتے والوں کی سکونت کا تعلق حوصلہ جیتے سے تھا۔ یہ اسپنلی میں دو جماعتوں میں تقسیم ہو گئے اور اپنی مشقتوں کے اظہار سے دائیں و بائیں پاؤں دے کھاتے دائیں بازو داسے دستوری بادشاہت کے حامی تھے جبکہ بائیں بازو دالے جمہوریت کے حامی بازو کارائیں بری سو تھا اور اس کے حامی گروہ ڈسٹ کھاتے تھے۔ یہ انقلاب دشمن عناصر کے خلاف سخت اقدامات کا حامی تھا۔

اس دوران میں انقلاب کو ایک ضلع اور ورپیش تھا۔ جو امرام انقلاب کے دوران ہمارا کرورپ کے دوسرے ملک میں چپے گئے تھے وہ آسٹریا اور پروس کی فوجوں کے ہمراہ فرانس پر حملے کی خاطر یہاں سے تھے۔ بری سو نے اس موقع پر جنگ پر زور دیا تاکہ بادشاہ اور امرام کی حادثہ کو مکمل طور پر ختم کیا جائے اور اس سے قائم الحاکر جمہوریت دشمنوں کا بھی منہ ایک پا گئے کیونکہ یہ ایک طریقہ تھا کہ جس کی ذریعہ وہ انقلاب کو اندرونی طور پر مستحکم کر سکتے تھے۔

اپریل 1792ء میں فرانس نے آسٹریا کے خلاف اعلان جنگ کر دیا مگر جنگ میں فرانس کی فوجوں کو ناکامی ہوئی۔ اس بحران نے فرانس کی معاشی حالت کو بگاڑ دیا اور اس کی کرنسی کی قیمت گھٹنے گھٹنے بہت کم ہو گئی۔ عوام نے اس کی تمام ذمہ داری بادشاہ اور اس کے رہنما پر ڈال دی۔

ان حالات میں رائیں بھرے بالغ حق رائے دہی کی بنیاد پر ایک قومی کونسل کا مطالبہ کیا کہ جس میں ایک یا دستور بنایا جائے۔ اسے بیسکین گلب کے اراکین کی حمایت حاصل تھی۔ بیس کے عوام اس وقت تک اندرونی عقائد اور بیرونی دشمنوں کے حملوں کی فوجوں کے نتیجے میں بادشاہ سے بیزار ہو چکے تھے اور یہ مطالبہ زور پکڑتا جا رہا تھا کہ بادشاہ کو سنبھال کر دیا جائے۔ اپنے مطالبہ کی حمایت میں ایک دن انہوں نے شہر کی گلی پر پھیل دیا۔ بادشاہ اور ملک نے ہمارا کر، اسپنلی کی عمارت میں پناہ لی مگر عوام کا دباؤ اس قدر تھا کہ اسپنلی نے ان کا مطالبہ

ماتے ہوئے بادشاہ کو معزول کر دیا۔ ایک عیوری کوصل "کونٹوں کی مرہاں میں بی جاگ کونٹوں کے انتخابات میں اور نیا دستور طایا جاسے۔

کونٹن میں جن سیاس کلیوں کے اراکین منتخب ہو کر آئے ان میں گرون ڈسٹ کلب تھا جس کے رکنیں صوبائی عوام کی نمائندگی کرتے تھے اور بیکہ بن کلب پیرس کے عوام کا نمائندہ تھا۔ گران دونوں کلیوں کے اراکین کا تعلق درمیان طبقہ سے تھا اس لئے یہ فی جی جاندوا کے تقدس "آزاد جماعت" جمہوری اقدار کے فروغ "بادشاہت کے خاتمہ" جنگ کو جاری رکھے اور انقلاب کے نتائج کو محفوظ رکھنے کے حامی تھے۔

انقلاب کے اسی عمل میں پیرس کے عوام ایک مضبوط طاقت کے طور پر ابھر چکے تھے۔ اس میں نچلے طبقوں کے لوگ "پھوسے روکاندر" دستکار اور مزدور پیش خصوصیت سے قتل ذکر ہیں۔ یہ لوگ سماجی طور پر بد حال تھے اور ان کے صلاحیت میں سے اہم یہ تھے کہ مدد ملوکی چیزوں کی قیمتوں کا تعین کیا جائے اور ذخیرہ اندوزوں کو سخت سزائیں دی جائیں۔ یہ صحیح طور پر انقلابی تھے، اور معاشرے سے سلتی اونچے طبقہ کو مٹا دینا چاہتے تھے اس لئے انھوں نے عرصہ تک طلب میں تبدیلی کی اور محترم ڈامسید کی جگہ ہر ایک کو شری کہ کر مخاطب کرنے لگے۔ لوہاں میں بھی تبدیلی آئی اور اونچے طبقوں کے پیش ختم کر دیے گئے۔ بیسویں کلب کو امیں لوگوں کی حمایت حاصل تھی اور انہیں لوگوں کے مطالبہ پر فرانس کے بادشاہ کو 21 جنوری 1793ء میں سزائے موت دے دی گئی۔

اس طبقہ کی تقسیم نظام اور اس کی روایات سے نفرت و دشمنی کی وجہ یہ تھی کہ صدیوں سے امرام جاگیردار طبقوں نے انہیں ذلیل و خوار رکھ کر انہیں رعایا کی ہر نعمت سے محروم رکھا تھا اس لئے جب ایک مرتبہ انہیں اپنی قوت و طاقت کا احساس ہوا تو انہوں نے ہر اس چیز اور علامت کو مٹانا چاہا جس سے ان کی سلتی کمتری ظاہر ہوتی تھی۔ بادشاہت کا اداہ چونکہ قدیم نظام کا سب سے بڑا ستون تھا اس لئے اسے گرا کر انہوں نے اپنی صدیوں کی عرونی کا خاتمہ کیا۔

فرانس کو میدان جنگ میں بھی کامیابی ہوئی اور فرانسیسی فوجوں نے آگے بڑھ کر بیکھرت اور برسز پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد کونٹن نے یہ اطلاعات کئے کہ:

1۔ یورپ میں فرانسیسی حکومت کے خلاف عوام کی مدد کرے گا۔ اس لئے انہوں نے یورپ کے عوام سے اپیل کی کہ وہ اپنے گھرانوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں۔

2۔ یورپ کے جن عداوتوں پر فرانس نے قبضہ کر لیا تھا وہاں پر انہوں نے چرچ کے تمام ٹکس

اور جاگیردار ٹیکسوں کا خاتمہ کر دیا۔

3۔ یہ فیصلہ کیا کہ حکومت کے تمام عہدے انتخاب کے ذریعہ پرکھے جائیں گے۔

4۔ بادشاہ کی تمام جائیداد پر حکومت کا قبضہ ہو گا۔

جنگ میں بدلتی کامیابیوں کے بعد فرانس کو ہمسایہ ملکوں سے جنگ میں ناگہانی کامیاب کرنا پڑا۔ اس ناگہانی کی ایک وجہ فوجی چیزوں کی بخاری تھی۔ جب یہ خبریں پیرس کے عوام تک پہنچیں کہ فرانس کے بیگڑا امر، جوبلی کاروائی کے لئے تیار کر رہے ہیں تو سب دھمکیوں پریشان کر دیا۔ ساندولی و جوبلی حضرت و عزانوں سے ٹھٹھنے کے لئے کونٹن نے دو اوارے قائم کئے۔ ان میں سے ایک کبھی آف سبقتی اور دوسرا انقلابی ٹری یوٹ تھا۔ تاکہ ان کے ذریعہ بدعتیوں کا خاتمہ کیا جاسکے۔ اس عرصہ میں 31 مئی سے 2 جون تک پیرس میں انقلابی صورت حال رہی۔ 4 جون کو پیرس کے عوام نے اسمبلی کی جماعت کو پابندی میں سے لیا اور کہا کہ وہ "فرامی پار بھروسوں کی مزا کا مطالبہ کرتے آئے ہیں۔ اس صورت حال سے پیرس کے رکنیں نے فساد اٹھایا اور ایک قرار دو کے ذریعہ 70 کے قریب گرون ڈسٹ اراکین کو اسمبلی سے نکال دیا۔ اس کے بعد سے کونٹن میں امن کی حیثیت مضبوط ہو گئی۔

اس عرصہ میں فرانس کی اندرونی و بیرونی صورت حال خراب ہو چکی تھی۔ "اسٹو" و "وینا" ایسے ریڈیڈیوں کی فوجیں برآمد کئے پھر دیں تھیں "صوبوں میں بغاوتوں کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا" سینٹس کے رامنڈ میرٹ کے قتل نے صورت حال کو اور بگاڑ دیا لیکن ان تمام جنگیوں کے باوجود سینٹس کے راکین نے ایک نیا دستور پیش کیا جس کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

1۔ جلع حق رائے دی

2۔ براہ راست انتخابات

3۔ حکومت کی ذمہ داری کہ وہ ہر نعمت مند شخص کو ملازمت فراہم کرے اور ضرورت مندوں کی حالت امداد کرے۔

4۔ تمام شہریوں کے لئے مفت تعلیم کا بندوبست

لیکن محض ان اصلاحات نے حالات کو سدھارنے میں کوئی مدد نہیں کی۔ محاذ پر شکست فوجیوں کی بخاری ملک میں منگائی اور کھانے کی اشیاء کی ناہمی نے عوام کی بے چینی کو بڑھا دیا۔ اس لئے اسمبلی پر عوام کا بڑا بڑھا دیا کہ اس منگائی پر قابو پایا جائے۔ امر و ذخیرہ اندوزوں کے خلاف کارروائی کی جائے اور بدعتیوں کے عہدے داروں کو سخت سزا دی جائے۔

جولائی 1793ء سے جولائی 1794ء تک انقلاب اپنی انتہا تک پہنچ گیا۔ اس دوران میں

رائیں جو کا عروج ہوا جس نے بینکین کلب اور جرس کے عوام کی مدد سے متحد کی پالیسی پر عمل کیا۔ رائیں جو مدد سے خیالات سے متاثر تھا۔ اور انقلاب کی کامیابی کے لئے ضروری سمجھتا تھا کہ اس کی راہ میں جو رکاوٹیں ہیں انہیں دور کیا جائے اور یہ عنوانوں کو سختی و تشدد سے ختم کیا جائے۔ اس نے کینٹی آف پبلک سیکٹی اور انقلابی ٹری بیوٹل کے ذریعہ حکومت و انقلاب دشمن عناصر کے خلاف اقدامات کئے۔ اس کے دور اقتدار میں (4 ہزار ہزار) قتل کیا گیا اور اس سے زیادہ لوگوں کو قید خانہ میں ڈالا گیا۔ ان لوگوں میں جوان سراوں کا شمار ہوتے 17 فیصد امراء تھے 6 فیصد جرج کے لوگ تھے 15 فیصد کا تعلق متوسط طبقے سے تھا۔ اور کثرت عریب عوام کی تھی۔ سزائیں سیاسی جرائم پر دی گئیں۔ دس سالوں اور صوبوں میں بنیادوں کا خاتمہ کیا گیا۔ اور فائرنگ اسکول کے ذریعہ ہزار ہا لوگوں کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔ بنیاد کے جرم میں شریک ہو جا کر پھانسیا دیا گیا۔ امراء کے مکانات۔ مسودے لئے گئے۔ اصناف کی عرض سے جگہ جگہ انقلابی نمائندگی قائم کی گئیں۔ انقلاب دشمن لوگوں کی جائیدادیں ضبط کی گئیں۔ اجارہ داری ختم اور اندوڑی اور قبیلوں کے مسعودی آثار چھاؤ کو ختم کر دیا گیا۔

پہلی حملہ آوروں سے ٹھنسنے کے لئے لازمی فوجی مداخلت کے ساتھ پڑ پڑنے کو بھرپور طور پر استعمال کیا گیا۔ 1794ء میں دس لاکھ فوجی تیار کئے گئے اور اس کے ساتھ ہی اس کا انتظام کیا گیا۔ اسلحہ کے لئے کارخانے قائم ہوئے۔ نئے جنرلوں کا تقرر ہوا اور فوجوں میں انقلاب کے لئے جوش و خروش گریہ کیا گیا جس کی وجہ سے انہوں نے پہلی حملوں کو روک دیا۔ معاشرے سے برہمنی عناصر کو ختم کرنے کی غرض سے میسائی کیلنڈر کے بجائے ایک نئے کیلنڈر کا اجراء ہوا جس میں مہینوں کے نام فطرت سے منسوب تھے۔ ہفتہ دی دن کا تھا۔ مذہبی جبر کے دن جو مٹائے جاتے تھے۔ وہ ختم ہوئے۔ تمام مذہبی چھٹیاں ختم کر دی گئیں۔ نومبر 1796ء میں جرس کے مشہور جرج ٹوٹوڈیم میں مصل پرستی کا جشن منایا گیا۔

نکراس عرصہ میں رائیں جرج کی طاقت شروع ہو گئی اور 28 جنوری 1794ء کو اسے گرفتار کر کے قتل کر دیا۔ اس کے بعد حکومت جن لوگوں کے پاس تھی وہ معتد خیالات کے لوگ تھے۔ ان میں گروں ڈسٹ کلب کے اراکین اور وہ قدیم امراء تھے جو صورت کے حامی تھے۔ انہوں نے متحد کی پالیسی کو ختم کر کے انقلاب کو 1789ء کی حالت میں واپس لانا چاہا۔ بینکین کلب کو بند کر کے اس کے اراکین کو گرفتار کر لیا اور 1793ء تک جرس کے عوام کو سختی سے نکل دیا۔ اس کے بعد انقلاب جاکھ نور کئے والوں کے لئے محفوظ ہو گیا۔

1795ء میں ایک یا دسہرہ تھا اس میں لال جانندا کے خداوت کا خیال رکھا گیا اور ایسے اقدامات کئے کہ عوام کی طاقت دوبارہ سے نہیں ابھر سکے۔ اسکی طاقت ور نہ ہو اور نہ ہی کسی کینٹی یا فرد کو تمام اختیارات مل سکیں۔ یہ دور ڈائریکٹری کا کہلاتا ہے۔ فرانس کی صورت حال جب منتخب لوگوں سے نہیں متبصل تھی تو ان حالات میں چونکہ نے فائدہ اٹھایا اور فوجی اقدامات کے ذریعہ اس نے پہلے اپنی آمریت قائم کی اور بعد میں بادشاہ بن گیا۔

فرائیسی انقلاب کے دنیا کی تاریخ پر گہرے اثرات ہوئے۔ اسی نے فرائیسی مورخوں نے اس انقلاب کی اہمیت کو اجاگر کیا کہ اس کی وجہ سے ان کے ملک کو یورپ کے دوسرے ملکوں پر فوقیت ہوئی۔

فرائیسی انقلاب کا ایک اہم عنصر تشدد پسندی کا تھا۔ یہ عنصر بعد میں بھی ہر انقلاب کی خصوصیت رہا۔ اور دہشت کا زور ہر انقلاب میں طویل ہوتا ہے۔ اسی لئے اکتوبر 1793ء میں کوئنٹن نے یہ اہم اعلان کیا کہ "فرانس کی حکومت لٹائی ہے اور یہ اس وقت تک رہے گی جب تک کہ اس کا نام نہیں ہو جائے" اس کا مطلب تھا کہ انقلاب کے نام پر حکومت ہر قدم اٹھا سکتی تھی۔ کار، کل نے فرائیسی انقلاب میں تشدد کو جائز بتلایا ہے کیونکہ یہ بد فطرتوں کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا۔

فرائیسی انقلاب نے قدیم نظام کو جو کہ فرسودہ اور خستہ ہو چکا تھا اور جس کی بنیاد میں سابق تاجداروں اور طبقاتی تقسیم گہرائی کے ساتھ موجود تھی اس نظام کی ایک ایک اہمیت کو انکار پھینکا اور سیاسی و سماجی اور مذہبی ادارے و روایات کی نئے سرے سے بنیادیں۔ مراعات و امتیاز کی وجہ سے فرائیسی قوم نکلنے لگی۔ طبقوں میں غی ہوئی تھی اس کا خاتمہ کر کے ایک متحد فرائیسی قومیت کی تشکیل کی۔ چنانچہ انقلاب کے نتیجہ میں طبقاتی زبان ختم ہو کر ایک قومی زبان بنی۔ ریاست کی جانب سے تمام شریوں کے لئے مفت تعلیم کا انتظام ہوا۔ قومی اتحاد کے لئے قومی جھنڈا "ترنہ" قومی فوج اور قومی پھنیوں کا رواج ہوا اور جب حکومت میں عوام کو اقتدار اعلیٰ ملا تو انہوں نے انتظامات اور حق خودار دی کے ذریعہ قومیت کے عناصر کی تشکیل دی۔

بادشاہت کے خاتمے سے جمہوری اداروں کو مضبوط کیا اور فرد کو ایک اعلان تشدد کے تحت آزادی کی ضمانت دی گئی جس کا تحفظ دستور اور قانون کے ذریعہ کیا گیا۔ قانون کے ذریعہ مداخلت کے اصول قائم کر کے تمام فرائیسی قوم کو ایک کر دیا۔

فرائیسی انقلاب نے جہاں دنیا بھر کے مظلوم عوام کو بددھ کا پیغام دیا اور انہیں اجتماعی

کلام کے خاتمہ کی امید دلائی، وہاں دنیا بھر کے رجعت پرست اور مراعات یافتہ طبقوں کو اس سے خوش ہوئی کہ اس انقلاب کو کیسے روکا جائے۔ ان کی فساد کی برعادی میں برک نے کی۔ اس نے اس خیال کا اظہار کیا کہ حکومت کرنے کا حق صرف امرہ کو ہے کیونکہ ان کے پاس تعلیم، جانور اور نباتات ہوتی ہے۔ اس نے ان کا حکومت و اقتدار پر قابض ہونا ایک فطری امر بتا دیا ہے جب نچلے طبقے کے لوگ جو جاہل اور غیر تعلیم یافتہ ہوتے ہیں وہ صاحبوں سے محروم ہوتے ہیں اور حکومت کرنے کے اہل نہیں ہوتے۔ جمہوریت اور جانور کی فطرتی طور اس کی تقسیم آزادی کے لئے ایک خطرہ ہے اس لئے قائم شدہ اداروں کو مثلاً چرچ و میوزیم کو قائم رہنا چاہئے تاکہ یہ معاشرہ متنازعہ سے بچا سکے۔ ایک مستحکم معاشرے کے لئے ضروری ہے کہ اس میں تہذیب آمیز اصلاحات کی جائیں۔

مراعات یافتہ طبقے جو قدیم نظام کے حامی تھے وہ انقلاب کی عام کاریوں سے خوف رہتے، وہ دنیا بگوں میں اس دہشت کو بٹھا رہے تھے کہ اس سے یورپ کی تہذیب ختم ہو جائے گی۔ رجعت پرست سیاستدان اپنے اپنے ملکوں میں انقلاب کو روکنے کے لئے خصوصی منصوبے بنا رہے تھے۔ اس کے رد عمل میں انہوں نے عوام اور مزدوروں کی ہر تحریک کو سختی کے ساتھ کچل دیا۔ جیسے انگلستان میں 1839ء میں پیرلز کا قتل عام، ہالینڈ میں مزدوروں کی بنارس کا خاتمہ (1832ء) یورپ میں 1848ء میں جو انقلاب کی لہریں آئیں، انہیں بھی سختی کے ساتھ کچل دیا گیا، لیکن جہاں یہ انقلابی کوششیں ناکام ہوئیں وہیں پر انہوں نے عوامی طاقت کو ابھارا، بھی۔ یورپ میں نئی زمین کی ابتداء اور سوشل ازم کے نظریات کی مقبولیت اسی دوران میں ہوئی کیونکہ فرانسیسی انقلاب کے بعد ان کے سامنے یہ نتائج آئے کہ جب تک غنی چاندلوں کا تحفظ برقرار رہے گا اس وقت تک صحیح معنوں میں اقتدار عوام کو منتقل نہیں ہو گا اور یہ تبدیلی حکمران طبقوں کی تبدیلی ہو گی، مگر عوام ہی طرح سے پابندیوں کا شکار رہیں گے اس لئے ایک ایسے انقلاب کی ضرورت ہے جو غنی چاندلوں کے ادارے کو ختم کر کے اقتدار کو مکمل طور پر عوام کے، جنہوں میں منتقل کر دے۔

اس کے لئے نہیں 1917ء تک انتظار کرنا پڑا۔

روسی انقلاب

راشیہ انقلاب کے بعد روسی انقلاب نے دنیا کی تاریخ پر گہرے اور دیرپا اثرات ڈالے۔ یہ انقلاب بھی صرف روس تک محدود نہیں رہا بلکہ اس نے دنیا کے تمام ملکوں کو متاثر کیا۔ اس انقلاب کی بڑی روسی معاشرے کے طبقاتی نظام میں پیدا ہوئیں اور اندرونی و بیرونی تضادات و واقعات نے انقلاب کو پھیلا دیا اور قدیم نظام کو توڑنے میں مدد دی۔

زار کا دس ایک وسیع درجہ میں ملک تھا کہ جس میں ایشیا و یورپ کی اقوام اور مختلف نسلوں کے لوگ رہتے تھے اور بادشاہ کی مرکزی شخصیت کے گرد مختلف نسلوں اور ثقافت کے لوگ گھومتے۔ بادشاہ روس کے عوام کا سرپرست اور محافظ تھا جس کے خلاف بغاوت کرتا یا سازش کرتا ایک بڑا جرم تھا۔ وسیع اختیارات نے زار کو ایک مطلق العنان بادشاہ بنا دیا تھا کہ جس پر تنقید کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ کسی عوامی فرائض ادارے کی اس نظام میں کوئی متجانس نہیں تھی۔ بادشاہ وزراء کو اپنی پسند سے منتخب کرتا تھا۔ اور جب چاہتا تھا انہیں ہر طرف کرتا تھا زار کی شخصیت میں مختلف انتظامیہ اور دہریہ تئیں اور بے جمع ہو گئے تھے ان وسیع اختیارات کے سبب ایک شخص کے لئے یہ بڑا مشکل تھا کہ وہ ملک کے وسیع علاقوں کو منہمال کرے اس کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ وہ سب پناہ صلاحیتوں کا مالک ہو اور سب پناہ دہائی رکھتا ہو تاکہ وہ ملک کے تمام امور پر نظر رکھ سکے۔

مطلق العنان حکومت کا قیام پولیس، بحری کے اداروں اور شہر پر ہوتا تھا تاکہ مخالفین کو بالکل ابھرنے کا موقع نہیں دیا جائے اور بادشاہ کے خلاف ہر تحریک کو سختی سے کچل دیا جائے۔ ان اداروں کا پھیلاؤ حکومت و بادشاہ کی ضروری کے ساتھ زیادہ ہونا چاہیے اور اس طرح ملک کی آمدنی کا بڑا خرچہ ان اداروں پر ہونے لگا۔ حکومت کے ادارے عوام کے مسائل کو حل کرنے اور ان کی بے روزگاری کے بارے میں کام کرنے کے بجائے انہیں خاموش کرنے پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔

تقریباً دس دسمبر 1896ء میں روس کا زار بنا اس میں سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ کی کمی تھی اس پر ملک الیکزینڈر کا بہت زیادہ اثر و رسوخ تھا، ہر ملک کے معاملات میں دخل دے کر

یعنی ہند کے وزراء کو اقتدار میں لاتی اور انہیں برطرف کراتی۔ یہ وزراء چونکہ دار کے تحت ہوتے تھے اس لئے یہ خوشہ و چاہیسی کے ذریعہ زار کو خوش رکھ کر اپنے اقتدار کو برقرار رکھتے تھے۔

دار عوام سے دور محلات میں رہتا تھا اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلیوں سے بے خبر تھا اس لئے ملکی معاملات کے فیصلوں میں اس کے ارادوں کی پابندی اور سیاسی حالات سے بے خبری ظاہر ہوتی تھی۔ دربار کی سازشوں اور امراء کی باہمی رقابتوں کے سبب اس کے لئے مشکل تھا کہ وہ ان کا بھرپور تعاون حاصل کر سکے کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ ملک کے اعلیٰ عہدوں پر انہیں فائز کیا جائے اور زیادہ سے زیادہ مراعات انہیں دی جائیں۔ سیاسی طاقت کے ساتھ ساتھ زار معاشی وسائل کے ساتھ دوس کے 'میر برین' لوگوں میں سے تھا اس کی زمینیں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں اور سب سے زیادہ سکسن اسی کی زمینوں پر آم کرتے تھے۔

ملک کی صنعت و حرفت میں بھی اس نے سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ اس وجہ سے بادشاہ اور حکومت ایک انتہائی طاقتور ادارے کی حیثیت سے مستحکم تھے کہ جس میں انفرادی آزادی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔

بادشاہ کے بعد بدست کے سب سے زیادہ طاقتور ادارے نوج اور نوکر شاہی تھے۔ جن کی مدد سے بادشاہ و امراء و جاگیردار دوسرے طبقوں کو دبا کر رکھتے تھے۔ نوکر شاہی اور نوج میں صرف امراء کے طبقہ سے باصلاحیت اور ذہین افراد کو لیا جاتا تھا اور انہیں اپنے عہدے کے اعتبار سے وسیع اختیار ملتے ہوئے تھے۔ ان کی وفاداری چونکہ دار سے ہوتی تھی اس لئے وہ اس کے سامنے جواب دہ ہوتے تھے۔ ان کا تعلق عوام سے بالکل نہیں ہوتا تھا اور یہ خود کو عوام کا شکر ادا سمجھ کر انہیں ذلت و حقارت سے دیکھتے تھے۔ اعلیٰ عہدوں پر ان کی اجازت داری کی وجہ سے دوسرے طبقوں کے باصلاحیت افراد کے لئے آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے تمام راستے بند تھے۔

بادشاہت کے ادارہ کا سب سے مطبوعہ ستون امراء تھے جن کی بڑی بڑی جاگیریں پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ اپنی مراعات کے آئینی دائرے میں اس طرح گھرے ہوئے تھے کہ یہ ملک میں کسی قسم کی اصلاحات نہیں چاہتے تھے اور اپنی مراعات سے دستبردار ہونے کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ خصوصیت سے معاشی اصلاحات کے سخت مخالفین میں تھے کیونکہ اس سے ان کی مالی حالت پر اثر پڑتا تھا۔ 1900ء میں یہ طبقہ اپنے جود اور محنت کی وجہ سے نوال

پہرہ پہناتا تھا اور اس میں باصلاحیت افراد کی تعداد کتنی جاری تھی۔ دوس کا آئینہ دیکھ کر چہچہائی عمل خود پر حکومت کے ساتھ تھا اور اس کا کام حکومتی اداروں اور ریاست کا تحفظ تھا اس لئے یہ لوگوں سے کٹ گیا تھا اور ان کے جذبات و خواہشات کو سمجھنے سے قاصر تھا۔

اس کے مقابلہ میں آبدی کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی جو خاندانوں کی شکل میں گاؤں میں بچی بچی زندگی گزارتے تھے۔ یہ معاشرہ میں سماجی لحاظ سے انتہائی پست اور کچے درجہ پر تھے۔ 1897ء میں جیولف نے ان کے بارے میں لکھا تھا کہ "یہ لوگ گاؤں میں سو بیٹیوں کی طرح رہتے تھے" ان کے ساتھ "مناشیٹنا" دھرتی تھا کیونکہ یہ چال "خلیہ" گندے "بے ایمان" اور "بے یار" تھے۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بے امن نہیں رہ سکتے تھے بلکہ جھگڑا لیتے۔ وہ ڈرتے تھے، ہر ایک پر شبہ کرتے تھے اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے تھے۔ "پھر وہ سوال کرتا ہے کہ "خوئی" یہ مانگ کیوں ہوتی؟ اس کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے کہ "صحت کی یاد دہی" صحت سردی غربت نہیں کھالے گی" اور کسی مدد کی توقع ناکندہ ہوتا ہے وہ وجوہات نہیں سمجھ سکتے۔ ان کے بارے میں لکھیں گی۔ "ان پر شکوک و شبہات تھے اگر وہ ٹیکس نہیں دے سکتے تھے تو قید و بند گاؤں سے چلتی کرتا اور خود کے ساتھ جسمانی طور پر لذت پہنچاتا عام روایات تھیں۔ ان میں سے اکثر کسان زندگی بھر اپنے گاؤں سے نہیں اٹھ سکتے تھے اور پوری زندگی ایک ہی جگہ گزار رہتے تھے۔ غربت و افلاس اور حماقت نے انہیں بالواسخت بنائے تھے اور توہم پرست بنا دیا تھا اور ان میں اپنی زندگی کو بدلنے کا بالکل شعور نہ تھا اس میں تھیں۔

تیسرا گروہ تعلیم یافتہ لوگوں کا تھا جن میں 'مجر'، 'دکیل'، 'استاد' اور متوسطہ طبقہ کے لوگ شامل تھے۔ یہ لوگ تعلیم یافتہ اور روشن خیال ہونے کے سبب قدیم نظام اور اس کی خرابیوں سے ہزار تھے۔ چونکہ اس طبقہ کی راہ میں رکاوٹیں ہی رکاوٹیں تھیں اس لئے ان کا مطالبہ تھا کہ دوس میں معیاری حرا کے ساتھ ادارے ہوں تاکہ ان کے ذریعہ زیادہ سے زیادہ آزادی حاصل کر کے "بے بیٹہ" بنیں۔

اس طرح دوس کا معاشرہ دو بڑے طبقوں میں بٹا ہوا تھا 'مراعات یافتہ' اور 'عموم لوگ'۔ مراعات یافتہ طبقہ میں امراء، زمیندار، نوکر شاہی، نوج کے بڑے عہدہ دار، پادری اور بڑے تاجر شامل تھے۔ یہ لوگ مطہر تہذیب و تمدن سے متاثر تھے اس لئے ان کا طرز معاشرت اور رہن سہن مطہر تھا ان کی تعلیم یورپ کے تعلیمی اداروں میں ہوتی تھی اور یہ لوگ آہیں فراہمی نہیں مینے تنگ کرتے تھے۔ جس میں اور اگر بڑی زبانوں کا پانچا مذہب ہونے کی علامت

ہیں اس کی پیدوار پر ان کا حق ہونا چاہئے۔ ریاست جمہور اور عالمگیر اور غیر عالم کے ان سے صنیں چھین لیتے ہیں اور انہیں ان کی نعت سے محروم کر دیتے ہیں۔ ان سے یہ حق چھیننا چاہئے اور جو طور کام میں کرتے انہیں کشتہ کو بھی نہیں مٹا چاہئے۔

کسانوں کی تبدیلی کی اس خواہش میں تعلیم یافتہ طبقہ نے ان کا ساتھ دیا۔ چونکہ محروم و تفریح پر پابندی تھیں سیاسی آزادی کا فقدان تھا اس لئے ان پابندیوں کی وجہ سے دوس میں خفیہ انقلابی جماعتوں کی ابتداء ہوئی جنہوں نے خفیہ بدعشوں کتابوں اور اشتہارات کے ذریعہ لوگوں میں انقلاب خیالات کو پھیلانا شروع کیا۔ یہ انقلابی جماعتیں ایسے لوگوں پر مشتمل تھیں جن میں غلوں، گن اور جذبہ تھا۔ اس کا اظہار انہیں خطاب سے ہوتا ہے جو 1878ء میں ایک جماعت کے انقلابی اراکین سے کیا گیا تھا۔

”وہ کہہ کر تم اپنی تمام روحانی دہائی قوتوں کو انقلاب کے لئے وقف کر دو گے اور اس کی خاطر اپنے خاندان ذاتی تعلقات محبت اور دوستی کو قربان کر دو گے اور اگر ضرورت پڑے تو بغیر ٹھیک کے اپنی جان بھی دیدو گے اس لئے تمہیں چاہئے کہ کوئی نئی حاکمانہ دیکھو اور اپنی جماعت کے علاوہ کسی اور چیز کو اپنا مقصد سمجھو اپنی جان خواہش اور ہر چیز کو جماعت کے لئے وقف کر دو۔“

حکومت نے ان انقلابی سرگرمیوں کا سختی سے جواب کیا اور انقلابیوں کو پکڑنے کی خاطر انہیں جیلوں میں ڈال دیا۔ ساجیہ میں جہ دھن کیا گیا اور سرائے موت کے ذریعہ ان کی سرگرمیوں کو روکنے کی کوشش کی گئی۔ تاریخ کا یہ اصول رہا ہے کہ جس قدر تشدد کے ذریعہ ایک چیز کو دبا جاتا ہے اس قدر مزاحمت کا جذبہ شدید اور مگر ہوتا جاتا ہے۔ اس لئے تشدد کے ساتھ ساتھ دوس میں بھی مزاحمتی تحریکیں بڑھتی گئیں اور انقلابیوں نے جب نظام کو تبدیل کرنے کی کوئی راہ نہیں دیکھی تو انہوں نے دہشت گردی اور تشدد کا راستہ اختیار کیا۔ اس میں نہ صرف زار پر جسے کئے گئے (ایک صد میں 1881ء میں البکر ہزار دم مارا گیا) بلکہ فوج کے بڑے عہدے دار، نوکر شاہی کے افسران اور اہلکار کو قتل کرنے کا سلسلہ شروع ہوا۔ نو جوان انقلابیوں کے جذبہ کا اظہار اس ایک واقعہ سے ہوتا ہے کہ جب ایک شہرلوہ کے قتل کے مجرم سے کہا گیا کہ اگر وہ زار سے ملانی مانگ لے تو اسے رہا کر دیا جائے گا اس پر اس نے کہا کہ ”میں کیونکہ میری موت دوسرے انقلابیوں کو حوصلہ دے گی۔“

حکومت کا خیال تھا کہ سرائوں کے ذریعہ انقلابیوں کی ہمتوں اور حوصلوں کو پست کیا جائے گا مگر اس نے انقلابیوں کو اور سخت جلاں بنا دی۔

تھی۔ روسی دہلی میں یہ لوگ اپنے ماتحتوں اور ملازموں سے ہت کیا کرتے تھے۔ ان کا زیادہ وقت دعوتوں رقص و سرور کی محفلوں اور دیگر ثقافتی سرگرمیوں میں گزرتا تھا۔ اکثر امراء اپنی جاگیرم حویلیوں میں رہتے تھے اور اپنا زیادہ وقت میدان شکار میں گزارتے تھے۔ اس کے علاوہ بڑے بڑے شہروں میں ان کے محلات تھے جہاں یہ آتے جاتے رہتے تھے۔ تعلیمی و تفریحی لحاظ سے یہ خود کو علم سے پرتر سمجھتے تھے۔ اس لئے معاملات یافتہ طبقوں کی دنیا اور تھی جہاں زندگی بڑی سسل اور مہنگ رفتاروں کے ساتھ آہستہ آہستہ خوشگوار طریقہ سے بسر ہوتی تھی جہاں موسیقی کی دھنیں رقص کی انگڑائیاں اور مصوری کے خوش رنگ تھے جہاں فیض کے نت نئے انداز، زیورات و خواہرات اور طبیعات کی رنگین آنکھوں کو چکا چوند کر دیتی تھی اور پھر جہاں عورتیں نڈ کی برسات اور بدالیں تھیں۔

خود زار کے محلات پر سے دوس میں پھیلے ہوئے تھے جہاں وہ ہزاروں ملازموں اور خادانوں کے ساتھ اپنے خاندان کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ اس کی اپنی خصوصی زمینیں تھیں سینئر تھے اور تفریح کے لئے محفوظ مقامات۔

اس کے مقابلہ میں غیر مراعات یافتہ اور محروم لوگوں کا طبقہ تھا۔ یہ مدیعی طور پر بالکل روسی تھے، مغربی تہذیب و تمدن سے نفرت کرتے تھے۔ پیٹریڈی گریڈ کے زمانہ میں ’س نے دوس میں مغربی تہذیب کو فروغ دیا۔ یہ فروغ عوام کے طبقات کے خلاف ہوا اور اس میں ن سے قربانی دہائی اس لئے ان میں مغربی تہذیب کے خلاف انقلاب جذبات اور یہ جذبات ان طبقوں کے خلاف بھی تھے جنہوں نے اپنے معاشرہ کی روایات سے علیحدہ کر کے خود کو مغربی بنا لیا تھا۔

اس طرح سے ان دو دنیاؤں میں بڑا فرق تھا۔ مراعات یافتہ طبقہ خوشبوؤں اور گیتوں کی دنیا میں رہتا تھا، جبکہ غیر مراعات یافتہ لوگ گندگی و فحاشی میں گھرے چھوٹے اور تنگ مکانوں میں زندگی گزارتے تھے۔ حکومت کی تبدیلی بادشاہ و امراء کی عیوبوں پر خرچ ہوتی تھی جب کہ ملک کی حالت تنالی فراپ تھی۔ سڑکیں و شاہراہیں مٹی پھولی تھیں، تعلیم کا کوئی بندوبست نہیں تھا۔ پولیس و انتظامیہ بد عنوان تھی رشوت کا عام رواج تھا اور کسی بھی جگہ وقت کی پابندی کا کوئی خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔

184۰ء میں جب روس کے ابتدائے ہوئی تو اس نے دوس میں معاشرتی جمود کو توڑا۔ لوگ گاؤں سے شہروں میں گئے تو انہوں نے وہاں محلوں کی زندگی کا عوارث کرنا شروع کیا اور ان میں یہ جذبات پیدا ہونا شروع ہوئے کہ جس دشمن پر وہ کام کرتے ہیں جن فصلوں کو وہ اگاتے

وہ دھت گردی کی یہ کاروائیاں اگرچہ نظام کو تبدیل نہیں کر سکیں مگر انہوں نے مراعات یافتہ طبقوں کا سکون ضرور پیدا کر دیا اور انہیں یہ احساس ضرور ہوا کہ ان کی مراعات محفوظ نہیں ہیں اور ان کے تحفظ کی ضرورت ہے۔

جب حکمران طبقوں کو اس بات کا احساس ہو جاتا ہے کہ نچلے طبقوں میں ان کے خلاف سب سے جتنی پیدا ہو رہی ہے اور ان کی مراعات کے خلاف لوگوں میں غم و غصہ کے جذبات ابھر رہے ہیں تو اس وقت وہ قدیم نظام کو بچانے کے لئے اصلاحات کا سہارا لیتے ہیں تاکہ اس درجہ سے معمول تبدیل ہونے کے ساتھ وہ اس کا تحفظ کر سکیں۔

ایک ایسے وقت میں جب کہ نظام میں بنیادی تبدیلیوں کی ضرورت ہوتی ہے اس وقت محض اصلاحات کے ذریعہ معاشرے کی فٹ پھوٹ کو نہیں روکا جاسکتا ہے کیونکہ یہ اصلاحات پیش اوپر سے آتی ہیں اور حکمران طبقے ان اصلاحات کو شروع کرتے ہیں اس لئے ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اصلاحات ایک محدود دائرے میں رہیں اور ان کے ذریعہ ان کی مراعات ختم نہ ہوں۔ اس لئے نظام میں بنیادی تبدیلی لانے والے یہ اصلاحات معاشرے کی غریبوں کو دور کرنے میں ناکام ہوتی ہیں۔

دوسری معاشرے کے مسائل کا حل بھی اصلاحات کے ذریعہ کرنے کی کوشش کی گئی اور یہ کام سہلی دہائیوں سے کیا جا رہا ہے۔ 1892ء سے 1903ء تک وزیر مالیات تھے اس نے دس کے معاشی مسائل اور اقتصادی بحران کا یہ حل نکالا کہ دس کو ایک منسقی ملک بناد جائے کیونکہ دوسری صورت میں دس پر دس کے دوسرے ملکوں کے مقابلہ میں پس ماند رہ جائے گا اور اس طرح اس کی اقتصادی فلاحیت پر پرانی ممالک قابض ہو کر اس کو دس کے عہدہ کر دیں گے۔ منسقی ترقی کے لئے اسے سرمایہ کی ضرورت تھی اس لئے اس نے فرانس اور بلجیم سے قرضے لئے اور دس میں ہماری منسقی قائم کرنا شروع کر دیں اور کوشش کی کہ دس منسقی طور پر یورپ کے ہم پلہ ہو جائے لیکن منسقی ترقی کے باوجود دس میں قوم کا سرمایہ زندگی بھر نہیں ہوا۔ دس کی زندگی اسی طرح سے دبا رہی۔ فلیس جہ ہولی رہیں لگا آتے رہے کسانوں پر فلیس کا بوجھ بڑھتا رہا اور ان میں قدیم نظام سے نفرت بڑھتی رہی۔

نئی منسقی کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ اس سے مزور طبقہ پیدا ہوا۔ یہ مزور ان کسانوں سے تعلق رکھتے تھے جو ملکوں اور دیہات کی غربت و افلاس سے تنگ آکر شہروں میں آکر کم کم کمزوروں پر ٹیکسز میں ملازم ہونے لگے۔ اگرچہ ان کی زندگی سخت غور محنتوں سے گھری ہوئی تھی اور بہت کام کرنے کے باوجود انہیں دینا رہنے کے لئے بہت کم ملتا تھا۔ مگر ان

ٹیکسز کی زندگی نے انہیں سیاسی شعور دیا۔ اگلے کام کرنے نے ان میں اتحاد و اتفاق کو پیدا کیا اور ملازمین کے لئے اشتراکیتوں نے ان میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کیا۔ جتنی و تشدد سے بھرپور زندگی گزارنے کے بعد یہ صحیح انقلابی بن کر ابھرے۔

کسان اور مزور دوسرا انقلاب کا ہر اول دست اس لئے بنے کہ یہ ان محروم طبقوں میں سے تھے کہ جن کے پاس کچھ نہیں تھا اور یہ زندگی میں کچھ حاصل کرنے کے لئے برا انقلابی تحریک میں شامل ہونے کے لئے تیار تھے۔

ان محروم اور محظوم طبقوں کی حمایت میں دس کا دانشور اور تسلیم یافتہ طبقہ آگے آیا اور انہوں نے مل کر انقلابی تحریکوں میں حصہ لیا۔ اس نے تحریکوں کو ایک متحدہ منصوبہ اور نصب العین کو متعین کرنے میں مدد دی۔

منسقی اصلاحات نے دس کے جاگیردار ساحلوں کو متاثر کیا کیونکہ ایک مرتبہ جب ملک میں منسقی عمل شروع ہوا تو منسقی قاضیوں کے تحت معاشرے کے وراثتی اسامیہ کو بدلنے کی ضرورت بھی پیش آئی۔ جاگیردار طبقہ ان تبدیلیوں سے باخوش ہوا اس لئے انہوں نے اس کی جانب سے دس کی اصلاحات کی مخالفت شروع ہو گئی کیونکہ وہ ان تبدیلیوں سے خوف زدہ تھے جو صنعت اپنے ساتھ لا رہی تھی جس میں سب سے پہلی تبدیلی یہ تھی کہ تعلیم کو عام کرنے کی غرض سے اسکولوں کا اضافہ ہو رہا تھا۔ تعلیم جاگیردار طبقہ کے لئے سب سے زیادہ خطرناک تھی اس لئے دس نے داس کے حاکم کو محظوم ہے کہ تعلیم لوگوں کو محروم کر دے گی مگر دوسری عوام تہذیب اور روحانی حیاتی سے دور تو بن سکتی تھی مگر دس میں اس لئے انہیں تبدیل کرنے کے لئے تعلیم لازمی ہے۔

منسقی ترقی نے تاجر طبقہ کو آگے بڑھایا اس لئے جاگیرداروں نے یہ محسوس کیا کہ اس سے ان کی مطلق حیثیت متاثر ہو رہی ہے کیونکہ یہ تاجر طبقہ کے مفاد میں تھا کہ دس کسان کو ضرر میں مزور بنا کر لائے اور اس سے ٹیکسز میں کام کر لائے۔ یہ عمل جاگیرداروں کے لئے فائدہ مند نہیں تھا کیونکہ ٹیکسز اور شہری زندگی مزور کو سیاسی طور پر باشعور بنا رہی تھی۔

سب سے پہلی بات یہ کہ کسی ملک کی منسقی ترقی صرف یہ نہیں کر سکتی کہ دس بھاری جائے اور ہماری منسقی لگا دی جائیں بلکہ اصل کام یہ ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ معاشرہ کی نفسیاتی اور ذہنی حالت کو بھی بدلا جائے کیونکہ اصل مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ ساحلوں کا ذہن منسقی تبدیلیوں کو قبول کرے۔ منسقی ترقی اپنے سے مسئلہ نہیں کی جاتی بلکہ اس کی نشو و نما ساحلوں کے اندر اور اس کی جڑوں میں سے ہوتی ہے۔ محض فنی صورت دے سوائے کو باہر سے ملنا کہ اس

بنیاد پر ملک کو مصطفیٰ نہیں بنایا جاسکتا ہے۔ یہ عمل جب تک معاشرہ خود نہ کرے اس میں کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ ایجاد ایک شخص کے ذہن کی پیداوار نہیں ہوتی ہے بلکہ اس کے پس منظر میں معاشرہ کی ترقی، اس کی جنگی اور ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے روس کے پس منظر اور درامتی معاشرہ میں مصطفیٰ ترقی پر نہیں بھروسہ کیا کہ وہ نظام جاگیرداری میں تمام اورے اور روایات اس کے خلاف تھیں۔ روس کی مطلق العنان بادشاہت اور اس کا ذرا ترقی و ترقی و ترقی مصطفیٰ بننے پر تیار نہیں تھا۔ اس لئے 1903ء میں دربار کی مخالفت کی وجہ سے وہ کو 'مستعلیٰ' بنایا۔

فروری 1904ء میں جاپان نے روس کو ایک بحری جنگ میں شکست دیدی۔ اگرچہ فتح کوئی بڑی اور اہم نہیں تھی مگر اس نے نفسیاتی طور پر روس میں اہم مسائل پیدا کئے۔ ایک وسیع و عریض اور طاقت ور ملک کی پچھلے سے جاپان کے ہاتھوں شکست نے روس اور اس کے معاشرے کی کمزوریوں کو دنیا کے سامنے کھول کر رکھ دیا (جس 1905ء میں جاپان نے روس کے بحری بیڑے کو عمل طور پر چاہ کر دیا) روسی عوام نے اس کمزوری کی تمام ذمہ داری حکومت اور حکمران طبقوں پر ڈالی اور احتجاجی مظاہروں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔

1905ء میں ایک مظاہرہ قادر گاجس کی راہنمائی میں مزدوروں نے کیا۔ ان کا مقصد صرف یہ تھا کہ موسم سرما کے محل میں جا کر بار کو لپیٹے مطالبات پیش کریں۔ بار گاہوں بذات خود پولیس کا آدمی تھا جسے مزدوروں میں تعینات کیا گیا تھا۔ جب مزدوروں نے سامع کیا تو پولیس نے مظاہرین پر فائرنگ کر کے کئی سہ مردوں، عورتوں اور بچوں کو مار ڈالا تو اس واقعہ کے بعد سے زار نور عوام کے درمیان جو تعلق تھا وہ ختم ہو گیا، اور زار عوام میں قاتل کے طور پر مشہور ہو گیا۔

اس واقعہ کے بعد انگریزوں میں مزدوروں نے عمل برتن کی جس نے تمام کارکنوں کو بالکل برے کر دیا۔ مزدوروں نے سوویت کی تشکیل کی۔ ایک ہزار مزدوروں پر ایک سوویت بنائی گئی تاکہ وہ مزدوروں کے مسائل کو حل کرے۔ اس تحریک میں یون رائسل نے نمایاں حصہ لیا۔

ان مظاہروں نے زار کو اس پر مجبور کیا کہ وہ ملک میں سیاسی اصلاحات کا آغاز کرے۔ اس مقصد کے لئے اس نے ایک پارلیمنٹ کو بنایا جس نے انگریزی منسٹر کے درجہ بنیادی حقوق کا اعلان کیا۔ سیاسی جماعتوں کے بنانے کی اجازت دی گئی اور ایمپیرل (ایو) (اسبل) کو بلائے کا اعلان کیا گیا۔ اگرچہ بکے بعد دیگرے چار اسمبلیوں کو بلا دیا گیا مگر زار اور مراعات و فوٹے نے سیاسی عمل کو آگے نہیں بڑھایا۔ عوامی مظاہروں کو فوج سختی سے کچل رہی تھی۔ جو حالتیں ابتداء میں دی گئی تھیں انہیں واپس لے لیا گیا اور جب بھی ضرورت ہوئی ایمر جنسی کے درجہ

قرائین کا غلط کر دیا گیا۔ انہیں بالذوالوں کو سخت سزائیں دی گئیں اور انہیں کو سامنے بھاڑا وطن کر دیا گیا۔

اسی دوران دربار میں ایک مذہبی شخص واسپوتن کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ زار کا ولی عہد نیکا ایک ایسی بیماری میں مبتلا تھا کہ جس میں اگر چھٹ گئے سے خون بہتا شروع ہو جائے تو وہ رکتا نہیں ہے۔ یہ ایک سرمدی بیماری ہوتی ہے اور اس کا آپ تک کوئی علاج دریافت نہیں ہوا ہے۔ جب ڈاکٹروں نے علاج سے ایسی کا اعجاز کیا تو انگریزوں نے واسپوتن سے مدد طلب کی اور اپنی مددنی طاقت سے یہ پختہزم کی مدد سے خون بہنے کو روک دیا تھا۔ اس وجہ سے ملک اور دربار کے لوگوں کا واسپوتن پر اعتقاد بڑھ گیا۔ اس سے فائدہ اٹھا کر اس نے حکومت کے معاملات میں دخل اندازی شروع کر دی اور جو بھی اس کی راہی مخالفت کرتا وہ اس کے عہدے سے برطرف کر دیتا تھا۔ اس وجہ سے حکومت کے معاملات میں خرابا پیدا ہوئی۔

1913ء میں دنیائے خاندان کے دور حکومت کے طین مومل پورے ہوئے۔ اور یہ پورے ملک میں زبردست جشن منایا گیا تاکہ لوگوں میں اس خاندان کے لئے وفاداری کے جذبہ کو گہرا کیا جائے۔ جشن میں لوگوں نے جس جوش و خروش سے حصہ لیا اس سے زار کو یہ احساس ہوا کہ وہ عوام میں بہت مقبول ہے۔ لہذا اس کے رویہ میں تبدیلی آئی اور اس کی مطلق ممانعت میں اور اضافہ ہو گیا۔

روس کے معاشرے میں 1905ء کے بعد سے زبردست تبدیلی آئی۔ ناکام انقلاب کے بعد انقلابیوں نے اس کا تجربہ کیا کہ ان کی وہ فہمیں کیوں ناکام رہیں اور اس تجربہ کے بعد انہوں نے انقلاب کے حصوں کی خاطر سخت اصولوں پر عمل کر کے جدوجہد شروع کی۔

ایمپیرل (ایو) (اسبل) اگرچہ لمبی دستوری اصلاحات کا آغاز نہیں کر سکی مگر اس نے اپنے ہیٹ فارم سے جمہوریت کے مواقع ضروری فراہم کئے کہ جس میں ڈنڈن جیل امرلاء، دانشوروں، سکینوں اور ڈاکٹروں نے مل کر جمہوریت پسند جماعت بنائی جس میں بادشاہت کو دستوری اور اپنا اور اپنی جائیداد کے خدشہ کو برقرار رکھنا ان کے مفاد میں تھا۔ ان کے مقابلہ میں وہ اور تمام تہمتیں تشکیل ہوئیں سوشل انقلابی اور سوشل جمہوری۔ ان میں سے سوشل انقلابی جماعت کے کارکن مسلسل قید و بند اور غلیظ کی وجہ سے کمزور ہو گئے تھے جبکہ سوشل جمہوری جماعت داکس کے نظریات سے متاثر تھی اور چیلوئی فلسفہ کی روشنی میں انقلاب کے لئے جدوجہد کر رہی تھی۔

روس میں انقلاب کا عمل ایک طویل عرصہ تک جاری رہتا تھا۔ کیونکہ صدیوں کے قائم شدہ نظام کو توڑنے میں وقت درکار تھا مگر 1914ء کی جنگ نے لوٹ پھوٹ کے اس عمل اور انقلاب کو بہت جلد ممکن بنا دیا۔ روس اس جنگ کے لئے تیار نہیں تھا اس کے اندرونی مسائل اس قدر تھے کہ اس کے لئے جنگ میں شرکت کرنا خود کشی کے مترادف تھا۔ روس پر روسی کے مقابلہ میں منجی و سائنس اور فنی لحاظ سے ایک ہیسی اتحاد ملک تھا۔ اس لئے جب جنگ شروع ہوئی تو روس کی کمزوریاں ایک ایک کر کے سامنے آئے گئیں۔ ہتھیار و اسلحہ، سامان رسد اور لوہے کی کمی ذریعہ حمل و نقل کی مشکل، ریلوے لائنوں کی لرلاہٹ، انقلاب کی باہلی، بد عنوانی ان سب باتوں نے مل کر روس کو پہلے در پہلے شکستوں سے دوچار کیا۔ اس جنگ میں روس کے کسان فوجوں کا بری طرح سے نکل عام ہوا۔ گاؤں کے گاؤں مہربوں سے خالی ہو گئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ فوجیوں میں حکومت اور دار سے نفرت بڑھ گئی۔ جنگ نے ملک کے اندرونی مسائل کو اور شدید کر دیا۔ ریلوں اور اجڑا من کی سخت کمی ہو گئی، فوجوں میں بے انتہا اسلاف ہو گیا۔ اس کے خلاف 8 مارچ 1917ء کو پیزوگرا میں عوام نے مظاہرے شروع کر دیے جن میں عورتوں نے بڑے چڑا کر حصہ لیا۔ 9 مارچ کو جو مظاہرے ہوئے ان پر فوج نے فائرنگ نہیں کی بلکہ وہ خود عوام کے ساتھ مظاہروں میں شامل ہو گئے۔ 30 مارچ کو مزدوروں نے ہڑتال کی۔ چونکہ فوج غلط پر تھی اس لئے مظاہرین کے خلاف فوج کی کسی قہل اور آنکھ فوٹی دیتے بغیر کر کے عوام کا ساتھ دے رہے تھے۔ ان حالات میں دار کی حکومت ختم ہو گئی اور اسمبلی نے حکومت کے اختارات سنبھال لئے۔ دوسری طرف مزدوروں اور سپاہیوں کی اتحادی کے نئے سویت کا قیام عمل میں آیا، اس میں ہر ایک فوجی دست کا ایک نمائندہ اور ہزار مزدوروں کا ایک نمائندہ منتخب ہوئے، اس طرح اسمبلی اور سویت نے مل کر حکومت کی تشکیل کی۔

15 اپریل کو گلاس دم نے تخت سے دست برداری کا اعلان کر دیا، اس کے ساتھ ہی جمہوری حکومت کے قیام کا اعلان ہوا۔

16 اپریل کو لینن سوئٹزرلینڈ سے وین سٹی کی جلاوطنی کے بعد روس آیا اور اس نے اپریل نمبر میں جمہوری حکومت، پولیس، فوج اور نوکر شہری، اور جنگ کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ لینن کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ اس وقت روسی عوام کی سب سے بڑی خواہش امن ہے اس لئے امن کی ضرورت پر سب سے زیادہ زور دیا۔

جی بی حکومت جس کا سربراہ کو شکی تھا اس میں اور پیٹروگراڈ کی سویت میں جمہوری اختلافات پیدا ہو گئے، کیونکہ حکومت دار کی پالیسی کو جاری رکھنے ہوئے جنگ کو ختم نہیں کرتا

چاہتی تھی، جب کہ سویت روسی حکمران طبقوں کی اس جنگ کے خلاف تھی، اور روس کے ساتھ مل کر امن کے حصول کے لئے بہرہ بردار تھا۔

اس عرصہ میں پر سے روس میں جنگ جگہ سویت کا قیام عمل میں آیا۔ 1917ء میں 4 مارچ کو قہل، اگست میں یہ 6 مارچ ہو گئیں اور اکتوبر میں 4 دسمبر میں سویت کا اور مضبوط کر دیا اور وہ جمہوری حکومت سے لکھنے پر چار ہو گئی۔ سویت کی بورڈ اور مراعات یافتہ طبقوں کی نمائندگی کرتی تھی، جسکے ممبروں میں کسان، مزدور، اس فرقے نے جمہوری حکومت کو مستحکم نہیں ہونے دیا۔ جنگ کے پہلے سویت کی کسانوں نے عوام کی ہمدردیاں سویت کی طرف کر دیں۔ ملک میں اشتہار سے وہ ہمدردیاں میں کسانوں نے بغاوتیں شروع کر دیں۔ زمینوں پر قبضہ کرنا اور جاگیرداروں کو چھوڑنے، بغاوت کے اہم عناصر تھے اور کھلا سے فوجی قرار ہو کر آئے گئے، اور اپنے افسروں کو قتل کر کے بغاوتیں کرنے لگے۔ شہروں میں مزدوروں نے فیکٹریوں پر قبضہ کر لئے۔

ان حالات میں قدیم نظام کے حامیوں نے فوجی آمریت قائم کرنے کی کوشش کی اور کوہلی ہون کی سربراہی میں فوج نے پیٹروگراڈ پر قبضہ کر دیا، لیکن اس کی فوج سویت فوج کے قہل سے ٹھہر سکی۔ روس کے فوجی لڑنے کے بجائے عوام سے مل گئے اس طرح داکینی باؤنڈ کی یہ کوشش ناکام ہو گئی۔

اس موقع پر لینن نے لوگوں کے جذبات اور وقت کی ضرورت کے تحت سمجھ دیا۔ اس میں پروٹاری آمریت کا قیام، جنگ بندی، ماکہ فوجی مطمئن ہوں، کسانوں میں زمینوں کی تقسیم، پھنسی توہینوں کے لئے حق خود رائے دہی، اور سماجی انصاف شامل تھے۔

فرانسکی نے دیکھ کر اس کو سچ کر کے حکومت پر قبضہ کا منصوبہ تیار کیا۔ نومبر کو ہاشٹک نے سوائی گل پر قبضہ کر کے پیٹروگراڈ پر اپنا اقتدار قائم کر لیا اور اس طرح انقلاب کا سبب ہو گیا۔ نئی حکومت کا سربراہ لینن ہوئے، اس نے فوری طور پر دو اہم اعلانات کئے، جنگ بندی، در زمین کاسکالوں میں تقسیم کرنا، ان دو اعلانات نے مددی عوام کو نئی حکومت کے ساتھ کر دیا۔

اکتوبر انقلاب کے بعد روس کی نئی حکومت کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ تشکیل نو کا تھا۔ دار کی حکومت کی بد عنوانیوں، جنگ کی تباہ کاریاں، سیاسی اشتہار اور افراطی، اور انقلاب کے دوران لوٹ پھوٹ نے ملک میں لاقعدا مسائل پیدا کر دیے تھے۔

نئی حکومت نے قدیم دواہوں کو ختم کر کے 1918ء کے دستور کے تحت مراعات یافتہ طبقوں کا خاتمہ کر کے مساوات کے اصول کو قائم کیا۔ چرچ، خفاقیں، اور جاگیرداروں کو ختم کر کے ان

کی زمینوں پر قبضہ کیا، مذہب کو نجی معاملہ قرار دیا، عورتوں کو برابر کے حقوق دینے، نسلی تفرقات کے خلاف قوانین بنائے، ملت تقسیم کا بندوبست کیا، لوگوں کو مکانات فراہم کئے، بنگلوں اور مستحقوں کو قومی ملکیت میں لیا۔ دوسری اصلاحات میں گری گورنر کینڈو کو مدد دیا اور رسم لخت کو سہل بنانے کا کام کیا۔

انقلاب کو دوسرا بڑا خطرہ ان رجعت پسند دوسروں سے تھا جو خلیفہ روسی کہلاتے تھے اور غیر ملکی طاقتوں کی مدد سے سرخ فوجوں سے لڑ رہے تھے۔ اندرونی طور پر کئی جماعتیں اور گروہ تھے جو بالترتیب حکومت کے خلاف تھے۔ ان حالات میں تشدد کی پالیسی کو اختیار کیا گیا اور ٹرٹسکی کی سربراہی میں سرخ فوج نے متعدد اور ظلم و ستم کے ساتھ جنگیں لڑیں اور مخالفت کو سختی سے ختم کر دیا۔ یہ سلسلہ 1921ء تک جاری رہا اور نئی حکومت خانہ جنگی، معاشی بد حالی اور انتشار کے پودھوں کا قلم رقی اور مسائل کو ایک ایک کر کے حل کیا۔

نئی معاشی پالیسی کے تحت ملک کی تعمیر و کارآمد شروع ہوا اور جب ملک معاشی و سیاسی طور پر مستحکم ہو گیا تو اس کے ساتھ ہی تشدد کا بھی خاتمہ ہو گیا۔ تحریروں کی آزادی ملی اور زندگی کے معمولات دوبارہ سے لوٹ آئے۔

بلکہ سے سے کر انقلاب تک روسی عوام نے ان سخت قیامتوں میں مشکلات و غمگینیوں کو برداشت کیا اور انقلاب کے بعد قدیم نظام کے خاتمہ اور نئے نظام نے انہیں جو توانائی اور قوت دی سے استعمال کر کے نئی حکومت نے روس کو ایک عالمی طاقت بنا دیا۔

چینی انقلاب

رائیس اور روسی انقلابات کے بعد تیسرا اہم انقلاب چین کا ہے۔ یہ ایشیا کے ایک ایسے ملک میں آیا کہ جو زمانہ قدیم میں تہذیب و تمدن کا مرکز رہ چکا تھا، مگر وقت کے ساتھ اس کے تہذیبی و تمدنی ہمارے فرسودہ ہوتے چلے گئے اور یہ ابھرتے ہوئے پودے کے مقابلہ میں پس ماندہ ہوتا چلا گیا۔ چین جغرافیائی محل وقوع، وسعت، زبان، اور ثقافت کے اعتبار سے ایک بے اکرار ملک تھا۔ جب یورپی اقوام سمندر پار نو آبادیات کی تلاش میں نکلیں تو چین اپنی کمزوریوں کے ساتھ ایک بے لقمہ تر تھا کہ جس میں اپنا دفاع کرنے کی سکت میں کمی تھی، اسی لئے برطانیہ، جرمنی، امریکہ اور جاپان نے اس کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس کا خوب استحصال کیا۔

مغربی اقوام کے استحصال اور ان کے ساتھ تعلقات نے چین کے معاشرہ کے جمود کو توڑا اور جب مغربی انکار و نفیروں کا رواج ہوا تو چین ایک طویل عرصہ بعد اپنی تباہی سے باہر نکل آیا اور خصوصیت سے نوجوانوں میں نئے خیالات کے تحت حالات کو تبدیل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا۔ یہ جذبہ قومیت کی شکل میں پیدا ہوا جس کے تحت انقلابی جماعتوں اور گروہوں کی تشکیل ہونا شروع ہوئی۔ ان تحریکوں نے چین کے فرسودہ سیاسی و معاشی ور سہمی اداروں کو تبدیل کرنے کی جدوجہد شروع کی۔ فن تحریکوں میں غیر ملکیوں کے خلاف بغاوتیں بھی تھیں اور معاشرہ کو سدھارنے کے لئے اصلاحات کے منصوبے بھی۔

چین کا معاشرہ بنیادی طور پر جاگیردارانہ تھا۔ اس کے حکمران طبقے جاگیردار و امراء، بادشاہ کی سربراہی میں ملک کی زمینوں اور ذریعہ پیدوار پر قابض تھے۔ کسانوں کو صرف معمولی اجرت پر ان کی زمینوں پر کام کرنا پڑتا تھا، بلکہ اس کے ساتھ ٹیکسوں کے بوجھ اور پیارے اس کی معاشی حالت کو تباہی کا شکار بنا دیا تھا۔

چین کے کسان اس ظلم و استغلال کے خلاف وقتاً فوقتاً بغاوتیں کرتے رہتے تھے، لیکن ان کی یہ بغاوتیں اس لئے بیٹھ ناکام رہیں کہ ان کے پاس سیاسی شعور کی کمی تھی اور ان کے رہنماؤں میں منصوبہ بندی کی اہمیت نہیں تھی اور نہ ہی یہ بغاوتیں کسی منظم جماعت کی جانب سے پیکاری گئی تھیں۔ مگر تاریخ میں ناکام بغاوتیں بھی اپنے اثرات چھوڑتی ہیں کیونکہ بعد میں

ان کی تالیفوں کا تجزیہ کر کے چینی انقلابی راہنماؤں نے ان سے بہت کچھ سیکھا اور انقلابی عمل میں ان کے بہت سے جنگی حربوں اور اقدامات کو اختیار کیا۔

قبل انقلاب کی ایک جمادی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی جڑیں چینی معاشرے میں پیوست ہیں۔ انقلاب کا عمل چین کے حالات میں پروان چڑھا اور اسے چین کے حالات کے مطابق حال کیا۔ اس لحاظ سے چین کی کیونسل پارٹی نے ماؤ کی سربراہی میں جس انقلابی حدود کی ابتداء کی وہ خاص چین کی سرزمین کی پیداوار تھی۔ ماؤ نے مارکس، اینگلس اور لینن کے خیالات و نظریات سے استفادہ ضرور کیا، لیکن اس نے انہیں چینی بنادیا اور یہی اس کی کامیابی کی ایک وجہ ہے۔

ماؤ نے بنی گرائی کے ساتھ چین کے معاشرے، اس کی اقدار اور دولت کا مطالعہ کیا، معاشرے کی ساخت اور دھانچہ کو جانچا اور پرکھا اور اس بات کی نشاندہی کی کہ چین کے معاشرے کے کون سے طبقے اپنے ہیں جو انقلاب پیدا ہند میں ساتھ دیں گے۔ کون سے طبقے طاقت کریں گے اور کون مسوویں کی بنیاد پر ان طبقوں کو متحد کیا جائے اور کون منسوبوں کے ساتھ انقلاب دشمن عناصر پر حملہ کیا جائے۔

ماؤ نے چین کے معاشرے کا جو تجزیہ کیا اس کے مطابق معاشرہ کا اہم بور طاقتور طبقہ جاگیرداروں کا تھا جس نے اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر امپیریل طاقتوں سے اتحاد کر رکھا تھا اور ان کے ساتھ مل کر چین کے ماری ورائے کا استحصال کر رہا تھا۔ اس طبقہ کے مفاد میں قطعی یہ نہیں تھا کہ معاشرے میں کوئی تبدیلی آئے کیونکہ تبدیلی کا مطلب اپنی مراعات اور طاقت سے مسترد ہونا تھا۔

جاگیرداروں کے بعد بورژوا طبقہ تھا یہ بھی امپیریل طاقتوں کا اہم طبقہ تھا۔ چونکہ چین میں مختلف جڑی طاقتوں کا اثر تھا اس لئے اس طبقہ کے لوگ مختلف گروہوں میں بٹے ہوئے ان طاقتوں کے مفادات کے لئے کام کر رہے تھے اس لئے ان لاکروار اور طریقہ کار بھی بدلتا رہتا تھا جب کوئی ایک طاقت چین کے خلاف ہوتی تو دوسری طاقتوں کے ایجنٹ اس کے خلاف متحد ہو جاتے مگر جب اس کی پالیسی بدلتی تو یہ بھی اس کے ساتھ اپنا رویہ تبدیل کر لیتے تھے مثلاً ایک وقت میں جب امریکا اور یورپی طاقتیں جاپان کے خلاف ہوئیں تو اس کے ایجنٹ بھی جاپان کے خلاف تحریک میں حصہ لینے لگے مگر ان کی پالیسی بدلتی تو یہ بھی ان کے ساتھ ہوا۔ لہذا ان کے اس کردار نے چین کو نقصان پہنچایا اور امپیریل ازم کے خلاف ہمدردی جیڑی سے آگے نہیں بڑھ سکی۔

انہیں میں قوی بورژوا طبقہ بھی تھا جو امپیریل طاقتوں کا ایجنٹ نہیں تھا کیونکہ ان کی مزدوری میں یہ ترقی نہیں کر سکتا تھا مگر اپنے رفقاءات کی وجہ سے یہ رجعت پسند تھا۔ اس کے مقابلہ میں بڑی بورژوا جن میں پھوسے تاہر دوست کار، دریشہ اور لوگ تھے یہ معاشرہ کی تبدیلی کی جدوجہد میں شریک ہونا چاہتے تھے۔

ماؤ نے اس کا اقدار کیا کہ دانشور اور طالب علم کوئی ایک طبقہ نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ مختلف طبقوں سے مل کر ایک جماعت بنتے ہیں۔ چین میں تعلیم کے پڑھنے کے ساتھ ان کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا اس لئے انہیں نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اگرچہ ان میں ہر قسم کے عناصر شامل تھے اور ان میں کچھ امپیریل طاقتوں کے کچھ جاگیرداروں کے اور کچھ بورژوا طبقوں کے ایجنٹ تھے مگر ان دانشوروں اور طالب علموں میں ایسے لوگوں کی بھی بڑی تعداد تھی جو بے روزگاری اور ہرم تحفظ کا شکار تھے اس لئے یہ قدیم نظام کے خلاف ہر اس تحریک میں شامل ہونے کے لئے تیار تھے کہ جو حالات کو بدل کر انہیں ترقی کے مواقع فراہم کرے۔ ماؤ اس کا فائدہ اٹھا کر انقلابی دانشوروں کے بغیر انقلابی جدوجہد نہیں ہو سکتی ہے۔

چین کی آبادی کی اکثریت کسانوں پر مشتمل تھی۔ یہ آبادی کا 80 فیصد تھے یہ بھی کئی طبقوں میں بٹے ہوئے تھے مثلاً امیر کسان جو دیمائی آبادی کا 5 فیصد تھے۔ اگرچہ یہ غریب کسانوں کا استحصال کرتے تھے کہ اپنے کھیتوں میں ان کے ساتھ مل کر کام کرتے تھے اس لئے ان کا تعلق کسان طبقہ سے ہو جاتا تھا متوسطہ درجہ کے کسان دیمائی آبادی میں 20 فیصد تھے چونکہ یہ کسی کا بھی استحصال نہیں کرتے تھے اس لئے انہیں انقلاب میں شریک کر کے ان سے اتحاد کیا جاسکتا تھا۔ غریب کسان دیمائی آبادی کا 70 فیصد تھے ان کے پاس نہ تو زمین تھی اور نہ ہی ان د آدلی اتنی تھی کہ وہ اپنا اور اپنے خاندان کا گزارا کر سکیں اس لئے ان میں تبدیلی کی زبردست خواہش موجود تھی اور اسے زندہ کرنا، امیر بنانا اور کام میں لانا انقلابی قوتوں کا کام تھا۔

کسانوں کے مقابلہ میں چین میں مزدور اور پروتاریہ طبقہ بہت کم تھا۔ ان میں ٹیکسٹائل میں کام کرنے والے مزدور یا چھوٹی صنعتوں اور دکانوں پر کام کرنے والے تھے یہ مزدور دکانوں کے مالک تھے جو روزگار کی تلاش میں شہروں میں آئے تھے اس لئے ان کی جڑیں گاؤں اور کسان طبقہ میں تھیں۔ اپنی تعداد کی کمی اور تعلیم سے محروم ہونے کے باوجود اس طبقہ میں زیادتی اور طاقت تھی۔

ماؤ نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا کہ یہ طبقہ انہیں انقلاب کی جنگ میں جیت

سکتا اس لئے حالات کے تحت ضروری تھا کہ ان تمام طبقوں میں اتحاد ہو جو انقلاب چاہتے ہیں۔ ان میں کسان، مزدور، بچی، بورژوا اور قومی بورژوا جیسے تھے جنہیں ایک متحد اور منتشر کے تحت متحد کرنا ضروری تھا۔

ان طبقوں کے علاوہ چین میں ایسے لوگوں کی بڑی تعداد تھی جو رعایوں اور شہروں میں بے روزگاری اور بے کاری کی زندگی گزار رہے تھے، خود معاش کی خاطر لوگ چوری، ڈاکہ زنی، جرائم کرتے، بیگ و خیرات مانگتے، دلاں یا طوائفوں کا پیشہ اختیار کر کے گزارا کرتے تھے، اپنی سہمی حیثیت کی وجہ سے یہ لوگ نہ سیاسی شعور رکھتے تھے اور نہ ہی کسی قسم کی انقلابی اقدار کے حامل تھے۔ اپنی معاشی مجبوریوں کی وجہ سے یہ رجعت پسند جماعتوں کے ساتھ مل کر ان کے لئے فائدہ گردی کرتے اور کبھی کھراں طبقوں اور اداہل کے خلاف ہو جاتے۔ اس لئے جانے اس بات پر زور دیا کہ ان لوگوں میں سیاسی شعور پیدا کرنا بہت ضروری ہے کیونکہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے پاس کچھ نہیں، انہیں باشعور بنا کر ان سے انقلاب کے نئے بہت کچھ کام ہا سکتا ہے۔

چین کے طبقات کے اس تجزیہ میں مانے نے کئی ذہنی طبقہ کا ذکر نہیں کیا جو جاگیرداروں اور حکمرانوں کے ساتھ مل کر انجمنال میں شریک ہوتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ چین میں اس قسم کا کوئی ذہنی ادارہ وجود میں نہیں آیا جیسا کہ دوسرے ملکوں میں ہوا۔ اگرچہ کئی طبقوں کی تعلیم چین کے طبقاتی سائبر سے گزرتی رہی ہے مگر ان کے سب سے زیادہ فصل تحریک تھی مگر اس نے کوئی طبقہ سے ایسا مذہبی گروہ پیدا نہیں کیا کہ جو حکمران طبقوں کے ساتھ ہوتا۔

مانے نے انقلابی جدوجہد میں کسانوں، مزدوروں، بچی، بورژوا اور قومی بورژوا طبقوں کو علاوہ تاکہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں کے ساتھ مقابلہ کیا جاسکے۔ اس لئے اس نے انقلاب کا جو راستہ چھین کیا وہ قومی اور جمہوری انقلاب تھا جو کہ امپیریل طاقتوں اور جاگیرداروں کے خلاف تھا۔ مگر اس نے اس بات پر زور دیا کہ دونوں انقلابوں کو ساتھ سے کرنا ضروری ہے۔ مانے چین کے لئے عوامی جمہوری انقلاب اس لئے ضروری سمجھتا تھا کہ یہاں سرمایہ دارانہ نظام اپنی پہلی تک نہیں پہنچا تھا۔ اس لئے سرمایہ دارانہ نظام کو ختم کرنے کے بجائے وہ اس پر قبضہ کرنا چاہتا تھا، مگر اس انقلاب کی قوت اور مرکز پرواہی اور کسان تھے۔

مانے اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ عوامی جمہوری انقلاب اس لحاظ سے یورپ اور امریکہ سے مختلف ہو گا کہ اس میں بورژوا طبقہ کی آمریت نہیں ہوگی بلکہ انقلابی طبقوں کا اتحاد ہو گا اور اس کی سربراہی پرواہی طبقہ کر رہا ہو گا۔ یہ اس لحاظ سے ملتی

انقلاب سے بھی مختلف ہو گا کہ اس کے ذریعہ امپیریل ذم اور اس کے پٹھوں کا تختہ الٹا جائے گا مگر ان بورژوا طبقوں کو کچھ نہیں کہ جائے گا جو کہ اس جدوجہد میں ساتھ ہوں گے۔

مانے، مارکسزم اور لینن ازم سے ہم کر لینن کے مخصوص حالات میں اس بات کا پسند کیا کہ چین میں انقلاب کے براہ راست کام کسان کریں گے مزدور نہیں، کیونکہ چین کی صورت حال یورپ سے مختلف تھی۔ یہ ایک نیم نوآبادیاتی نیم جاگیردارانہ اور نیم سرمایہ دارانہ ملک تھا، اس کے شہروں میں امپیریل طاقتوں اور حکمران طبقوں کا تسلط تھا، جہاں فوج، پولیس اور قسری و جاسوسی کے ادارے بڑی سرگرمی سے انقلابیوں کو پھیلنے میں مصروف تھے۔ قید و بند اور موت کی سزاؤں کی وجہ سے انقلابی جدوجہد تنہا کے ساتھ قائم نہیں رہ سکتی تھی اور انقلابی تحریکوں پر حکومت کی کڑی نظر تھی۔

اس حالات میں مانے جس کی صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے یہ نتائج اخذ کئے کہ چین کی قومی یبرساوہ سے ملک وسیع اور پھیلا ہوا ہے، اس میں کچھ بڑے علاقے خوش حال ہیں اور کچھ بے گناہ۔ اس لئے بے علاقے جہاں درخت، تودہ رفت کم ہوں، سواروں کی دقتیں ہوں، دشوار گزار راستے ہوں غذا کی کمیابی ہو، ایسے علاقوں میں انقلابی تحکاتوں کی بنیاد رکھی جائے کیونکہ ان پر حکومت نظر نہیں رکھ سکے گی۔ دور رساتوں میں پامانی کو کسانوں میں حکم کرنے کا رویہ سے سرخ شے گا، کیونکہ کسانوں کی کثرت فائدہ مند اور زندگی کی سہولتوں سے محروم ہے اس لئے یہ انقلاب میں شریک ہو کر سب سے زیادہ جدوجہد کرے گی۔

اس مصوبہ پر عمل کرتے ہوئے مانے نے سب سے پہلے ہنگ کانگ شان میں گورنر لنگانہ بنایا، اس میں کسان، پرواہی، بچی، بورژوا اور پھولے زمیندار شامل تھے۔ ان تحکاتوں کی صورت میں چین میں انقلابی جدوجہد شہر ہوئی۔ ان تحکاتوں کی تعداد بڑھنے کی اس لئے امید تھی کہ چونکہ چین کے بڑے بڑے جاگیردار خانہ بدکیوں میں مصروف تھے جس کے نتیجہ میں ان کی طاقت کمزور ہو رہی تھی۔ ان کے علاوہ چین کے وہ علاقے جو 1926ء اور 1927ء کے انقلاب سے متاثر ہوئے تھے وہاں فوجی تسلط کمزور ہو گیا تھا۔

چونکہ انقلابی لنگانہ کی بنیاد زمین پر تھی، اس لئے مانے نے امیر کسانوں اور پھولے زمینداروں پر تکی نہیں کیا، ابتداء میں اس نے زمینوں کو ضبط کیا، مگر بعد میں اس پاسی کو بدلا اور صرف مقامی حکومت اور بڑے زمینداروں کی زمینوں پر قبضہ کیا، اس نے یہ زمینیں کسان خاندان کے ساتھ کے مطابق ان میں تقسیم کیں۔

مانے نے اس بات پر زور دیا کہ پامانی اور عوام فوجی خدمت کے لئے تیار رہیں تاکہ ان کا

نکارہ اور فوج دونوں محفوظ رہیں۔ نکارہ میں فوجی تربیت لازمی تھی۔ افسر اور عام فوجی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ دونوں کو برابر کی محنتیں ملا کرتی تھیں۔ جنگی قیدیوں کے ساتھ ہر سلوک کیا جاتا تھا اور انہیں نظریاتی تعلیم دے کر آزاد کر دیا جاتا تھا۔

ماؤ نے ان نکاروں میں جو تربیت دی اس کا اصول یہ تھا کہ جب حکمران طبقے کوئیں میں لڑائی میں مصروف ہوں تو سرخ فوج بڑے علاقوں میں جنگ کرے، لیکن جب ان میں امن ہو تو فوج آہستہ آہستہ پیش قدمی کرے اور اپنے نکاروں کو محفوظ رکھے، توجہ دے۔

ماؤ کی گورننگ جنگ کا اصول یہ تھا کہ فوجیوں کو عوام میں بکریل جانا چاہئے اور انہیں دشمن کے خلاف اعلان چاہئے۔ اگر دشمن آگے بڑھے تو پیچھے ہٹنا چاہئے، اگر دشمن رک جائے تو اسے پریشان کرنا چاہئے، اگر دشمن تھک جائے تو اس پر حملہ کرنا چاہئے، اگر دشمن واپس ہو تو اس کا پیچھا کرنا چاہئے۔

ماؤ کے سامنے یہ ایک حقیقت تھی کہ انقلاب لانے اور اس کے بعد حکومت اور اس کے اداروں کو چلانے کے لئے زمینیت یا "انڈیانا" اور محنتی لوگوں کی ضرورت ہوگی اور یہ کام صرف پارٹی ہی کر سکتی ہے کہ وہ ایسے لوگوں کو تیار کرے۔

چین کے انقلاب کی ایک اور اہم خصوصیت یہ تھی کہ اس میں قدیم نظام کے ختم ہونے سے پہلے ایک حواری نظام اور حکومت قائم کر لی گئی تھی، جس نے بعد میں آہستہ آہستہ قدیم نظام اور حکومت کو ختم کیا۔

چین کے انقلاب میں لانگ مارچ ایک اہم تاریخی واقعہ تھا، اس کے بعد کمیونسٹ پارٹی میں ماؤ کی حیثیت مستحکم ہو گئی۔ اس کے بعد نئے علاقوں میں انقلابی حکومت قائم ہوئی جس کا مرکز یا بن تھا، یہ انقلابی حکومت کا ماڈل بن کر ابھرا۔

یابان میں جو انقلابی حکومت قائم ہوئی اس میں فوجی اور شہری انتظامیہ ایک دوسرے سے تعاون کرتی تھیں۔ عمومی پالیسی، فیملی یا بن میں ہوتے تھے مگر ہر علاقہ اپنے معاملات میں خود مختار تھا۔ مرکز کے اختیارات کمزور تھے اور مقامی پارٹی ہر علاقے میں وسیع اختیارات رکھتی تھی۔ فیملی پارٹی میں بحث و مباحثہ اور تنقید کے بعد بدلتے رہتے تھے۔ ان کے لئے ضروری تھا کہ وہ جن علاقوں میں کام کرتے ہیں وہاں لوگوں سے رابطہ رکھیں اور اپنے فیملی ممبروں کے ساتھ ان پر توجہ کے بجائے ان کو ذاتی طور پر انہیں اختیار کرنے پر توجہ کریں۔ پارٹی کی ہدایات تھیں کہ کسانوں کے مفادات کے خلاف کوئی کام نہ کریں اور چین کی صدیوں پرانی روایات میں خوشامد اور دوبار وادی اہم تھیں، ان سے پرہیز کریں۔ لوگوں میں محسوس کر دیں، ان سے

براہری کا سلوک کریں۔

نئے علاقوں میں جہاں پارٹی کا تسلط تھا وہاں کوئیں نہ تحریک کے ذریعہ معاشی طور پر خود بخاری حاصل کرنے کی کوشش کی گئی، ذراعت و ہنگی صنعتوں کو ترقی دی گئی۔

اس کے ساتھ تعلیم پر خصوصی توجہ دی گئی۔ کیونکہ جہاں تعلیم کا ادھی 1930ء کی دہائی میں ایک فیصد تھا وہاں تعلیم کو عام کرنا انتہائی ضروری تھا۔ لیکن اس میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ نصاب کو اس طرح تشکیل دیا جائے کہ جو عملی زندگی میں کام آئے اور تعلیمی اصلاحات کا نفاذ اس طرح سے ہو کہ اس سے کسانوں کو فائدہ پہنچے، اس لئے اسکولوں میں تعلیم کو اس انداز سے دیا گیا کہ اس سے کسانوں کو عملی طور پر تربیت ملی۔

1940ء کی دہائی میں یابان کا دور ایک انقلابی دور تھا اور زیادہ تر تعلیمی کام اسی زمانہ میں ہوئے۔ پارٹی نے اس بات کی کوشش کی کہ غیر ملکی ماڈل کی تقلید سے خود کو پہچانے۔

مگر 1949ء میں انقلاب مکمل ہونے کے بعد چین میں سویت ماڈل کو اپنایا گیا۔ جو زرعی اصلاحات 1946ء میں شروع ہوئی تھیں وہ 1953ء تک جاری رہیں۔ اس سال منصوبہ بندی اور معاشیات میں سویت ماڈل کی تقلید کی گئی۔ معاشی شعبہ میں سویت ماڈل اس بات پر زور دیتا ہے کہ بیماری صنعتوں کو فروغ دیا جائے اور ملک کو عیسی سے صنعتی بنایا جائے 1962ء میں ماؤ نے صنعتی ترقی کی رفتار پر تنبیہ کرتے ہوئے کہا کہ اس دور نے چین کے عوام کی تعلیمی صلاحیتوں کو متاثر کیا ہے مگر یہ دور چین کے لئے لازمی تھا۔ جب منصوبہ بندی کو مرکزیت حاصل ہوئی تو اس کے نتیجہ میں نوکر شاہی طاقت و زمین کر ابھری، پارٹی کی قیادت ٹیموں، انجینئروں اور پیشہ ور لوگوں کے ہاتھ میں چلی گئی۔ اس سے کسانوں کی جلا دستی کو رک، پیچھے اور مساوات کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ سرخ افواج نے خانہ جنگی میں بغیر کسی عہدے کے جنگ لڑی تھی اور کوریہ کی جنگ تک چین کی فوج میں عہدے اور مراعات کا سلسلہ نہیں تھا۔ مگر 1955ء میں سویت نظام کے تحت فوج میں عہدوں اور مراعات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ اس دور میں شہروں کی طرف زیادہ توجہ دی گئی اور دیہاتوں کی ترقی روک دی گئی۔ زرعی اصلاحات کو روک کر صنعتی و تجارتی شعبوں پر زیادہ توجہ دی گئی۔

1958-9ء میں بیماری و ہنگی صنعتوں اور ذراعت میں ایک ساتھ ترقی پر زور دیا گیا، جس کے نتیجہ میں جو ترقی ہوئی وہ ناقابل فہم ہے۔ اس دور میں ذراعت میں کمیون کا طریقہ شروع ہوا۔

ماؤ نے چین کے انقلاب کو جن مراحل میں تقسیم کیا وہ اس طرح سے تھے۔

- 1- بورڈوا جمہوری انقلاب جو 1949ء میں اس وقت ختم ہوا جب کمیونسٹ پارٹی نے اقتدار حاصل کر لیا۔ یہ انقلاب 1950ء کی دہائی تک جاری رہا۔
 - 2- چین کی سٹی تبدیلی جو 1950ء کی دہائی میں مکمل ہوئی۔
 - 3- تیسرا مرحلہ 1950ء کی دہائی دہائی سے شروع ہوا اس میں کوآپریٹو ملکیت اور عوامی ملکیت کے درمیان ہم آہنگی ہوئی۔
 - 4- اور آتے آتے چوتھے دور میں تمام ملکیت عوام کی ہو جائے گی اور پانچویں دور میں کمیونزم کا نفاذ ہو جائے گا۔
 - 5- اس کے بعد بھی مختلف مرحلے ہوں گے جن کے بارے میں کچھ نہیں کہا جاسکتا ہے۔
- اگر کے بعد چین کی نئی قیادت نے انقلاب کا رخ موڑ دیا ہے، سرمایہ دار روایات کو آہستہ آہستہ قبول کیا جا رہا ہے جس نے انقلابی عمل کو روک دیا ہے۔ یہ ایک نیا تجربہ ہے جو چین کو ایک دوسری سمت لے جا رہا ہے۔

تیسری دنیا اور تبدیلی

نوآبادیاتی نظام کے خاتمہ کے بعد تیسری دنیا کے ملکوں میں جمہوری عمل جاری نہ ہو سکا۔ ان ملکوں میں اقتدار ان طبقوں کو ملا کہ جن کی جڑیں عوام میں نہ تھیں اور جن کے طبقاتی مفادات عوام سے جدا تھے۔ اس لئے اقتدار کو حاصل کرنے کے بعد انہوں نے نوآبادیاتی نظام اور اس کے اداروں کو باقی رکھا کہ ان کے ذریعہ عوام کا استحصال جاری رکھا۔ یہ ان کے مفاد میں نہیں تھا کہ عوام کو اقتدار میں شریک کیا جائے اور نہ ان کو متحرک کر کے اس کاٹل بنایا جائے کہ وہ ان پر انحصار کرتے گلیں۔ اس لئے نوآبادیاتی دور کے وہ مضبوط اداروں فوج اور نوکر شاہی نے جاگیرداروں اور سرمایہ داروں سے اتحاد کر کے سیاسی طاقت و مراعات کو اپنے لئے مخصوص کر لیا۔

تیسری دنیا کے ملکوں میں سیاسی تبدیلی اسی طرح آئی ہے کہ جیسے خود وسطی میں شاہی خاندانوں کے تبدیل ہونے سے آئی تھی کہ جس میں اقتدار ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہو جاتا تھا اور معاشرہ کا باقی حصہ اسی طرح سے برقرار رہتا تھا۔ اس میں ہر بھی تبدیلی آتی تھی وہ معاشرہ کی ساخت کے اندر رہتے ہوئے آتی تھی، اس سے باہر نہیں آج کل یہ سیاسی تبدیلی تیسری دنیا کے ملکوں میں "گورننگ" کے ذریعہ آئی ہے۔ یہ "گورننگ" فوجی و سیاسی قوتوں کے اتحاد کے ذریعہ ہی آتا ہے اور صرف فوج بھی اس کو لے کر آئی ہے۔ اس میں عوام کی حمایت یا ان کی شرکت بالکل نہیں ہوتی، کیونکہ یہ خفیہ سازش اور منصوبہ کے تحت آتا ہے۔ کوئی لالہ میں خود حکومت کی طاقت نہیں مہر میں کام کرتی ہے کیونکہ یہ ہمیشہ حکومتی اداروں کی مدد سے آتا ہے، اس لئے اس میں عوامی طاقت کو شریک نہیں کیا جاتا اور نہ کوئی اس کی ضرورت ہوتی ہے۔

کوئی صرف سیاسی و سماجی طور پر نہیں ماننا ملکوں میں کامیابی کے ساتھ آسکتا ہے کیونکہ انہیں ملکوں میں حکومت و اقتدار کے ادارے محدود ہوتے ہیں، طاقت انہیں یا اداروں کے پاس ہوتی ہے اور جب ان پر قابو پا لیا جائے تو کامیاب ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے کوئی ایک خاص منصوبہ ہوتا ہے وہ اچانک اور بے خبری کے عالم میں فوج، پولیس، ریڈیو، ٹیلی فون،

نیل گراف اور ذرائع ابلاغ کے حکومتی ذرائع پر قبضہ کر کے، دارالحکومت کی اہم عمارتوں پر قابض ہو جاتے ہیں، جن میں ایوان صدر، وزیراعظم کی رہائش گاہ، اسمبلی کی عمارت و سکرٹریٹ شامل ہوتی ہیں۔ اس کے بعد دارالحکومت میں شہری تانکہ بندی کر کے اہم شاہراہوں پر فوج مقرر کر دی جاتی ہے۔ دوسرا قدم یہ ہوتا ہے کہ سیاسی جماعتوں، فورٹریڈ یونٹوں و طالب علموں کی یونٹیں پر پابندی عائد کر کے، سرکردہ سیاسی شخصیتوں کو گرفتار کر لیا جاتا ہے۔ پریس پر منسرب کاغذ ہو جاتا ہے، اور جلسہ و جلوس پر مکمل پابندی لگا دی جاتی ہے۔

لیکن سیاسی طور پر ترقی یافتہ ملکوں میں گولا لانا اور اسے کلکیاں جانا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ وہاں اقتدار چند اداروں میں محدود نہیں ہوتا ہے، فوراً اس کے مرکز چند ادارے نہیں ہوتے ہیں، بلکہ سیاسی عمل میں سیاسی جماعتیں ہوتی ہیں۔ جن کے منظم و تربیت یافتہ کارکن، وقار اور شہرہ اشاعت کے لحاظ سے ہوتے ہیں۔ ٹریڈ یونین اور ان کے باشعور اراکین ہوتے ہیں۔ عدلیہ اور دیگر قانونی و سیاسی ادارے ہوتے ہیں۔ پریس کی خود مختاری ہوتی ہے۔ اس لئے کہ اور اس کے راہنماؤں کے لئے یہ ناممکن ہوتا ہے کہ ان سب اداروں، جماعتوں، اور گروہوں کو ختم کر لیں یا ان کا تعاون حاصل کر سکیں۔

اس لئے کہ تیسری دنیا کا مقدر ہیں۔ کیونکہ یہاں کوئی منظم نظام نہیں ہوتا۔ یہاں آئے دن دستور بدلے رہتے ہیں، قوانین میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں۔ محض حکومتیں اقتدار کو اپنی ذات یا خاندان میں سمیٹے رکھتی ہیں۔ جمہوری روایات کا فقدان ہوتا ہے۔ ملک میں معاشی بحران ہوتا ہے کہ جس میں بے روزگاری، افراط زر، قیحوں کی فزائی، اور غذا کی کمیابی عام باتیں ہوتی ہیں۔ بیماری، جرائم، غریب و افلاس، رہائش کی کمی، قحط مالی اور تباہی میں اضافہ، وہ مسائل ہیں کہ جو حرام کو یں مانع بنا دیتے ہیں۔ ان ملکوں میں حکومت ان مسائل کو حل کرنے کے بجائے انہیں بڑھتی دیکھتی ہے، انتظامیات کی تعلیم دیتی ہے، فرائض سے اٹھ کر کئی ہے، اور انہیں مزید قیادتوں کے لئے تیار رہنے پر کھلا کرتی ہے۔

ان ملکوں میں روزمرہ کے معمولات میں عام انسان دن رات حکومتی اداروں کے ہاتھوں دبلی و خوار ہوتا ہے۔ ہر روز انسانی عظمت و وقار کو کھلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسانوں کو میدان بنا دیا جاتا ہے کہ انہیں جس طرح سے چاہیں زندگی گزارنے پر مجبور کر دیں۔ دفتروں میں انہوں نے وعدے و وعائد کی وائٹ لہٹ، رشوت و بدعنوانی سے انہیں روز سہاگہ پڑتا ہے۔ روز وہ لٹی و شکست سڑکوں پر ٹھوکریں کھاتے ہیں۔ اگلے ہوئے گڑے اور گندے کی لالچٹ سے دوچار ہوتے ہیں، بیماری کی صورت میں گندے اسپتالوں، غیر ہمدرد ڈاکٹروں، اور ملاوت کی دکانوں سے

تلاش کراتے ہیں۔ ٹرانسپورٹ کی مشکلات، چوری و ڈاکے، اور حادثات انہیں عیش و عشرت کا احساس دلاتے رہتے ہیں۔ تیسری دنیا کا عام کوئی ان تمام مسائل کے بوجھ سے دبا ہوتا ہے، اس لئے اس میں تبدیلی کی خواہش تو ہوتی ہے، مگر اس کے اندر جو ماحول کی بے بسی اور بے عملی ہے، وہ اسے اس امید پر زندہ رکھتی ہے کہ کوئی سمجھا آئے گا اور ان برائیوں کا خاتمہ کر دے گا۔ اور کہ کے راہنما اکثر سمجھا کا لبادہ لوندہ کر آتے ہیں۔ وہ حرام کے ان احساسات کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور آتے ہی اس ختم کے اعلانات کرتے ہیں کہ جن میں روزگار، رہائش، صحت و تعلیم کے وعدے ہوتے ہیں۔ بدعنوان و خراب دور کے خاتمہ کی خوش خبری ہوتی ہے اور امیدوں سے بھرے سننے اور کے آئے کی خبر۔

اس لئے کہ کے ابتدائی مرحلہ میں معاشرہ کی تفسیر اور معنائی کا دور و شور ہوتا ہے۔ بدعنوانی انہوں کو کھلا جاتا ہے۔ نچلے درجہ کے سرکاری اہل کاروں، اور لوگوں کو جیل بھیجا جاتا ہے۔ سڑکوں کی معنائی ہوتی ہے، دکانوں پر چالیں لگتی ہیں، اشیاء کی قیمتوں کی فہرستیں کوڑوں کی جاتی ہیں، دفتروں میں وقت کی پابندی پر زور دیا جاتا ہے، انصاف کے لئے جگہ جگہ عدالتیں قائم کی جاتی ہیں، ناچاز تملوزات کو ہٹایا جاتا ہے، پریس، ریڈیو، اور ٹی وی پر معاشرہ کو برائیوں سے پاک کرنے کی تلقین کی جاتی ہے، لوگوں میں امیدیں پیدا ہوتی ہیں کہ اب ان کی زندگی میں سکون آنے والا ہے، ان کے مسائل حل ہونے والے ہیں، ظالموں کو ان کے مظالم کی سزا ملنے والی ہے اور معاشرہ میں انصاف قائم ہونے والا ہے۔ مگر یہ سارا دارامہ چند سیڑیوں میں اپنے انتظام پر پکڑا ہوا ہے اور پھر آہستہ آہستہ زندگی اس اگر پر لوٹ آتی ہے، پھر وہی ماجوسی، فالسیدی، اور پھر کسی سٹے سمجھا کی تلاش۔

تیسری دنیا کے ان ملکوں میں چونکہ سیاسی جماعتوں پر جاگیردار اور سرمایہ دار قابض ہوتے ہیں، اس لئے وہ سیاسی عمل کو حرام تک لے جاتے سے بچتے ہیں۔ وہ صرف سیاسی جلسوں، جلوسوں اور اخباری بیانات کے ذریعہ اپنی لہر و شب کو زندہ رکھتے ہیں۔ حرام کو سیاسی طور پر باشعور بنانا ان کی ذہنی و قوت کو معاشرے کی تبدیلی کے لئے استعمال کرنا خود ان کے منافع میں نہیں ہوتا ہے، اس لئے وہ صرف سیاسی و معاشی بحرانوں کے ذریعہ اقتدار بحال کرنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کو کے ساتھ تملوزات کے اقتدار میں شریک ہو جاتے ہیں اور حکومت کے اقتدار سے قائمہ اٹھا کر ملک کے قرضوں، اسپورٹ، انکسپورٹ کے لائسنس اور پائلوں کو حاصل کر کے اپنی دولت میں اضافہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔

ان ملکوں میں یہی حال رہی جماعتوں کا ہوتا ہے۔ چونکہ حرام کی اکثریت ان کے ساتھ نہیں ہوتی ہے اس لئے یہ انتظامات اور لہجہ دارانوں پر یقین نہیں کر سکتے، اور کہ کے مواقع پر

اس کے رہنماؤں کا ساتھ دیتے ہیں تاکہ اس ذریعہ سے وہ اپنے مذہبی نظریات کا نفاذ کر سکیں۔
 کولاسے واسے ٹیڈ یونین کے رہنماؤں 'طالب علم لیڈروں' 'دانشوروں' 'ادیبوں' و 'شاعروں'
 اور علماء و مشائخ کی حمایت حاصل کرنے کے لئے انہیں مراعات دیتے ہیں جس کے نتیجہ میں
 ان کے خلاف آواز اٹھانے والے بہت کم رہ جاتے ہیں اور جو رہ جاتے ہیں ان کو جیل 'قید و
 بند' اذیت و تشدد اور جلا وطنی کے ذریعہ ختم کر دیا جاتا ہے۔ اس پر سے عمل میں وہ تمام طبقات
 جو انقلابی تبدیلی چاہتے ہیں وہ ٹوٹ پھوٹ کر بکھر جاتے ہیں۔

تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں امپیریل طاقتیں معدومین الاقوامی اجارہ دار کمپنیوں کے موجود
 ہوئی ہیں۔ یہ حکومتی اداروں کو مالی امداد دے کر اپنے لوٹ کھسوٹ کے دائرہ کو پھیلا رہی ہیں۔
 اس لئے ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ملک میں کوئی بنیادی تبدیلی نہ آئے اور حالات جیسے کہ ہیں
 اسی طرح سے برقرار رہیں۔ اس لئے ان ملکوں میں جو بھی کو آتے ہیں ان کو کسی نہ کسی شکل
 میں بین الاقوامی کمپنیوں 'بور امپیریل طاقتوں کی حمایت حاصل ہوتی ہے تاکہ ان کے مفادات
 برقرار رہیں اور ان کے ساتھ معاہدہ باقی رہیں۔ اس طرح غیر ملکی اور ملکی مفادات دونوں انہیں
 میں مل جاتے ہیں اور تبدیلی کے تمام راستوں کو بند کر دیا جاتا ہے۔

تیسری دنیا کے ملکوں میں اگر جمہوری عمل شروع بھی ہوتا ہے تو اس کا دائرہ محدود ہوتا
 ہے۔ کیونکہ ان ملکوں میں جاگیردار 'قبائلی سردار' اور 'اشرافیہ' دار ہند بڑے پتہ اثرات
 رکھتا ہے۔ ان کے مخصوص اور محفوظ حلقہ اختیارات ہوتے ہیں کہ جہاں سے ان کے لئے
 اختیارات جیتنا مشکل نہیں ہوتا اور جب یہ لوگ نمائندہ اداروں میں جاتے ہیں تو وہاں یہ صرف
 اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ بلکہ ان کے اپنے علاقوں میں پولیس اور حکومتی اداروں کی مدد
 سے یہ عوام کا استحصال کرتے ہیں اور خود کو قانون سے بالا سمجھ کر ہر قانون شکنی کے مرتکب
 ہوتے ہیں۔ اس میں نظم کی قانون شکنی ہے لے کر اپنے مخالفوں کو سزائیں دینا اور قتل کروانا
 تک شامل ہوتا ہے۔

اس نام نہاد جمہوری حکومت میں بھی عوام کو پہلے کی طرح سے دھوکا دیا جاتا ہے اور وہ
 اسی طرح زندگی کی بنیادی سولہوں سے محروم رہتے ہیں۔ ملک کی آمدنی دار حکومت کو جانے
 سوارنے 'اسمبلی کی خوبصورت عمارتیں تعمیر کرانے' اور نمائندہ اداروں کی تزئین و آرائش پر
 خرچ کر دی جاتی ہے۔ لوگ شہر کی مراعات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ فوج کی کٹواہیں بڑھ جاتی
 ہیں اور عوام کے نمائندہ وہی۔ کئی۔ بی۔ بی۔ این کر حکومت کی سولہوں سے لاکھ اٹھاتے ہیں۔

یہ ایک مایوسی کن صورت حال ہے۔ لیکن تیسری دنیا کے عوام کو زندہ رہتا ہے اور اس
 کی خاطر انہیں راستہ ابھی تلاش کرنا ہے۔